ماہنامہ

حنا

جولائی 2013

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

حمد تنویر پھول 7
نعت عبیدرضا 7
پیارے نبی کی پیاری باتیں سیداختر ناز 8

انشاء نامہ

تاریخ کے چند ادوار ابن انشاء 13

انٹرویو

مہرین راحیل سے ملاقات کاشف گوریجہ 15

سلسلے وار ناول

وہ ستارہ صبح اُمید کا فوزیہ غزل 18
تم آخری جزیرہ ہو اُم مریم 150

مکمل ناول

منزل عشق فرحت عمران 40
طلسم مُرادار سمیرا حمید 78
زندگی کے آنسو مبشرہ ناز 188

افسانے

تیرے انتظار کا پھول خالدہ نثار 177
فرض اولین عابی ناز 216
تین عشروں کی کہانی سیمیں کرن 224

ناولٹ

کاسۂ دل سندس جبیں 108
لاج ثمینہ بٹ 130

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ، **ماھنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

مستقل سلسلے

کتاب نگر سے سیمیں کرن 227
حاصل مطالعہ تحریم محمود 230
میری ڈائری سے صائمہ محمود 234
حنا کی محفل عین غین 238
رنگ حنا بلقیس بھٹی 240
بیاض تسنیم طاہر 244
خبرنامہ عبداللہ 248
حنا کا دسترخوان افراح طارق 250
کس قیامت کے یہ نامے فوزیہ شفیق 254

انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کیسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کاروائی کی جاسکتی ہے۔

کچھ باتیں ہماریں

قارئین کرام! جولائی 2013ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

موجودہ حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے وقت عوام نے امید لگائی تھی کہ حکومت اپنے انتخابی وعدوں پر عمل کرتے ہوئے بجٹ میں روز افزوں مہنگائی کو کم کرنے کی کوشش کرے گی، مگر بجٹ نے لوگوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے، بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی مہنگائی کے طوفان نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور بجٹ کی منظوری سے پہلے ہی ملک میں جی ایس ٹی کے نفاذ نے ہر شے کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے حکومت بجٹ میں قرض اتارنے کی بجائے تاریخی کشکول کو دوبارہ اٹھا کر عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لینے جا رہی ہے اس کے لئے ان کی ہدایات پر ہر چیز پہ ٹیکس لگا دیا گیا ہے، صرف سانس لینے کے لئے ہوا ٹیکس سے مستثنیٰ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ملک معاشی بحران کا شکار ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارا بوجھ عوام پر ڈال دیا جائے، ملک کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں، جیسے حکومتی اخراجات میں کمی، درآمدات میں کمی لا کر برآمدات میں اضافہ اور سرکاری ترقیاتی اخراجات کی سخت نگرانی سے ان کے اخراجات میں کمی کرنے سے بھی ملک کے عوام پر ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کیا جا سکتا ہے، مگر اس کام کے لئے لگن اور ہمت کی ضرورت ہے، اگر یہ کام سرکاری اہلکاروں پر چھوڑ دیا گیا جو کہ ہر منصوبے میں کمیشن کھانے کے عادی ہیں تو منصوبے کا حال نیلم جہلم منصوبے جیسا ہی ہوگا، جو پندرہ ارب روپے میں مکمل ہونا تھا مگر اب تک اس کی لاگت دو سو بہتر ارب روپے ہو گئی ہے اور جب وہ حکومتی اعلان کے مطابق 2015ء میں مکمل ہوگا تو نجانے لاگت میں اور کتنا اضافہ ہو جائے گا، خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے، ہم اپنے وطن سے خود دشمنی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

عید نمبر:۔ اگست کا شمارہ "عید نمبر" ہوگا، مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی عید کے حوالے سے اپنی تحریریں دس جولائی تک ارسال کر دیں تا کہ وہ عید نمبر میں شائع ہو سکیں۔

اس شمارے میں: اداکارہ مہرین راحیل سے ملاقات، فرحت عمران، سمیرا احمید اور مبشرہ ناز کے مکمل ناول، سندس جبیں اور ثمینہ بٹ کے ناولٹ، خالدہ نثار، عابی ناز اور سیمی کرن کے افسانے، فوزیہ غزل، ام مریم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد
باری تعالیٰ

میں مدینے چلا، میں مدینے چلا
پھر کرم ہو گیا میں مدینے چلا

کیف سا چھا گیا میں مدینے چلا
جھومتا جھومتا میں مدینے چلا

اے شجر اے حجر تم بھی شمس و قمر
دیکھو دیکھو ذرا میں مدینے چلا

وہ احد کی زمیں جس کے اندر مکیں
میرے حمزہ پیا میں مدینے چلا

اشک تھمتے نہیں پاؤں جمتے نہیں
لڑکھڑاتا ہوا میں مدینے چلا

میرے آقا کا در ہو گا پیش نظر
میرے دل کی صدا میں مدینے چلا

کیا کرے گا ادھر باندھ رخت سفر
چل عبید رضا میں مدینے چلا

عبید رضا

نعت
رسول مقبول ﷺ

خدا کی معرفت ہے بالیقیں قرآن کا حاصل
کہا "لاتقنطو" یہ رحمت رحمٰن کا حاصل

بڑا فیاض ہے وہ، فیض پہنچاتا ہے بندوں کو
وجود رحمتہ اللعالمینؐ فیضان کا حاصل

نہ وہ بچہ کسی کا ہے، نہ اس کا کوئی بچہ ہے
احد ہے وہ، صمد ہے وہ، یہی ایمان کا حاصل

نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، نہ اس کا کوئی ثانی ہے
یقیناً سورۂ اخلاص ہے ایقان کا حاصل

رحیم اللہ، وہ رحمٰن، یہ آغاز قرآں کا
یہی نکتہ ہے پیہم دل کے اطمینان کا حاصل

شب تار الست انساں، وہ تیرا "بلیٰ" کہنا
سمجھ عرفان خالق ہے اسی پیمان کا حاصل

کہا باغ سخن میں پھول نے اس کو نہ بھولو تم
خدا کی حمد اور نعت [illegible] دیوان کا حاصل

تنویر پھول

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

روزے کے فضائل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

''ابن آدم کے ہر عمل (کے ثواب) میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ نیکی کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا بلکہ (اس سے بھی زیادہ) جتنا اللہ چاہے، ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مگر روزہ (اس قانون سے مستثنیٰ ہے) کیونکہ وہ (خالصتاً) میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ بندہ میری خاطر اپنی خواہشات اور کھانا ترک کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی روزہ کھولتے وقت (حاصل ہوتی ہے) اور ایک خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت (حاصل ہوگی) اللہ کے ہاں روزہ دار کے منہ کی بو کستوری کی مہک سے بھی زیادہ عمدہ ہے۔''

فوائد و مسائل

1- یہ بندوں پر اللہ کا خاص فضل ہے کہ بندہ اس کی توفیق سے جو نیکی کرتا ہے اس کا ثواب صرف ایک نیکی کے برابر دینے کے بجائے بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ: ''جو شخص نیکی لے کر حاضر ہوا، اس کے لیے ایک کا دس گنا ہے۔''

حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کی بیان کردہ یہ مقدار کم از کم ہے۔ ثواب اس سے کہیں زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

2- ثواب کی کثرت کا دارومدار حسن نیت، اخلاص اور اتباع سنت پر ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس قدر عظیم الشان تھا کہ ان کا اللہ کی راہ میں دیا ہوا آدھ سیر غلہ بعد والوں کے احد پہاڑ برابر سونا خرچ کرنے سے افضل ہے۔ اس لیے ہر شخص کے حالات و کیفیات کے مطابق نیکی کا ثواب سیکڑوں گنا تک پہنچ سکتا ہے۔

3- عمل وہی قبول ہوتا ہے جو خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو۔ ریا اور دکھاوے کی غرض سے کیا جانے والا عمل اللہ کے ہاں ناقابل قبول ہے۔ چونکہ روزے کا تعلق نیت سے ہوتا ہے اور دوسرے ظاہری اعمال مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی نسبت روزہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس میں ریا کا شائبہ بھی کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے اجر کو بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

4- روزے کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان دل کی غلط خواہشات پوری کرنے سے پرہیز کرے، یعنی جس طرح کھانا کھانے سے پرہیز کرتا ہے، اسی طرح جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے بھی اجتناب کرے۔

5- روزہ کھولتے وقت اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اللہ کے فضل سے ایک نیک کام مکمل کرنے کی توفیق ملی۔

6- قیامت کو خوش اس لیے ہوگی کہ روزے کا ثواب اس کی توقع سے بڑھ کر ملے گا اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

7- منہ کی بو سے وہ بو مراد ہے جو پیٹ خالی رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، چونکہ یہ اللہ کی اطاعت کا ایک کام کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لیے اللہ کو بہت محبوب ہے۔

8- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روزے کی حالت میں شام کے وقت مسواک کرنے سے بچنا چاہیے۔ کہ اللہ کی پسندیدہ بو ختم نہ ہو جائے، لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ مسواک سے وہ بو ختم ہوتی ہے، جو منہ کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بو دوسری ہے، اس کا مسواک کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

روزہ ڈھال ہے

حضرت مطرف بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ جو قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ سے تھے، انس سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفیؓ نے انہیں پلانے کے لیے دودھ طلب فرمایا۔

معطرف رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ ''میں روزے سے ہوں۔''

حضرت عثمان ثقفی: نے فرمایا۔

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

''روزہ جہنم سے بچانے والی ڈھال ہے جس طرح لڑائی میں تم میں سے کسی کی ڈھال ہوتی ہے۔''

فوائد و مسائل

1- مہمان کے کھانے پینے کی چیز پیش کرنا اخلاق عالیہ میں شامل ہے۔

2- اگر کھانے پینے کی دعوت دی جائے تو نفلی روزہ کھول کر دعوت قبول کرنا ضروری ہے۔

3- اگر کسی موقع پر اپنی کوئی نیکی ظاہر کرنا پڑ جائے تو یہ ریا میں شامل نہیں ہے۔

4- روزہ دوزخ سے بچاتا ہے، ایک تو اس لیے کہ یہ ایک بڑی نیکی ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ روزے کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ جن کے ارتکاب کی صورت میں وہ جہنم میں جا سکتا ہے۔ گناہوں سے اجتناب اور نیک عمل کی انجام دہی دونوں چیزیں جنت میں لے جانے والی اور جہنم سے بچانے والی ہیں۔

روزہ کا اجر

''جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریان کہا جاتا ہے۔ قیامت کے دن آواز دی جائے گی۔ کہا جائے گا ''روزے رکھنے والے کہاں ہیں؟'' چنانچہ جو شخص روزہ رکھنے والوں میں سے ہوگا وہ اس (دروازے) میں داخل ہو جائے گا اور جو اس میں داخل ہوگا، اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔''

1- جنت کے آٹھ دروازے ہیں جو مختلف نیکیوں کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً باب الصلوٰۃ (نماز کا دروازہ) ہے۔ باب الجہاد (جہاد کا دروازہ)۔ باب الصدقہ (صدقہ کا دروازہ)۔

2- ایک شخص جس نیکی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کی ادائیگی کی زیادہ کوشش کرتا ہے، وہ اس نیکی سے منسوب دروازے سے جنت میں داخل ہوگا۔ اگر زیادہ صفات کا حامل ہو تو ایک سے زیادہ دروازوں سے بلایا جائے گا۔

3- ''ریان'' کا مطلب سیراب ہے۔ روزہ دار بھوک، پیاس، برداشت کرتا ہے اور پیاس کا برداشت کرنا بھوک کی نسبت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے روزہ داروں کے لیے جو دروازہ مقرر ہے اسے بھی ''سیرابی دروازہ'' قرار دیا گیا ہے۔

4- فرض عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ منسوب نفلی عبادات بھی ممکن حد تک ادا کرتے رہنا چاہیے۔ نفلی عبادات کا اہتمام جنت میں

داخلے کا باعث ہے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

”جو شخص ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے، اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔“

فائدہ

1۔ اس سے مراد وہ صغیرہ گناہ ہیں، جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں اور حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک انہیں ادا نہ کر دیا جائے، الاّ یہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

شیطان کی قید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔“

فوائد و مسائل

1۔ ماہ رمضان نیکیوں کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اللہ کی طرف سے نیکیوں کے راستے میں حائل بڑی رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص نیکیوں سے محروم رہتا ہے یا برائیوں سے اجتناب کر کے اللہ کی رحمت حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

2۔ شیطانوں اور سرکش جنوں کے قید ہو جانے کے باوجود ماہ رمضان میں انسانوں سے جو گناہ پر سرزد ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان گیارہ مہینوں میں گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرنے کی وجہ سے ان کے عادی ہو جاتے ہیں، پھر رمضان میں نفس کی اصلاح کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے، یعنی روزے نہیں رکھتے، کثرت سے تلاوت نہیں کرتے، تراویح نہیں پڑھتے۔ اس لیے ان کے نفس کی تربیت اور اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے۔

3۔ جنت کے دروازے کھل جانے اور جہنم کے دروازے بند ہو جانے سے حقیقتاً ان دروازوں کا کھلنا اور بند ہونا بھی مراد ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں ماہ رمضان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، اس لیے نیکیوں کی طرف عام رجحان پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر قسم کی نیکی کرنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کے شعوری کوشش کرتے ہیں گویا یہ نیکیاں جنات کے دروازے ہیں اور گناہ جہنم کے دروازے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں میں آگے بڑھنے اور گناہوں سے باز آنے کا اعلان بھی اس لیے ہے کہ مسلمان نیکیاں کرنے اور گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

5۔ ہر رات بعض لوگوں کی جہنم سے آزادی بھی ماہ رمضان کا خصوصی شرف ہے۔ گناہوں سے توبہ کر کے ہر شخص اس شرف کو حاصل کر سکتا ہے۔

افطار کا وقت

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت کچھ لوگوں کو آزاد فرماتا ہے اور یہ (رمضان کی) ہر رات میں ہوتا ہے۔“

فوائد و مسائل

1۔ جہنم سے آزادی کا یہ شرف خلوص کے ساتھ سنت کے مطابق روزہ رکھ کر اور گناہوں سے توبہ کر کے حاصل ہو سکتا ہے۔

محروم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کے مطابق جب رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تمہارے پاس یہ مہینہ آ گیا ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے افضل ہے، جو اس رات (کا ثواب حاصل کرنے) سے محروم رہا وہ ہر بھلائی سے محروم رہا۔ اس کے خیر سے وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔“

فوائد و مسائل

1۔ اس مہینے کی افضل ترین رات لیلۃ القدر ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ القدر میں بھی ہے۔

2۔ شب قدر کی عبادات کا ثواب حاصل کرنے کے لیے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف مسنون ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کر سکے، تب بھی راتوں کی عبادت، خصوصاً طاق راتوں کی عبادت میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

3۔ ایک رات عبادت میں گزارنے سے تیس ہزار سے زیادہ راتوں کی عبادت کا ثواب مل رہا ہو، پھر بھی کوئی محض سستی کی وجہ سے یہ ثواب حاصل نہ کر سکے تو یہ واقعی بہت بڑی محرومی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا تو فرمایا:

”تم اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہو تو (سب سے پہلے) اس بات کی دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول کر لیں (اور اسلام میں داخل ہو جائیں) تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ تمہاری یہ بات تسلیم کر لیں تو پھر انہیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے دولت مند افراد سے لیا جائے گا اور واپس ان ہی کے ناداروں کو دے دیا جائے گا۔ اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں تو ان کے عمدہ مال لینے سے اجتناب کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔“

فوائد و مسائل

1۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ کو 10ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے یمن کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یمن کے ایک حصے کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ اور دوسرے حصے کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تھے۔

2۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں۔ اس زمانے میں یمن میں کثیر تعداد میں یہودی آباد تھے۔

3۔ غیر مسلموں کو تبلیغ کرنے میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ توحید کو حاصل ہے۔

4۔ توحید رسالت کا اقرار اسلام میں داخلے کی بنیادی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان شمار نہیں کیا جا سکتا۔

5۔ عبادات میں نماز اور زکوٰۃ سب سے اہم ہیں۔

6۔ زکوٰۃ مسلمانوں سے وصول کی جاتی ہے، غیر مسلموں سے زکوٰۃ کا متبادل ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جو ہر شخص کے حالات کے مطابق کم و بیش مقرر کیا جاتا ہے۔ اسے جزیہ کہتے ہیں۔

7۔ زکوٰۃ مسلمان مستحقین ہی میں تقسیم کی جاتی

ہے۔ غیر مسلموں میں سے صرف اس غیر مسلم پر زکوٰۃ میں سے کچھ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ توقع ہو کہ اسے مسلمانوں سے قریب ہونے کا موقع ملا تو اسلام کی طرف راغب ہو جائے گا اور ممکن ہے وہ اسلام بھی قبول کر لے۔ ایسے لوگوں کو موٴلفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔

8- جس علاقے کے مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جائے پہلے وہاں کے مستحق افراد میں تقسیم کرنی چاہیے۔ اگر ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد مال بچ جائے تو پھر دوسرے علاقے کے مسلمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

9- زکوٰۃ میں اچھے اچھے جانور چن کر وصول نہ کیے جائیں اور نہ نکمے جانور لیے جائیں، بلکہ درمیانے درجے کے جانور لیے جائیں۔

10- اسلام میں نئے داخل ہونے والے افراد کو آہستہ آہستہ تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ ایک ہی بار تمام احکام کا بوجھ ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

11- تبلیغ و تفہیم کے ذریعے کوشش کی جائے کہ عوام خوش دلی سے اسلام کے احکام پر عمل کریں اور ان کے دل اسلامی تعلیمات کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے محبت سے ان پر عمل کریں۔

12- ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے رعایا میں انصاف بے حد ضروری ہے۔ ہر حاکم اور سرکاری افسر کا سب سے پہلا اور سب سے اہم فرض رعایا کے حقوق عدل و انصاف سے ادا کرنا ہے۔

13- مظلوم کی بددعا سے بچنے کا مطلب ظلم سے پرہیز اور ظالم سے مظلوم کا حق دلوانا ہے، کیونکہ جب مظلوم کو حاکم سے اپنا حق نہیں ملے گا تو اس کے دل سے بددعا نکلے گی۔

14- مظلوم کی بددعا جلد قبول ہوتی ہے، اسی طرح جب مظلوم کی دادرسی کر دی جائے اور وہ خوش ہو کر دعا دے تو وہ بھی جلد قبول ہوتی ہے۔

زکوٰۃ نہ دینے والے کی سزا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے مال کو گنجے سانپ کی شکل دی جائے گی حتیٰ کہ وہ اس کی گردن میں طوق بن کر لپٹ جائے گا۔"

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید سے اس کی تائید میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ

"جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دیا ہے، وہ اس میں اپنی کنجوسی کو اپنے لیے بہتر خیال نہ کریں، بلکہ وہ ان کے لیے انتہائی برا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن انہیں ان کی کنجوسی کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے۔"

فوائد و مسائل

1- مال جب نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ فرض ہے۔

2- مجرموں کو قیامت کے دن جہنم میں داخل کیے جانے سے پہلے بھی سزا ملے گی۔

3- اگر کسی خلاف شریعت کام میں دنیا کا کچھ فائدہ نظر آئے تو اس کے اخروی نقصان کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ تاکہ دنیا کا فائدہ حقیر محسوس ہو اور شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

☆☆☆

تاریخ کے چند ادوار

ابن انشاء

تاریخ کے چند دور
راہوں میں پتھر
جلسوں میں پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
آستانوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر
یہ زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے

دیگیں ہی دیگیں
چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
پیسے ہی پیسے
سونا ہی سونا
چاندی ہی چاندی
یہ زمانہ دھات کا زمانہ کہلاتا ہے

لوگ سونے چاندی کی زنجیریں بناتے ہیں
ہمیں اور آپ کو پہناتے ہیں
ہم اور آپ پہن کر خوش رہتے ہیں
بلکہ تھینک یو بھی کہتے ہیں

ایک اور زمانہ ہے آئرن ایج
یعنی لوہے کا زمانہ
لوہا وہ دھات ہے
جس کا سب لوہا مانتے ہیں
ہلکا پھلکا بھی لوہا
کارخانے کی کل بھی لوہا
لوہا مقناطیس بن جاتا ہے
تو چاندی تک کو کھینچ لاتا ہے
سو سنار کی ایک لوہار کی
سونے والے لوہے والوں سے ڈرتے ہیں
لیکن کوئی کہاں تک رکوائے گا
ہمارے ہاں بھی لوہے کا زمانہ آئے گا
کچا لوہا اور کسی کام کا نہیں
بس اس سے آدمی بناتے ہیں
جو مرد آہن کہلاتے ہیں
ان کو زنگ لگ جاتا ہے
بلکہ کھا جاتا ہے
پھر بھی لوگ گھوڑے پر سے اٹھالاتے ہیں
زندہ باد کے نعروں سے جلاتے ہیں

یہ اور دور ہے
لوگ ننگے گھومتے ہیں

ننگے ناچتے ہیں
کلبوں میں جاتے ہیں
ایک دوسرے کو جلسوں میں ننگا کرتے ہیں
عوام تک کے کپڑے اتار لیتے ہیں
بلکہ کھال کھینچ لیتے ہیں
کھالوں سے زرمبادلہ کماتے ہیں
گوشت کچا کھا جاتے ہیں
نہ چولھا ہے نہ سیخ ہے
یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے

ملاوٹ کی صنعت
رشوت کی صنعت
کوٹھی کی صنعت
پگڑی کی صنعت
ماڈے کی صنعت
بیانوں اور نعروں کی صنعت
تعویذوں اور گنڈوں کی صنعت
یہ ہمارے ہاں کا صنعتی دور ہے

کاغذ کے کپڑے
کاغذ کے مکان
کاغذ کے آدمی
کاغذ کے جنگل
کاغذ کے شیر
ذرا نم ہو تو سب کے سب ڈھیر
کاغذ کے نوٹ
کاغذ کے ووٹ
کاغذ کا ایمان
کاغذ کے مسلمان
کاغذ کے اخبار
اور کاغذ ہی کے کالم نگار
یہ سارا کاغذ کا دور ہے

اب اس آخری دور کو دیکھیے
پیٹ روٹی سے خالی
جیب پیسے سے خالی
باتیں بصیرت سے خالی
وعدے حقیقت سے خالی
دل درد سے خالی
دماغ عقل سے خالی
شہر فرزانوں سے خالی
جنگل دیوانوں سے خالی
یہ خلائی دور ہے
لوگ تو ہم کے غبارے پھلاتے ہیں
معجون فلک سیر کھاتے ہیں
رویت ہلال کمیٹیاں بناتے ہیں
آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں
ڈٹ کے ڈبے نوش فرماتے ہیں
بیت الخلا میں مدار پر پہنچ جاتے ہیں
ہمارے ہاں کا خلائی دور یہی ہے

☆☆☆

مہرین راحیل سے ملاقات

کاشف گوریجہ

ملک کی معروف اداکارہ سیمی راحیل کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں سیمی راحیل کا نام ایک ماں کے کردار کے طور پر جانا جاتا ہے، سیمی راحیل ہاورڈ یونیورسٹی سے گراجوئٹ کیا ایک بہترین اداکارہ اور سماجی کارکن اور تجربہ کار ٹی وی اداکارہ کی ہونہار صاحبزادی مہرین راحیل ایک بہترین کوسٹار، ماڈل ہماری آج کی شخصیت ہیں۔

"مہرین راحیل لاہور میں پیدا ہوئیں ان کا خاندان کی والدہ سیمی راحیل، ان کے والد شاہد راحیل اور ان کے بھائی دانیال راحیل پر مشتمل ہے۔

ان کے بھائی دانیال راحیل اے۔آر۔وائی پر ریلیز ہونے والے ڈرامہ سلوٹیں میں آرہے ہیں

"مہرین نے لاہور کے ایک معروف سکول سے تعلیم حاصل کی اور لاہور ہی سے اپنی تعلیم کو مکمل کر کہ سکرپٹ رائٹنگ ڈپلومہ کے لیے لندن چلی گئیں۔

"مہرین راحیل سے ملاقات قارئین کے لیے اس ماہ کی خصوصی پیش کش ہے۔

☆ مصنوعات کی ماڈلنگ اور ایکٹنگ سب سے زیادہ دلچسپ کیا ہے؟؟؟

میں نے اشتہارات کے لیے اتنا کام کیا ہے کہ مجھے خود بھی اندازہ نہیں کے میں نے کتنے اشتہارات کے لیے ماڈلنگ کی ہے۔ ماڈلنگ بھی ایکٹنگ کی طرح دلچسپ فیلڈ ہے دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

☆ سب سے زیادہ دلچسپ لمحہ کون سا لگتا ہے؟؟؟

میں ایک آزاد روح ہوں، جب میں چھوٹی تھی تو میں نے خود سے ایک سفر کیا فائیو سٹار ہوٹل میں قیام اور بہت بڑا روم، ایک بڑا پلازمہ ٹی وی جیسے یہ حقیقت نہ ہو خواب ہو اُس وقت سب سے خوبصورت لمحہ یہی لگا۔

☆ اپنے باہر کے سفر کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں؟؟؟

میں نے سونامی کے دنوں میں سٹنڈرڈ چارٹرڈ فنڈ ریزنگ اور میراتھن کے لیے انڈیا ایک سفیر کے طور پر گئی تھی یہ ایک ناقابل یقین لمحہ تھا، اس کے علاوہ سماجی کارکن کی حیثیت سے لندن کا دورہ بھی کر چکی ہوں۔

☆ آپ پاکستان میں ماڈلنگ کا موازنہ کسی دوسرے ملک کے ساتھ کیسے کرتی ہیں

مغربی ممالک میں ماڈل کی ایج بہت کم ہے جبکہ پاکستان میں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔ پاکستان میں ماڈل کا مستقبل روشن ہے۔

☆ جب آپ ماڈلنگ نہیں کرتی تو آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟؟؟

مجھے اپنے والدین کے ساتھ وقت گذارنا بہت اچھا لگتا ہے، اس کے علاوہ اچھے کھانے بنانا، شاعری کرنا کالم لکھنا اچھا لگتا ہے۔

☆ آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے؟؟؟

مجھے Nabakov پسند ہے اس کے علاوہ Lolita پسند ہے۔

☆ آپ کی فٹنس کا کیا راز ہے؟؟؟

میں خوش رہتی ہوں اور کھانے میں میٹھا برائے نام ہی پسند کرتی ہوں۔

☆ اب تک آپ کے آنے والے مقبول ڈرامہ سیریز کون کون سے ہیں؟؟؟

میرے ڈرامہ جو کافی پاپولر ہوئے اُن میں ''گردش، کوٹھی نمبر 156، تین بٹہ تین، میری ذات ذرہ بے نشاں و دیگر شامل ہیں

☆ ڈرامہ کے ماڈلنگ کے علاوہ آپ کو فلم کرنے کا کوئی موقع ملا؟؟؟

میں نے ٹیلی فلمز اور کمرشل مووی ورثہ میں بطور سونیا کا کردار ادا کیا۔

☆ آپ کی زندگی کے کیا مقاصد ہیں؟؟؟

میری زندگی کا مقصد اپنے خاندان اپنے ملک کے لیے ایک اچھا نام بنانا ہے۔

☆ ایک بہترین ماڈل کے لیے کیا ضروری ہے؟؟؟

ایک بہترین اور کامیاب ماڈل کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقت کی پابندی کرے۔

☆ آپ کے حالیہ منصوبے کیا ہیں؟؟؟

میں آج کل ایک نجی چینل کے لیے ٹاک شو کر رہی ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں زندگی کیا ہے؟؟؟

زندگی اتار چڑھاو کا نام ہے اگر دکھ ہے تو سکھ بھی ہیں سکھوں کا مزا تب ہی آتا ہے جب انسان دکھ اور تکلیف سے گذرا ہو اسی کا نام زندگی ہے۔

☆ مستقبل کی ماڈلز کے لیے کوئی نصیحت جو آپ کرنا چاہتی ہوں؟؟؟

کسی عقل مند کا قول ہے کہ بڑی طاقت کے ساتھ بڑی ذمہ داری آتی ہے۔ لہذہ اپنی طاقت کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داری پر لگ جائیں۔

☆☆☆

وہ ستارہ جیسے اُمید کا

فوزیہ غزل

ستائیسویں قسط کا خلاصہ

اریبہ کو مشہور کاروبار کمپنی کا مالک سعود غوری اوچھے الفاظ میں شوبز جوائن کرنے کی آفر دیتا ہے تو اریبہ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔

اسلام آباد، مری، سوات کی حسین وخوبصورت وادیوں میں گھومتے ماریا اور اس کے ساتھی قدرتی وفطری نظاروں کی رعنائی وصناعیوں سے شدید متاثر ہوتے ہیں۔

سعیہ شہریار سے اپنی موجودہ حیثیت ومقام کے حوالہ سے ڈپریس ہو کر الجھتی ہے تو شہریار اسے خوش فہمی کے جہان سے باہر آنے کو کہتا ہے اور اپنا سرد انداز بدستور قائم رکھتا ہے۔

اریبہ کی والدہ پر فالج کا اٹیک ہوتا ہے تو کسی موہوم امید اور مان کے حوصلے پر وہ خود خالہ کے گھر کچھ رقم لینے جاتی ہے۔

ایبٹ آباد سے ٹھنڈ پانی سفر کے دوران ماریا کے وفد ممبرز اور پاکستانی ٹورز گائیڈ ومترجم حالیہ اسلامی دہشت گردی کے حوالے سے آپس میں کچھ تلخ گفتگو کرتے ہیں۔

خالہ اور وہاج اریبہ کو شادی کے اخراجات پر رقم صرف ہونے کا کہہ کر کچھ دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں، اریبہ وہاج کو گزشتہ تعلق محبت رشتے کا واسطہ دے کر بات کرتی ہے تو وہاج بنا ہجوم کا خیال کیے اس پہ ہاتھ اٹھانے کے ساتھ منگنی کی انگوٹھی واپس لے لیتا ہے، تذلیل وتوہین اور بیگانگی کا حد درجہ احساس اریبہ کو سن کر دیتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

اٹھائیسویں قسط

آسان راستوں کی وجہ سے سوات بھی ان کی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنا، خوبصورت اور دلکش وادیوں کی آماجگاہ سوات میں فطری اور قدرتی رعنائی، برف پوش بلند قامت کوہساروں، گرتی آبشاروں، بہتی ندیوں، صاف اور شفاف ماحول چمکتا ہوا دریائے سوات، وافر پھل پھول، سبزہ پوش اور گل پوش وادیوں میں شہد، اخروٹ، زمرد، قیمتی جڑی بوٹیوں، مخصوص دستکاری اور گھنے جنگلات یہ سب کچھ اتنا الگ اور منفرد تھا اور دیکھی جانے والی، محسوس کی جانے والی جنت نظیر خوبصورتی کی ایسی بہتات جہاں ان کے ہمراہ موجود گائیڈز یا متراجم حضرات کو نہ مثالیں دینی پڑیں نہ توصیفی قلابے ملانے پڑے فطری وقدرتی حسن خود بخود ظاہر ہو رہا تھا، سوات کی ہر گلی کوچے پر چیکنگ پوسٹ تھی، غیر ملکیوں کو بغیر سیکورٹی کے آگے جانے نہیں دیا جاتا تھا، دوسرے لوگوں کو بھی، چیکنگ کا سامنا تھا، یہ سب حالیہ دہشت گردی کے باعث حفاظتی اقدام تھے۔

”مشرق کے سوئٹزرلینڈ سوات کی گلیوں میں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتے پھرتے لوگ کھلی دکانیں، خریداری کرتی خواتین، دریائے سوات میں بے فکری سے انجوائے کرتے بچے اور مچھلیاں پکڑتے ہنستے مسکراتے لوگ یہ سب یقیناً پاک فوج کی محنت اور عزم کا ہی مرعون منت ہے پچھلے چند برس سے سوات دہشت گردی کی آگ میں جل رہا تھا، بموں سے سکولوں کو اڑایا جا رہا تھا، خواتین اور بچوں کا گھر سے نکلنا بند تھا، برقعے کے بغیر کسی عورت کے گھر سے باہر نکلنے پر زندگی کی کوئی ضمانت نہ تھی، سر عام لوگوں کو مارا پیٹا اور قتل کیا جاتا، ہر قسم کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا، مقامی لوگ واقعتاً فاقے کر رہے تھے۔“ وہاں موجود ایک غیر ملکی انہیں معلومات دے رہا تھا وہ جرنلسٹ ہونے کے ساتھ شوبز سے منسلک تھا اور سوات پر ایک ڈاکومنٹری تیار کر رہا تھا، ان کا سانس رک رہا تھا جیسے سب سنتے ہوئے۔

”یہی وہ سوات ہے یہاں مذہب کے نام پر لوگوں کو ذبح کیا جاتا تھا، لیکن آج اگر سوات میں امن اور سکون ہے، سیاحوں کی آمد رفت ہے، تو اس کا سارا کریڈٹ پاک فوج کو جاتا ہے۔“ وہی شخص بولا تھا۔

وہ لوگ تاسف بھری سانسیں خارج کرتے ہوئے وہاں موجود مقامی لوگوں سے اگر کچھ پوچھتے تو آنکھوں میں مستقبل کے خواب روشن لئے وہ پر امید اور خوشدلی سے بولتے۔

جا بجا دیواروں اور دکانوں کے دروازوں پر پاکستان کے جھنڈے بھی پینٹ ہوئے نظر آ رہے تھے اور جگہ جگہ ”پاک آرمی کو سلام“ اور ”پاک فوج زندہ باد“ کے نعرے لکھے تھے جو ان کی حب الوطنی کا ثبوت تھے او پاک افواج سے محبت کا اظہار بھی۔

انہوں نے گھومتے ہوئے دیکھا کہ شالز، چھتریوں، جاگرز، سوئیٹرز، کارڈیگنز اور پل اوورز کی دکانوں پر بڑا رش تھا، جبکہ ان کے ہمراہ کھانے پینے کا خشک سامان مثلاً ابلے ہوئے انڈے، نمکو، چپس، بیسن کا حلوہ، ڈبل روٹی، نمک پارے، جوس کے پیکٹ، کرکرے، بسکٹ، ٹافیاں، چاکلیٹس، سر درد کی دوائیاں اور تولیے، صابن، ٹوتھ پیسٹ، سرف، جبکہ موسم وعلاقہ کے حساب سے کپڑے لئے علاوہ تھے اور وہ سب لوگ خوب ہنسے تھے اتنا سامان دیکھ کر اور اب سعید صاحب کہہ رہے تھے۔

”دیکھ لیں ان مقامات پر منگائی عام مقامات سے زیادہ ہے اسی لئے ضرورت کی ہر چیز اچھی طرح سوچ سمجھ کر ساتھ رکھی تھی کہ کہیں بھی پریشانی نہ ہو۔“ اور انہیں واقعی ان کی دانشمندی کا قائل ہونا پڑا کہ ان کی مناسب پلاننگ کی وجہ سے بغیر کسی پریشانی کے وہ لوگ بہت اچھا وقت گزار رہے تھے، وقت گزارنے کے لئے اچھے ہوٹل پھر جیپوں ڈرائیورز، گائیڈز، مترجم کے علاوہ پی آئی اے اور مختلف ائیر لائنز کی جانب سے بھی سفری پیکج کی سہولت تھی۔

سوات پہنچ کر ان کا قیام رات کو مینگورہ میں تھا، کیونکہ یہ سوات کا صدر مقام تھا بلند و بالا پہاڑوں سے گھرے مینگورہ کے قریب ہی انہوں نے ایک اور دلکش وادی جامیل دیکھی جو کہ نہایت سرسبز، معتدل اور حسین ہے، یہاں انہوں نے گندھارا تہذیب کے آثار بھی دیکھے بدھ مت کے ابتدائی دور سے لے کر آخیر وقت تک کا سارا بدھ ازم تصویری کہانیوں اور اسٹوپاز کے ذریعے محفوظ تھا، بنڑ، پاٹوون گرام، کوکاری، اور جامیل کے آثار بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے، صندل کے ٹکرے پانی میں بہتے دیکھے، زیتون کے درختوں کی بہتات تھی۔

”یہاں زمرد کی ایک دکان بھی دریافت ہوئی تھی، گاؤں جامیل اپنی جامع مسجد کی وجہ سے بھی مشہور ہے اتنی بڑی مسجد اور کہیں نہیں ترقیاتی کام بھی یہاں بہت ہے تین بڑے ادارے پولی ٹیکنیک انسٹیٹیوٹ، پولی ٹریڈ اور ووکیشنل انسٹیٹیوٹ کے علاوہ بے شمار درس گاہیں، سکولز اعلیٰ درجے کے ہسپتال سلک ملز ہیں۔“ مقامی مترجم اور گائیڈ فرید خان انہیں روانی سے معلومات دے رہے تھے۔

یہیں سے وہ مالم جبہ پہنچے جو سطح سمندر سے 8400 فٹ بلند ہے راستے میں سڑک کے کنارے اور نیچے وادی میں اخروٹ، آلوچے، خوبانی، چیری اور شہتوت کے باغات پھیلے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے پوری وادی میں پھولوں اور پھلوں کی مہک بسیرا کیے ہوئے تھی، گائیڈ بتا رہا تھا کہ۔

”یہیں سیاحوں کے لئے ایک ریزوٹ بھی بنایا گیا تھا، یہ برفیلے میدان میں P.T.D.C کا خوبصورت ہوٹل تھا جس کو طالبان نے قبضہ میں لے لیا بعد میں آپریشن کے دوان آرمی نے بمباری کی جس سے یہ ہوٹل مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔“

”میاں دم۔“ بھی ایک ایسا مقام یہاں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پائن کے اونچے درختوں، چشموں اور آبشاروں سے بہتے پانی نے چاروں طرف سے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وادی کو نہایت حسین بنا دیا تھا، دریائے سوات جو اس سارے سفر میں ساتھ ساتھ بہتا رہا تھا اس کے دونوں طرف وادیوں میں مقامی لوگ رہتے تھے جو دریا عبور کرنے کے لئے جگہ جگہ لکڑی، لوہے یا رسیوں کے پل سے گزرتے دکھائی دیتے مدین پہنچتے پہنچتے یہ وادی قدرے تنگ ہو گئی یہاں ٹراؤٹ مچھلی بھی کھائی جس نے سفر کو مزید یادگار بنا دیا۔

”یہاں سے صرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر بحرین واقع ہے جو سطح سمندر سے 4500 فٹ بلند ہے وہ جگہ یہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں، اس جگہ کو بحرین کا نام دیا جاتا ہے، قرآن پاک میں بھی دو دریاؤں کے ملنے کا ذکر سورۃ الرحمٰن میں موجود ہے، لوگوں نے اس علاقے کا نام

''بحرائن'' سے بحرین کر دیا ہے۔''

فرید خان انہیں تفصیلی بتاتے ہوئے اس جگہ لے آیا یہاں پر تند و تیزی سے بہتا آبشاروں، چشموں اور پہاڑی ندی نالوں کا پانی دریا میں شامل ہو رہا تھا۔

ماریا جوزف دریا کے کنارے خاموشی سے بیٹھی تیز رفتار لہروں کا شور سن رہی تھی، ان سب کا یہ ٹھنڈا یخ پانی اچھا لگ رہا تھا بہت سے لوگ یہ زردی مائل بھورے رنگ کا پانی واٹر کولر ار گھڑوں میں بھر کر پینے کو لے جا رہے تھے۔

مقامی لوگ انہیں بصد اصرار اپنے گھر دکھانے لے گئے ان لوگوں کے مکانوں کی دیواریں پتھر اور لکڑی کے ملاپ سے بنی ہوئی تھیں، انہیں کھانے کی دعوت دیتے ہوئے روٹی بھی پیش کی گئی جس میں ایک روٹی چار روٹیوں کے برابر موٹی تھی اور دال چاول بڑے بڑے اور پھولے ہوئے خاصے کم ذائقہ تھے ان لوگوں کے اصرار پر سب ایک دو لقمے لے سکے، پہاڑوں پر موجود ان گھروں میں لکڑیاں جلانے کے لئے جگہ موجود تھی جس کے عین اوپر ایک پائپ کا سرا گھر کی چھت پر نکلتا وہ سب حیرانی سے کچن کا یہ نرالا کام دیکھ رہے تھے، فرید خان نے ان کی حیرت بھانپتے ہوئے کہا۔

''جب سردی کا موسم آتا ہے تو تین فٹ تک برف پڑتی ہے، سردی سے بچنے کے لئے ہم اپنے گھروں میں لکڑیاں جلاتے ہیں، جن کا دھواں اس پائپ کے راستے باہر نکلتا ہے اور یوں سخت سردی میں بھی ہمارے گھر گرم رہتے ہیں۔'' یہاں سے واپسی پر اس علاقے کے لوگوں نے بڑی مہمان نوازی کا مظاہرہ کیا اور ناشپاتی، اخروٹ، سیب، ملوک سے بھرے پھل کا کریٹ انہیں بطور سوغات دیا، انتہائی غربت اور نامساعد حالات کے باوجود ان کی سخاوت اور دریا دلی کا یہ مظاہرہ انہیں دنگ کر گیا۔

ان کا آخری پڑاؤ وادی کالام جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار چھ سو فٹ کی بلندی پر موجود ہے، یہ خوبصورت مقام یہاں زندگی مسکراتی محسوس ہوتی تھی۔

''جہاں چیڑ اور دیار کے جنگلوں میں بنفشہ، سیب اور لاتعداد خوبصورت پھلوں پھولوں کی جلوہ گاہیں موجود ہیں اس کی سرحد گلگت چترال سے ملتی جلتی ہے، جبکہ یہاں سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر دلکش پہاڑوں کی آغوش میں ایک حسین فن پارہ مہوڈنڈ جھیل ہے، یہاں کی ٹراؤٹ مچھلی سفر کو یادگار بنا دیتی ہے۔'' مقامی گائیڈ فرید خان کے ساتھ سعید احمد بھی انہیں معلومات بہم پہنچا رہے تھے۔

جبکہ پھلدار درختوں کے جھنڈ اور پرندوں کی نایاب اقسام دیکھ کر وہ لوگ حیرت و خوشی اور استعجاب کے ملے جلے تاثرات لئے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے، کالام کے یخ پانی میں چارپائیوں پر بیٹھ کر گرم چائے اور پکوڑوں کا لطف وہ یقیناً ساری زندگی نہیں بھلا سکتے تھے، حالانکہ تصاویر، وڈیوز کی صورت وہ پاکستان کے ان حسین علاقہ جات میں گزرے خوشگوار لمحات کو محفوظ کر چکے تھے اور ایک شاندار تفریحی ٹرپ سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوئے تھے، شمالی علاقہ جات گلگت، بلتستان، چترال کا ٹرپ آخری میک پہ چھوڑ کے یہیں سے سب واپسی کا سفر باندھ چکے تھے، سوائے ماریا کے جو آگے جانا چاہتی تھی۔

''یہ ہماری زندگی کے سب سے خوبصورت لمحات تھے جو ہم نے یہاں کی رعنائیوں اور فطری و قدرتی صناعیوں کو دیکھتے گزارے عالمی سطح پر اسلام یا پاکستان کا نقشہ خواہ کتنا خراب ہو تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے یہ ہر طرح مالا مال ہے۔'' یہ توصیفی کمنٹس سب نے متاثرانہ انداز میں ٹورسٹ بک میں درج کیے اور آپس میں اس کا واضح اظہار بھی کیا۔

☆☆☆

لمبی جاگتی راتوں کے
تنہا موسم میں
محبت کی پھیلی ہتھیلی پر
یقین کا بدن رکھ دو
اپنی قبولیت کا شگن رکھ دو

''تو بات یہ ہے سعیہ عفنان خان کہ تم اپنی بے بسی شکستگی نہ صرف محسوس کر رہی ہو بلکہ اس کا اظہار بھی کر رہی ہو اور ہو سکتا ہے اس بے بسی اور شکست کے پردے میں کہیں مجھ سے وابستہ رشتے کا احساس اور محبت بھی ہمکنے لگے اور یقیناً وہ وقت آیا چاہتا ہے تب تک ضبط گریز مجھ پر لازم ہے، دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ تم اپنی خود ساختہ ضد میں کتنا مجھ سے الجھ سکتی ہو کتنا اجنبی ہو سکتی ہو، کتنی بیگانگی سہہ سکتی ہو اور کتنی سہنے دیتی ہو۔''

وہ اسے دیکھ رہا تھا جو بڑے خاموش انداز میں بے ترتیب سے حلیے کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی سفید کین کی چیئر پر، افسردگی میں لپٹا اس کا خوابیدہ سا چہرہ بہت اچھا لگا تھا اسے وہ ہمیشہ سے بے حد مختلف اور بدلی بدلی سی لگی اور اس لمحے شہریار کا دل چاہا تھا اسے ہولے سے چھو کر اس ساکت منظر میں ہلچل مچا دے، اسی پل اچانک سعیہ نے نگاہیں اٹھائی تھیں ایک لمحے کو دونوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کے اندر تلاطم سا برپا کیا تھا، سعیہ پل بھر میں اعصابی دباؤ کا شکار ہوئی پھر روئی روئی بوجھل آنکھیں لئے وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور اندر چلی گئی۔

شہریار کمرے میں داخل ہوا تو وہ وارڈ روب کھولے کھڑی تھی اٹیچی بھی پاؤں کے قریب کھلا رکھا تھا جس میں وہ اپنے کپڑے رکھ رہی تھی، مگر کیوں اور کس لئے؟

شہریار بے ساختہ ہی چونکا تھا، پھر سرعت سے اس کا بازو پکڑ کر رخ اپنی سمت موڑا تھا اور بلا تردد جارحانہ انداز میں پوچھا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''پیکنگ کر رہی ہوں مجھے اپنے گھر جانا ہے۔'' سعیہ نے تلخی سے کہتے ہوئے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی جو کہ بیکار تھی کیونکہ شہریار نے اس کا بازو اتنی سختی سے پکڑا تھا کہ اسے واضح تکلیف محسوس ہوئی۔

''وہ گھر تمہارے لئے پرایا ہو چکا ہے تمہارا اپنا گھر یہ ہے یہاں تم مسز شہریار خان کی حیثیت سے کھڑی ہو اور اس حیثیت سے کچھ بھی کرنے کے لئے تمہیں میرے اختیار اور اجازت کی

ضرورت ہے۔" بہت کچھ جتاتا ہوا لہجہ جواسے تپا گیا۔

"مجھے نہ تو آپ کا اختیار درکار ہے نہ اجازت کی ضرورت، اپنے لئے کوئی بھی کام کروں آپ کو باخبر رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھتی انڈر اسٹینڈ۔" وہ جس قدر اعتماد اور چڑا دینے والے لہجہ میں بولی شہریار کو حیران کر گیا، ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر طمانچہ دے مارا ہو بے حد تضحیک کا احساس اسے پل میں پیچ پا کر گیا، سعیہ نے بہت آہستگی سے دیکھا تھا اسے جو سرخ آنکھوں الجھی سانسوں کے ساتھ درشتگی سے شانوں کو تھامتا بے حد انتہا پسند دکھائی دیا تھا اس لمحے۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی، یہ میرا حکم ہے شہریار خان کا حکم، انڈر اسٹینڈ۔" شہریار کی مضبوط انگلیاں اس کے شانوں میں دھنسی جا رہی تھیں وہ کچھ دیر تک بول نہیں سکی ساکت کھڑی رہی۔

وہ ہر بات یہ بات بھول جاتی تھی کہ اب شہریار کے اختیار میں ہے وہ اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی اور جب وہ اس اختیار کا استعمال کر کے روک ٹوک کرتا تو اپنی بے بسی اور مجبوری کو محسوس کر کے اسے سمجھ نہ آتا کیسے ری ایکٹ کرے عجب پارہ صفت مزاج رکھنے والا یہ شخص اسے ہمیشہ شکستگی کا شکار کرنے لگتا تھا۔

"آپ مجھ پر یوں جبر اور زور کے ذریعے زندگی تنگ نہیں کر سکتے میں اگر چپ ہوں تو اس کی بھی ایک وجہ ہے اور آپ اس وجہ کو میری ہار بنانے کی کوشش نہ کریں اگر میں اس رویے کو دنیا کے سامنے لے آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ ہمت کر کے بولی تو شہریار کے چہرے پر پہلے تحیر پھر تبسم چھلکا۔

"تم ایسا نہیں کرو گی سویٹی کیونکہ چیختے چلاتے لوگ ہمیشہ پسپائی کا اظہار کرتے ہیں اور یقیناً تم شہریار کے مقابلے میں اتنی جلد ہمت ہارنے والی ہو تو نہیں۔" شہریار کی بھاری آواز پہ سعیہ نے سر اٹھا کر حیرت سے دیکھا تھا، سامنے کھڑا شخص واقعی اس کے اندازے سے زیادہ ہوشیار تھا اور وہ مرکز بھی اس کے بھید اس کی چالوں سے واقف نہیں ہو سکتی تھی۔

"ڈیئر دیکھو پورے استحقاق سے دیکھو آخر شوہر ہوں تمہارا، کچھ چاہیے کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ بھی کہو۔" شہریار کے لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی اور انداز قدرے محظوظ ہونے والا، خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کرتے ہوئے وہ بھیگتی پلکیں جھپکا کے چہرہ جھکا گئی۔

"مانا تم بہت حسین اور دلفریب ہو اور زندگی، محبت، طلب ہو تمہارے لئے خود کو کتنا دیوانہ بے بس پاؤں تمہیں شاید کبھی بتا سکوں نہ سمجھا سکوں کیونکہ محبت محسوس کرنے والی چیز ہے، بتانے یا جتانے والی ہوتی تو......" ایک نگاہ خاص بت بنی سعیہ پہ ڈالتا اس کے جھکے چہرے کو شہادت کی انگلی سے قدرے اوپر اٹھاتا وہ بھاری اور مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"اب تک بہت سے بعید، اسرار، نئے احساس تم پا چکی ہوتیں، تمہیں پتا چلتا کہ زمان و مکان کی ہر حد تک اور حدوں سے پرے کائنات کے سارے رنگ، ساری دلکشی ہماری دلفریبی تم سے ہے تمہارے لئے ہے، وہ سب جو تم سے کہنا ہے سننا ہے اور خوشبو چنتے لمحے جو تمہاری گرفت میں دیتے ہیں، ان کا ہر احساس کتنا دل پذیر ہے اگر تم پالو تو محسوس کرو گی کہ زندگی بس یہی کچھ ہے۔" یہ توجہ یہ التفات، یہ شہد ٹپکاتا سحر انگیز لہجہ اور بھرپور وجیہہ مرد سعیہ کی ساری حسیات اس کی سمت متوجہ تھیں، وہ جو اسے اپنے پر حدت بازوؤں کے گھیرے میں لئے اس کے صبیح چہرے پر پرتپش سانسیں چھوڑتے اسے خاص انداز سے دیکھ رہا تھا اور وہ اس کے لہجے میں موجود حدتوں اور شدتوں کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی، اس کے وجود میں ارتعاش سا برپا تھا۔

زندگی میں محبت کی اسیری ہو تو جینا کچھ اور لطف دیتا ہے اور محبت کتنی بھی دیوانی ہو، زندگی تو Give and take کچھ لو اور دو کے اصول پر چلتی ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں اس کے ثبوت کے طور پر تم کو صرف تم کو اپنی زندگی میں شامل کیا، باوجود اس کے کہ شہریار خان کی خوبصورت عورتوں کی کمی نہیں، یہ اتنا شاندار گھر اور لگژری سہولیات سے آراستہ لائف تمہیں دی، تمہاری کیئر کرتا ہوں لو کرتا ہوں تم سے اور جواباً تم سے یہی ایکسپکٹ کرتا ہوں، تو کیا غلط ہے ڈارلنگ۔"

اس کی سمت غور سے دیکھتا شہریار بھرپور انداز میں مسکرایا جبکہ وہ سانس روکے اسے سن رہی تھی، جس کا انداز تخاطب بے حد دلفریب تھا۔

"اور دوریاں مٹانے میں پہل تم کرو گی سعیہ میں نہیں، اپنی ساری دیوانگی تم پہ ظاہر کروں گا مگر تب جب تم خواہش کرو گی۔" ایک مرد کا انا پسند لہجہ گونجا، وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی، شہریار ذرا رکا تھا پھر اسے آزاد چھوڑتے ہوئے بولا۔

"تمہاری ناں سے زندگی کی حقیقت نہیں بدلی، نہ تم اپنی خود ساختہ ضد سے حالات اور صورتحال کو اپنے بس میں کر سکتی ہو، نہ اس رشتے سے گریز ظاہر کر کے اس کا مفہوم بدل سکتی ہو اور یہ بات تمہیں اب سمجھ لینی چاہیے نہ سمجھو تو بھی I don,t care۔" شہریار چیزوں کے پیچھے نہیں بھاگتا، اب چیزیں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں، عجب ایک طنز تھا اس انداز میں سعیہ نے خاموشی سے دیکھا تھا۔

"اینی وے، شام کو ذرا اچھی طرح تیار رہنا، وہاج کے ہاں جانا ہے شادی ہے اس کی بہنوں کی رخصتی اور تقریب ولیمہ ہوٹل میں ہے اور تمہیں چلنا ہے۔" وہ یکدم پلٹا اور باہر نکل گیا سعیہ اپنی سنسناتی دھڑکنوں کا شور اور دہائی سنتی رہ گئی۔

وہ شخص کون تھا جو حقارت کی نظر سے
دریا کو دیکھتا ہوا پیاسا گزر گیا......!

☆☆☆

نقشہ محبت بگڑ گیا
کہ آخر وہ بچھڑ گیا
آنکھ ڈھونڈتی رہی
وہ دل سے گزر گیا
عقل کے گھر پہ چڑھا
دل کا دریا اتر گیا
کھو کے تجھے اداس
تنہا میں گھر گیا

رات کا سپنا تھا
دن میں بکھر گیا
میرے گھر کا چاند
پرائی منڈیر پہ ٹھہر گیا
شہر تمنا میں کھڑی
ڈھونڈتی ہوں وہ کدھر گیا

اریبہ کے اندر عجیب طوفان اٹھ رہے تھے ایک قیامت تھی جو اس پہ آ کر گزر چکی تھی، کیسا اذیت ناک اور جان لیوا احساس تھا یہ کہ وہاج حسن اسے یکسر رد کر چکا تھا کتنی امیدیں کتنی خواہشات کتنے خواب توڑ چکا تھا یہ بات خود کو باور کرنا اپنے دل پہ جھیلنا دشوار تر تھا عقل و خرد کو جو وہ بتا چکا تھا اسے مانتے ہوئے وہ کانپ رہی تھی، ایک روح فرسا عذاب اس پہ اترا ہوا تھا، یہ گھر اس گھر میں رہنے والا شخص اسے دنیا میں سب سے عزیز تھا، اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا جس میں کچھ دیر پہلے وہاج حسن کے نام کی اس سے تجدید تعلق کی ایک خوبصورت نشانی تھی اور وہ اس ایک تعلق کو لے کر خود کو بے حد امیر سمجھا کرتی تھی اس اک شخص کی محبت کے سہارے وہ امیر تھی اور اس شخص نے لمحوں میں کیسے بے توقیر اور غریب کر دیا تھا اسے، کیا تھا اس کے پاس پیار کا کوئی ایک رنگ نہ محبت کی کوئی تتلی تھی اس کے خالی ہاتھوں میں، اسے لگا وہ کوئی ڈری سہمی تنہا بچی ہو دنیا کے میلے سے بچھڑی جس کا وہاج حسن کے ساتھ کوئی خاص تو کیا عام سا بھی رشتہ نہ تھا۔

اس نے سنا تھا کہ زندگی کتنی پرسکون ہو اس میں بدسکونی کبھی ایسے موڑ لے آتی ہے جس کے آگے صرف بند گلی ہوتی ہے اور وہ گلی کبھی کھلتی نہیں لاکھ دعائیں مانگیں ہزار سر پٹخیں مگر بند راستے بند رہتے ہیں، یہ بند راستے اسے ڈراتے تھے آخری موڑ کیسا ہوگا وہ خدشات میں لپٹی سوچا کرتی تھی اور یہ اس کی غلطی تھی کہ بدترین خدشات کو لے کر ممکنہ خطرات کو بھانپتے ہوئے بھی وہ کوئی مناسب لائحہ عمل نہ تیار کر سکی اور جب زندگی اسے ایک ایسے موڑ پہ لے آئی جو آخری تھا جس کے آگے سارے راستے بند تھے بند گلی بند راستے اور آخری موڑ کیا ہوتا ہے اسے سمجھ آنے لگا تھا۔

وہ وقت جب زندگی سانحہ بننے لگتی ہے، وہ پل جب وہاج حسن نے اسے اپنی زندگی سے بے دخل کر کے لحہ بھر میں پرایا کر دیا تھا، وہ رویہ جس نے کڑے حالات میں اسے عتاب سہنے کو تنہا چھوڑ دیا، کیا وہ یہ سب بھلا سکتی تھی، اس کی ٹھہری ہوئی ساکت آنکھوں میں بہت کچھ چھن سے ٹوٹا تھا اور کئی منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے تھے۔

”تم محبت ہو میری اریبہ اور اپنی محبت کے مزاج کے سارے موسموں تک میں رسائی رکھتا ہوں، میری زندگی کی ساری کوششیں تمہیں خوشیاں دیتے رہنے کی ہیں، تمہیں لگتا ہے یہ انگوٹھی پہنا کر میں تمہیں کوئی دھوکہ دونگا۔“ اس کے قریب بھرپور شنا سا آواز آئی تھی۔

”تمہارے سپنوں، خواہشات اور امیدوں کو اپنے دل کے راستوں پر میں نے ایسے باندھ رکھا ہے جیسے یہ ربط، یہ تعلق، یہ رشتہ بندھا ہے۔“ سعیہ نے اپنی خالی انگلی کو دیکھا تھا اسی پل کوئی خلوص و محبت سے لبریز آواز میں بولا تھا۔

کوشش کر رہی تھی۔

”کم آن ماریا یہ فرسودہ اور لایعنی بحث ہے اور اب میں اس پہ توجہ دینا چھوڑ چکی ہوں، ویسے بھی تم میرے ذہن کے بدلتے ہوئے عقائد اور میرے اندر اٹھتے مذہبی خلجان سے واقف ہو اینڈ یو نو میں یہاں صرف مذہب اسلام کو پرکھنے اور مسلمانوں کا طرز بود و باش ان کے عقیدے کو دیکھنے آئی تھی اور میں یہ چیز گھوم پھر کر یہاں کے لوگوں میں رچ بس کر رہی دیکھ سکوں گی، تم لوگوں کے سیمینارز اٹینڈ کرنا صرف یہ میرا کام نہیں سو پلیز تم برگشتہ اور بدظن ہوئے بغیر میرا ساتھ دو کیتھی پلیز تم صرف ایک ڈاکٹر نہیں نہ صرف ایک عیسائی بلکہ تم ان سب سے ہٹ کر ایک انسان ہو پہلے اور انسان کی عظمت دوسروں کے کام آنے یا ان کی مشکلیں گھٹانے میں ہے نہ بڑھانے میں۔“ ماریا قدرے ملتجیانہ اور سنجیدہ لہجہ میں بولی کیتھی نے اسے کچھ بے بسی سے دیکھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو شمالی علاقہ جات کا سفر تمہاری مشکلات کم کر سکتا ہے۔“

”یہ مان بھی لوں تو تمہیں اکیلی کیسے چھوڑوں۔“ اس بار وہ کچھ الجھ کر بولی۔

”پاکستان ٹورزم اور ڈویلپمنٹ سے رابطہ کیا ہے میں نے ابھی کچھ دیر تک یہاں سے کچھ سٹوڈنٹس ٹرپ پہ آئے لوگ گلگت کے لئے روانہ ہو رہے ہیں اور میں ان کے ساتھ چلوں گی ہمارے ٹورسٹ گائیڈ سعید صاحب اور فرید خان ہی ہونگے مجھے پرابلم نہیں ہوگا۔“ وہ اتنے یقین اور اعتماد سے بولی کہ کیتھرین کو سوچنا پڑا۔

”ماریا عجیب ہو تو بھی بعض اوقات بہت پریشان اور بے بس کر دیتی ہو، یہ جو نت نئے مذاہب کو جاننے پرکھنے کا ایڈونچر ہے تمہارا کسی دن تمہیں خوار کر دے گا، اپنے تجسس، سپنس، تھرل پھر حد درجہ ڈپریشن مایوسی اور الجھنیں ان سب کے ہاتھوں تم بارہا مرتے مرتے بچی ہو تمہارے اس ایڈونچر اور تھرلنگ کا اینڈ کیا ہوگا I don,t now لیکن تم یقیناً ایک جوا کھیل رہی ہو جو تمہیں نہ صرف ہرا سکتا ہے بلکہ اس بار تم مر سکتی ہو وہ بھی پہلے کے تجربے و مشاہدے سے زیادہ اذیتناک موت اور میں......“ کیتھرین ڈیوڈ نے کچھ دیر اسے ترحم آمیز انداز میں دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

”انسانیت کے ناطے تمہاری بہتری، بھلائی، کامیابی کی خواہاں ہوں، اپنے تمام تر خوف ڈپریشن، بے چینی، سے بچ کر تمہیں وہ سکون، آرام اور درست کیفیت روحانی و ایمانی ملے جس کے تم خواہاں ہو۔“

”یہ شاید پہلی دعا تھا جو اس تیئس سالہ زندگی میں اس نے سنی، اسے اس وقت اس لحہ کیتھرین اچھی لگی جولیڈی ایلون کی طرح، مائیکل کے مانند اس کی خوشیوں کی خواہاں تھی۔“ ماریا کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

”تم بہت اچھی ہو کیتھی، ورنہ میری زندگی، خوشی یا کامیابی کے لئے دعا تو کبھی میری سگی ماں نے بھی نہیں کی، آج سے سات سال پہلے جب میں نے باقاعدہ طور پر چرچ سے اپنی رکنیت منسوخ کرواتے ہوئے مکمل طور پر عیسائیت کو خیرباد کہ دیا تو میرے پیرنٹس نے اپنی اپنی ترجیحات کے لئے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ ”اس عیش و آرام، دولت اور لگژری لائف، پھر شاہانہ لائف اسٹائل کو چھوڑ کر میں کہیں کی نہ رہوںگی۔“

"پچھتاوا، رسوائی، بدنامی، بھوک اور ذلت میرا پیچھا لے لے گی، میں کبھی ایک اچھی پرسکون اور کامیاب زندگی نہیں گزار سکوں گی، عیسائیت کو چھوڑ کر میں دنیا و آخرت میں تماشا بن جاؤں گی۔" یہ الفاظ میرے ان والدین کے تھے جنہوں نے مجھے پیدا کیا تھا وہ جن کے خون سے میری تخلیق کا ساماں ہوا وہ کہہ رہے تھے کہ در در بھٹکتے دھکے کھاتی اپنی غلطی پر پشیماں، نادم، گڑگڑاتی منت سماجت کرتی میں بلکتی پھروں گی، اور ہر بار اپنی روحانی الجھنوں، ذہنی ابہام جسمانی اذیتوں سے بے چین ہو کر جب میں خودکشی کا ارادہ کرتی تو یہی سوچتی مجھے میرے پیدا کرنے والے والدین کی بددعا لگ گئی ہے، اسی لئے ذلت اٹھاتی رسوا ہوتی میں ناکام شکستہ پھر رہی ہوں، دعا والا کام تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں تھا، چیرٹی ہمیشہ میرے لئے فضول چیز رہی، فقیر کو بنا کچھ دیے میں تکبر سے گزر جاتی اور کسی کی ہیلپ کرنا یا کام آنا مجھے کار زحمت لگتا اور خود جب مدد کی ضرورت محسوس ہوتی تو جانتی ہو کیا ہوتا، میرے چہار اطراف گھپ اندھیرا ہوتا، درد ہوتا، تکلیف ہوتی، پھر میں کسی کو پکارتی، Help me please, Help me مگر دنیا جیسے خالی ہو جاتی، ان ہولناک لمحات میں مجھے خدا یاد آتا میں اسے واسطہ دینے کے لئے اپنی کوئی نیکی یاد کرنے کی کوشش کرتی، کسی اچھائی کو سامنے لانا چاہتی پر نہیں کچھ اچھا ہوتا تو میرے کام آتا۔" وہ اب سسکیوں سے رونے لگی کیتھی نے اس کا شانہ تھپک کر اسے حوصلہ دینا چاہا۔

"اب تمہارے لئے اندھیرے نہیں رہیں گے ماریا تم روشنیوں میں ہو گی۔" ماریا نے اشکبار نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑی مخلص دوست کو دیکھا اور مسکرا دی تو کیتھرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"Good girl اسی طرح حوصلہ رکھو یہ حوصلہ بہت کام دے گا۔" پھر اپنے وفد کے انچارج سے اجازت لینے کے ساتھ سیکیورٹی کا خاطر خواہ بندوبست کروا کے وہ سب لوگ ماریا کے ہمراہ جانے والے گروپ سے ملے جو یونیورسٹی پنجاب سے کچھ اولڈ سٹوڈنٹس کا گروپ تھے میل اور فی میل ممبرز پر مشتمل اچھے ہنستے مسکراتے لوگ۔

"تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے، ہم نے اب تم ہمارے جذبات کا پاس رکھنا اور ہم سے رابطہ رکھنے کے ساتھ کوششیں کرنا ڈاکٹر نزہت کی بیٹی کی شادی میں ضرور شریک ہونا۔" کیتھرین، انجلا مارشل اور جیفر نے اسے یاد دلایا۔

اس کے ہمراہ الوداعی ملاقات کر کے سب لوگ اسلام آباد کے لئے بائے ائیر واپس ہو چکے تھے، ماریا انہیں رخصت کرنے کے بعد ایک طرف ہو کر بہت خاموشی سے بیٹھی تھی وہ رو نہیں رہی تھی مگر اس کے چہرے پر مٹے مٹے آنسوؤں کے نشان تھے اور آنکھیں ہلکی نم پپوٹے بھاری کوئی بھی اسے دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ دیر قبل بہت سارا رو چکی ہے مگر کیوں اور کس لئے، یہ جاننا کچھ مشکل تھا۔

یونیورسٹی پنجاب سے آئے اولڈ سٹوڈنٹس کا خوش مزاج اور ہنس مکھ لوگوں پر مشتمل گروپ نیلی کانچ آنکھوں والی اس اداس سی لڑکی کا خاصے متجسس اور دلچسپ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

ان کے ٹور گائیڈ کے مطابق وہ اپنے وفد ممبرز کے ساتھ جانے کی بجائے شمالی علاقہ جات

دیکھنے کو رک گئی تھی اور غالباً وہ کوئی ریسرچ ورک تیار کر رہی تھی مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت اور مذاہب سے متعلق میڈیکل وفد کے ہمراہ پاکستان آنا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

"یہ سب اپنی جگہ مگر یوں اداس ہونے یا بلاوجہ رونے کی تک۔" کسی کو سمجھ نہ آیا وہ اسے مخاطب کیسے کریں قدرے ریزرو اور روڈ لگی وہ انہیں ایک جگہ ایک مقام پر آمنے سامنے بیٹھے وہ یوں اجنبی اور لاتعلق تھی جیسے کوئی دشمن ہوتا ہے، مگر کیوں؟

"یار کوئی پوچھو جا کر اس نیلی آنکھوں والی سے کہ گواچی گاں (گمشدہ گائے) کی طرح یوں برافروختہ حواس باختہ، نم دیدہ چشم خمیدہ کیوں بیٹھی ہے۔" زیادہ دیر صبر نہ ہو سکا تو راحیل نے اپنے ساتھی کو ٹہوکا مارا تھا اور عین اسی پل سنگ مرمر کی مورت جیسی وہ لڑکی اٹھی اپنے سامنے کچھ فاصلے پر بیٹھے ان لوگوں کو دیکھا پھر ان کی طرف چلی آئی وہ سب جیسے سانس روک چکے تھے۔

☆☆☆

کوئی بارش ہے بد گمانی کی
سارے کاغذ ہی دل کے گیلے ہوئے

بلیک اور گولڈن ایمبرائیڈڈ لباس میں گولڈ کی نفیس جیولری اور بے حد نفاست سے کیے گئے میک اپ نے بہت رعنائی اور دلکشی بخش دی تھی، اس کے تیکھے نقوش اور مرمریں سراپے کو عجب جاذبیت عطا کی تھی کہ کچھ پل کو آئینہ بھی دنگ رہ گیا تھا۔

اگرچہ وہ بہت بے دلی سے مکدر طبیعت کے ساتھ تیار ہوئی تھی کہ شہریار کا رویہ و الفاظ ابھی تک بدستور اس کے ذہن کو جھنجھنا رہے تھے، کتنا باحوصلہ تھا وہ شخص جو چند پل کی فسوں خیز قربت سے اس کے ضبط کو آزماتا پھر بے پروائی اور بے اعتنائی کی مار مارتا اسے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتا، بلاشبہ یہ کھیل اسے محظوظ کرتا ہو گا مگر وہ کتنی دیر شاکڈ رہتی۔

محبت کے نام پر بہت بری طرح اسے استحصال کیا گیا تھا اس کا اور اب محبت تو در کنار احساس محبت تک نہ تھا کتنا بے رنگ جیون گزار رہی تھی وہ کہ اندرون ذات شکستگی کی زد میں تھی اور بیرون ذات ایک ناٹک کی حد میں "سب اچھا ہے" کا سگنل دیتی وہ اپنے وجود میں کس درجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور کیسی ناقدری سہہ رہی تھی اس شخص کے ہاتھوں۔

جو ہر لمحہ "محبت تم سے ہے" کا راگ الاپتا تھا اب اس کے اپنے بیچ رشتے کو کوئی عزت، مان، توجہ تک نہ دیتا تھا، کبھی بے حد مہرباں شجر سایہ دار کی مانند رہتے ہوئے وہ اس کی ساری توجہ سمیٹ لیتا کبھی شعلہ فشاں ہوتا تو سعیہ کو سچے کھرے اور کھوٹے کی پہچان مشکل ہو جاتی، ہر روز اپنے اس کے مابین رشتے کا حوالہ دیتا بلیک میل کرتا وہ اس کا حوصلہ آزماتا اور سعیہ کے سارے حوصلے مٹی ہو جاتے۔

اس کا دل جو شہریار کی پل بھر کی توجہ لمحہ بھر کے ارتکاز سے اس کی جانب سرپٹ دوڑنے لگتا اس کی شکست اسے کسی طور بھی گوارہ نہ تھی۔

"مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بے حس بننے کی کوشش کرتی لیکن اس کی رنگت بدلتی کیفیت اور انداز بدلتی دھڑکنیں حسات کو چونکا کے بتاتیں کہ اس کے وجود کے علاقہ میں دل

نام کا ایک تو تھڑا ہے جو شہریار کی پرواہ کرتا ہے اور وہ شکست بے وجہ اسے بے طرح جھلا کر رکھ دیتی خود سے الجھتی اس سے لڑتی، روتی مگر دل کو نہ سمجھا پاتی جو اچانک ہی اس نے مہر اور سنگدل شخص کی پرواہ کرنے لگا تھا، جو اسے نگاہ خاص سے دیکھتا تو اس کے سارے وجود میں قیامتیں جاگ اٹھتیں، ہر جگہ ایک ہلچل مچ جاتی وہ پل وہ لمحات جب قرب کا طلسم کارگر ہونے لگتا اور وہ اس شاندار لمبے چوڑے شخص کے سامنے کھڑی نئے تجربات سے روشناس ہونے کا فن سیکھتی، راہ فرار اختیار سے باہر ہوتی اور لطافتوں کے موسم کی رنگین کہانیاں آسمانی صحیفوں کی مانند دل پر اترنے لگتیں یہ بے بسی اور شکست اس کی قبولیت تو خود اپنے سامنے گوارہ نہ تھی اسے پھر شہریار کو اپنے ان بدلتے خیالات کی خبر کیسے ہونے دیتی، سارا بھرم مٹی میں مل جاتا۔

بھلا یہ شکست دل، شکست ذات شکست انا اسے کب گوارہ تھی، وہ شخص جو پہلے سے اسے شکستہ دیکھنے کا خواہاں تھا کیسے نہ حظ اٹھاتا اس کی بے بسی سے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تضحیک کا یہ ساماں اسے گوارہ نہ تھا، محض ایک ذرا سے دل کے ہاتھوں وہ خود کو کیسے رسوا کرتی وہ اعتماد اور نخت جو بڑے جتن سے اپنے وجود کو عطا کی تھی ساری مضبوطی دھری کی دھری رہ جاتی۔

”دل پر اختیار نہ سہی مگر کیا یہ ضروری ہے کہ میں خود کو بے بس اور چھوئی موئی ظاہر کر کے اس سے اپنی ہار کا اعلان کروں اور اسے جیت و غرور کا ایک اور شاندار موقع فراہم کروں وہ جو میری پیش قدمی کا ہی منتظر ہے، کیا یہ میری نسوانی انا، میرے وقار و تمکنت اور میری ذات کی توہین نہ ہو گی۔“ اس آئینے میں نظر آتے اپنے خوبصورت سراپے کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

”نہیں میں اتنی کمزور نہیں کہ اس معمولی سے جذبے کو سنبھال نہ سکوں، مجھے اپنے احساسات و جذبات چھپانے ہیں، یہ محبت ہے شہریار سے تو اسے اپنے اندر دفن کر لوں گی، محبت کو تشہیر نہیں بنانا یہ حماقت اس پاگل دل سے سرزد ہوئی ہے اور پاگل پن میں اپنی انا و خودداری کو نیلام نہیں کرتا۔“

اک فیصلہ کر کے وہ اس راز کو دل کی گہرائیوں میں دفن کرتی اٹھی، ڈریسنگ ٹیبل کے آگے ہیر برش رکھتے ہوئے اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی شادی کی تصویر پر پڑی بے حد آئیڈیل جوڑی اور اگر وہ شہریار سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی تو اتنے وجیہہ شاندار مرد، وسیع و عریض گھر اور لگژری لائف ملنے پر خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرتی، مگر شہریار کی حد سے زیادہ بیبا بننے اور فرمانبرداری کی عادت نے جیسے مایوس کیا تھا پھر اس کی خوامخواہ خود کو پوز کرنے والی عادت نے بہت سیدھی سادی، متوازن زندگی گزارنے والی نرم خو اور حساس سعیہ کے اندر، ایک ضد سی بیدار کر ڈالی انکار کی۔

شادی، مجبوری، بے بسی، انا اور ضد ان سب کے بیچ میں کب کہاں چپکے سے اقرار اور میں تمہاری ہوں کا راگ بجنے لگا وہ جان نہ پائی جان رہی تھی تو ڈر گئی بے تحاشا خوف شکست بے انت سوچیں پسپائی کی۔

ایسے میں خود کو Be contident کا اشارہ دیتی وہ نا چاہتے ہوئے بھی بہت سے رشتوں کا مان رکھنے کو تیار شہریار کے ہمراہ قدم بڑھاتی میرج ہال میں داخل ہوئی یہاں رنگ و نور اور روشنیوں کا اک سیلاب تھا۔

مووی میکرز تھے فوٹو گرافرز تھے لمحہ لمحہ تقریب کی کوریج کرتے، ان دونوں کو اپنے کیمروں کے حصار میں لے چکے تھے۔

وہاج حسن کی فیملی انہیں خصوصی پروٹوکول دے رہی تھی، حیدر صاحب بمعہ اپنی فیملی مدعو تھے، ڈاکٹر نزہت سعیہ کو دیکھ کر بہت خوشگوار حیرت کا شکار ہوئیں، البتہ صبا نہ آئی تھی، وہاج کی والدہ نے بتایا کہ یہ رشتے طے بھی حیدر صاحب نے ہی کروائے تھے، وہاج حسن کے گھر اور فیملی پر ان کے جو احسانات تھے وہ اس کا برملا اظہار کر رہی تھیں اور ڈاکٹر نزہت بہت انکساری سے بولی تھیں۔

”بہن یہ سب اللہ کی مہربانی ہے، وہ ہی سب کا حیلہ اور وسیلہ ہے، ورنہ ایک خطا کار انسان کس کام کا۔“ بات کرتے ہوئے وہ کسی شناسا کی طرف بڑھ گئیں۔

”تم کیسی ہو سعیہ بیٹی! بہت عرصہ بعد ملی ہو، ہمارے گھر آئی نہیں تم پھر۔“ وہاج کی والدہ اب اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو شہریار چونکا تھا۔

”ان فیکٹ آنٹی لائف بہت مصروف ہو گئی ہے بوتیک، دفتر گھر میرڈ لائف کے بعد زندگی کو چینج کرنے کے لئے کچھ ٹائم چاہیے ہوتا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”آپ کی شادی کا سن کر افسوس سا ہوا تھا ہمیں بچ ہم تو سمجھنے لگے تھے کہ آپ ہمارے گھر شاید وہاج بھائی کے لئے آتی ہیں۔“ آمنہ بے سوچے سمجھے بولی یہاں سعیہ شرمندہ سی ہوئی، وہیں شہریار اک عجب تحیر اور سنجیدہ تاثرات سے دیکھنے لگا اسے۔

”واقعی بیٹی میں خود یہ سمجھی تھی کہ شاید تم دونوں آپس میں فرینک ہو، اسی لئے ہمارے گھر تمہارا آنا جانا ہے ورنہ اتنے بڑے گھر کی بیٹی اور......“ وہ یکدم خاموش ہو گئیں، انہیں سامنے کھڑے شہریار کے سنجیدہ تاثرات کا اندازہ ہوا پھر بات سنبھالنے کو بولیں۔

”بہت اچھی جوڑی ہے تمہاری اللہ سلامت رکھے۔“ لحظہ بھر کو لب بھینچے کے بعد شہریار مسکرا دیا۔

”عموماً شادی بیاہ کے موقع پر جوان بیٹوں کی مائیں بہنیں خوبصورت اور امیر گھرانے کی لڑکیوں کو دیکھ کر ایسی باتیں کرتی رہتی ہیں، مجھے خیال نہیں کرنا چاہیے۔“ اگلے ہی پل خود کو سنبھالتے ہوئے شہریار نے اپنے آپ کو نارمل کیا تھا، وہ سعیہ سے محبت کرتا تھا اسے بچپن سے جانتا تھا اس کی ریزرو طبیعت سے واقف تھا کسی بھی قسم کے شبہ یا بے اعتباری کو اپنے دل میں جگہ دینا اسے اچھا نہ لگا۔

”قسمت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں آنٹی ویسے بھی سب قدرت کے کام ہیں جو تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے بھگتنا تو وہ پڑتا ہے ورنہ......“ سعیہ خوامخواہ جذباتی ہو کر بولی، شہریار کو کلسانے کا ایک بہترین موقع ہاتھ لگا تھا وہ بھلا کیسے خالی جانے دیتی۔

”یہ مجھے بھگت رہی ہے ورنہ...... کیا یہ وہاج سے شادی کر لیتی۔“ شہریار کی ساری حسیات چوکنا ہو گئیں وہ اسے غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

"بس میری اتنی سی خواہش ہے کہ میرا رب مجھے ایک زندگی دے یا کئی اور مجھے اتنا اختیار ہو تو میں وہ سب زندگیاں تمہارے نام کر دوں۔"

"تمہاری ان ست رنگی خوابوں بھری آنکھوں سے عجیب انسیت ہے مجھے ان میں جھانکتا ہوں تو زندگی جیسے تمام رعنائیوں سمیت میری بانہوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔"

وہاج حسن کا دلکش لہجہ، اس کی باتیں، اس کی خوشبو، کیا یہ سب بھلا سکتی تھی وہ؟ وہ مرد جس کی محبت زندگی کا تمازتوں میں چھتنار بنی ہوئی تھی جس کے بنا زندگی کا تصور نہ تھا اس کے پاس، جس کے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آتا تا، آج اس نے اپنی توجہ، خلوص، محبت کا ہاتھ کھینچ لیا تھا تو لگا تھا ننگے سر کھلے آسمان تلے کھڑی ہے، وقت کی سختی، غموں کی دھوپ ایکدم سے بڑھ چکی ہے، شک کے ناگ نے بڑھتے بڑھتے اس کی ساری خوشیوں کو ڈس لیا تھا، اپنے ناکردہ گناہ کی پاداش میں ہمیشہ جلنا تھا اسے اور زمانہ اس سے وہ سوال کرتا جن کے جواب اسے کبھی معلوم نہ تھے، وہاج حسن کی منگیتر تھی کزن تھی دوست تھی اور وہاج حسن نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ خراب کردار کی لڑکی تھی یہ وہ جرم تھا جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا اور یہ جرم اب تا عمر اسے جتایا جانا تھا اور اپنا دفاع کرنے کی ہمت وہ ہار چکی تھی کسی قسم کی وضاحت دینے کا حوصلہ بھی اس میں ناپید تھا۔

"محبت، اذیت، شکست ہر بار کے زیاں کیوں؟" اس نے آسماں کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ہزار طغیانیاں، ہزار طوفان تھے دل میں، وہاج کے گھر سے گیٹ، گیٹ سے باہر تک چند لمحوں کا فاصلہ مگر یہ لمحات جیسے صدیوں پہ محیط تھے۔

"انسانوں کی پہچان کی آخر کیا کسوٹی ہے میں جو اتنی حساس بامروت اور چہرہ شناس تھی ہر کسی سے پورے اخلاص وخلوص سے ملتی برتتی اور وہاج وہ تو زندگی کا سب سے انمول خزانہ تھا اس پر تو ہر جذبہ لٹایا تھا۔"

"ساری امیدیں ساری خواہشیں اس سے وابستہ تھیں اپنے وجود، اپنے دل خوابوں خیالوں کو اس کی امانت سمجھنا، اپنے جذبے اس پہ لٹائے جسے چاہ تھی نہ پروا اور میں اتنی احمق کہ اس کی پہچان نہ کر سکی۔"

دل میں سود وزیاں کا ایسا شدید درد تھا کہ دماغ پھٹا جا رہا تھا دھند کی دبیز چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے تنی جاتی تھی بار بار وہ دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ بار بار جھٹک رہی تھی، آنکھیں بری طرح مسل رہی تھی۔

"آہ، کیسی پاگل تھی میں اسے اپنی خوشیوں کا سبب اور چاہتوں کا مرکز سمجھتی رہی جو میرا تھا ہی نہیں، میری نادان محبت نے آج مجھے کس قدر بے مول اور ذلیل کر دیا۔" وہ حیرت اور دکھ کے سمندر میں ہچکولے کھاتی سوچ رہی تھی۔

"کس قدر افسوناک حقیقت ہے یہ کہ تمہارے وعدے، چاہتیں، محبتیں اور الفاظ جھوٹ تھے، وہ بے تحاشا شدتیں، جانفزا روپے فریب تھا، اس فریب اور جھوٹ کے ہاتھوں دل، روح، خواب، جذبے، انا، ناموس سب کچھ گروی کر دیا۔" اس کا جوڑ جوڑ چیخ رہا تھا۔

"کتنی بری طرح ہاری ہوں۔" وہ بیچ سڑک میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی، درد سا درد تھا اذیت سی اذیت تھی، دکھ کا اک لامتناہی صحرا تھا جسے پاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔

"کیوں خواب دکھائے تھا اتنے کیوں زندگی گزارنے کے اتنے پلان بنائے تھے، محبت بھرے وعدے، دلکش الفاظ دلکش رویے اور دلنشین فقرے کیوں میری سماعتوں میں انڈیلتے تھے اگر یہ سب کرنا تھا تو کیوں قائم کیا تھا وہ رشتہ جو اتنا کمزور اور بودا تھا جسے تم نے یک لخت توڑ دیا۔"

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ خوب چیخے، روئے چلائے، کوسے برا بھلا کہے وہاج حسن کو جس نے اسے ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا تھا، ایسا درد، ایسی اذیت اور ایسی اندھیری رات شاید کبھی اس کی زندگی میں نہ آئی تھی، جو بالکل خالی کر گئی تھی اور واقعی رہ بھی تو خالی ہاتھ گئی تھی، مان، یقین، اعتماد، بھروسہ تھا اسے وہاج پر آج کچھ نہ رہا تھا اور جو مان یقین نہ رہے تو رہ بھی کیا جاتا ہے۔

"آتا ہے زندگی میں کوئی شخص ایسا بھی کہ ہم جب اس سے ملتے ہیں تو اتنی محبت اتنے شدت پیدا کر دیتے ہیں جذبے ہمارے اندر ہم اس کے ساتھ رہنے، بسنے، پانے کے خواب دیکھتے تعبیریں پانے کا سوچتے ہیں تو گزارنے کے لئے ایک زندگی ناکافی لگتی ہیں اور میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے قلیل لمحات نہیں طویل زندگیاں مانگا کرتی تھی، تم نے مجھے قلیل لمحوں کے قابل بھی نہیں چھوڑا، سب لے لیا اور خسارے چھوڑ دیے میرے نام پر۔"

چپ چاپ اداس چہرہ سوجی سرخ آنکھیں اور نڈھال وجود لئے وہ واپس آئی تو زردی کھنڈے چہرے کو دیکھ کر کچھ دیر کو جویریہ اور ربیعہ کو صورتحال کا اندازہ نہیں ہو پایا، اریبہ کی خالی خالی آنکھیں اسے ہولا رہی تھیں وہ اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے اس کے کچھ کہنے کی منتظر تھی مگر اریبہ اس کی طرف دیکھنے سے مکمل گریز کر رہی تھی جیسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ ضبط کے کتنے زاویوں سے گزر رہی تھی وہ، جویریہ کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا اس کی کیفیت کا، وہ عجب تشویش بھری نظروں سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اریبہ آپی آر یو آل رائٹ۔"

"میں ہار گئی جویریہ؟" اس کے شانے پر اپنا سر رکھے وہ رونے لگی، جویریہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی اسے پہلے اندازہ تھا کچھ کچھ کہ خالہ شاید ہی کوئی مدد کریں۔

"البتہ وہاج پہ بھروسا تھا تو کیا انہوں نے بھی انکار کر دیا، اگر ادھار کے طور پر ہی کچھ رقم دیدیتے تو ہم نے واپس ہی کر دینی تھی۔" وہ سوچنے لگی۔

"کیا وہاج بھائی نے بھی انکار کر دیا؟" وہ مدہم لہجہ میں پوچھتی ہوئی بولی۔

"وہاج اس نے تو سب کچھ لے لیا دینا تو ایک طرف، وہ تو......" بے تحاشا آنسوؤں نے بولنے نہ دیا تو اریبہ نے اس کی سمت دیکھے بغیر اپنے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی اس کے سامنے کر دی، جویریہ کی آنکھوں میں ایکدم سے بے یقینی در آئی، اسے اچانک اریبہ کے دکھ اور ملال کا اندازہ ہوا۔

"سب کچھ لے لیا، اس نے، کچھ بھی نہیں چھوڑا میرے پاس، وہ کتنا خود غرض اور شکی ہے آج مجھے اندازہ ہوا، اس کی غرض تھی تو وہ میرے جذبات، سے کھیلتا رہا، محبت کے نام پر مجھ سے روپے، چاہت توجہ مان خلوص سب سمیٹتا رہا اس کی غرض ختم ہوئی تو سارے احساسات بھی مردہ ہو گئے،

شک اک ذرا سے شک نے اسے میری توجہ محبت اور وفا سے بد اعتماد کر دیا میں سمجھتی تھی وقت نے ہمیں غریب کر دیا تو کیا محبت ہے نا ہمارے مابین راستے خواہ کتنے تنگ اور پر پیچ ہوں محبت ہمیں جوڑے رکھے گی پر......" ایک بار پھر آنسو اس کے الفاظ کو دبا گئے، جویریہ نے خاموشی سے اسے دیکھا، تسلی کا کوئی لفظ اسے نہ سوجھا۔

"افسوس ہمارے مابین سب کچھ تھا پر محبت نہ تھی وہ محبت جو لاکھ مفلسی، شک، غلط فہمی، یا کمی کجی کے باوجود دلوں کو جوڑتی ہے رشتوں کو باندھے رکھتی ہے ایسی محبت کا حوالہ ہمارے مابین تھا ہی نہیں، ورنہ بے حد، بے حساب چاہنے کے باوجود ایسا نہ کرتا۔"

وہ بھرائی آواز میں بدستور بولتی جا رہی تھی جویریہ اس کے انکشاف پر اب تک ساکت تھی، اس میں ہمت نہ تھی وہ اس صورتحال پہ تبصرہ کرتی یا اسے دلاسہ دیتی، بہن کے آنسو اسے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے اور اس کی شکست خوردگی روح کو چیر رہی تھی۔

"بے تحاشا پر خلوص با مروت اور خوبصورت ہونے کے باوجود میں شکست خوردہ ہوں، ری جیکٹیڈ ہوں، وہاج حسن نے مجھے اپنی زندگی سے خارج کر دیا ہے، یہ کرب یہ تکلیف، یہ بے بسی کتنی شدید ہے۔" اس کے انداز میں اتنی اضطرابیت اور بے بسی تھی کہ جویریہ کی آنکھوں سے گرم لاوا نکلتا گیا اور اس کا چہرہ بھیگنے لگا۔

☆☆☆

"سفید شرٹ کے ساتھ یہ گرے ٹائی بالکل میچ نہیں کر رہی جبکہ پینٹ کا رنگ بھی میچنگ نہیں، کیا آپ کو ڈریس سینس نہیں۔" وہ جس انداز سے اور جو الفاظ بولی تھی وہاں موجود بھی سٹوڈنٹس کو اپنے بے ساختہ قہقہے روکنا مشکل ہو گئے، بہت ضبط کے باوجود ان کی دبی دبی ہنسی راحیل کا خون جلا گئی

"کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" اس کے ساتھ بیٹھا وصی بولا۔

"تمہاری قسمت میں بھی تو چوہا بھی نہیں۔" راحیل کلس کر بولا جی چاہ رہا تھا کوئی وزنی سی شے اٹھا کر اس کے بے تحاشا نکلتے دانتوں پر دے مارے وہ اپنے سٹائل اور ڈریسنگ کے متعلق بہت کانشس تھا مگر قسمت کہ جب وہ چینج کر رہا تھا تو لائیٹ آف تھی جو کپڑے جیسے ہاتھ لگے اس نے پہننا غنیمت جانا، زندگی میں پہلی بے ترتیبی اور اس نے بھی اشتہار لگوا دیے۔

"تم یہ غیر متوقع سوگ سے نکل آؤ، محترمہ تمہیں بھول کر لڑکیوں سے محو گفتگو ہو چکی ہیں۔" وصی نے پھر چھیڑا تو وہ محض گھور کر رہ گیا اور ان لڑکیوں کو رشک سے دیکھنے لگا جو فر فر انگلش بولتی اس انگریز حسینہ سے پاکستان، پاکستانیت، اسلام اور اسلامیات، جہاد اور دہشت گردی جیسے حساس اور خشک موضوعات پہ کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھیں۔

"صبح آپ کا سفر کہاں سے کہاں تک ہوگا۔" تقریباً بارہ منٹ بعد وہ موضوع بدلتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"زماں سے مکاں تک زمین سے آسماں تک، ہم سے تم تک اور یہاں سے وہاں تک۔" وصی کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی اور اشارہ سیدھا راحیل سے اس حسینہ تک تھا، ایک بار پھر دبی دبی مسکراہٹ ہر چہرے پر کھلنے لگی جبکہ ماریا کو ان کی بے وجہ ہنسی کا ریزن سمجھ نہ آسکا، وشمہ نے انہیں زبردست گھوری سے نوازتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم انشاء اللہ سب سے پہلے گلگت کے لئے روانہ ہوں گے یہاں سے اور اپنی کشش، خوبصورتی کے لحاظ سے یہ سب سے نمایاں مقام ہے۔"

"کیا اسلام آباد مری اور سوات سے بھی زیادہ؟" ماریا کچھ استعجاب و حیرت سے بولی۔

"شمالی علاقہ جات میں وادی گلگت، ہنزہ، سکردو چترال، بلتستان، ناران، کاغان، ایسے بلند ترین پہاڑی مقامات ہیں جو بلندیاں چیرتے ہیں اور ان چوٹیوں کی اونچائی (1000) میٹر سے لیکر (8000) میٹر تک سطح سمندر سے بلند ہیں مختلف جگہوں پر مختلف اونچائی ہے ہر ایک وادی اپنی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے پر کشش اور اپنی مثال آپ ہے۔"

ٹور گائیڈ جو ماریا کے ساتھ تھا وہ معلومات دیتے ہوئے بولا اور اس کا شوق سیاحت جیسے کچھ اور فرد بتر ہوا۔

"آپ کا ایک کام کرنا ہوگا بہتر ہوگا کہ جانے سے قبل آپ کچھ ایسے لباس خرید لیں جنہیں پہن کر پاکستانی خواتین کی طرح نظر آئیں تا کہ سیکیورٹی پوسٹوں پر زیادہ مسائل کا سامنا نہ ہو۔" ٹور گائیڈ کا مشورہ صائب تھا، اس کے پاس دو لباس تو پہلے سے تھے پاکستانی طرز کے جو شلوار قمیض دوپٹہ پر مشتمل تھے اور اس نے سوات سے خریدے تھے، دو لباس اس نے مزید خرید لئے۔

ان کا سفر شروع ہوا تو سب سٹوڈنٹس اور ڈرائیور، گائیڈ سمیت عربی میں کوئی دعا پڑھنے لگے پھر سفر شروع ہو گیا موسم سرما کی برف پگھلنے سے سڑک کا کچھ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ درخت بھی سڑک کے اطراف سے گرے پڑے تھے سب سٹوڈنٹس جو ملے گلے شور شرابے میں کبھی شاعری سنا رہے تھے تو کبھی سنگر بنتے سر الاپنے لگتے، وہ اتر کر سڑک پر گری چٹانوں اور درختوں کو ہٹانے لگے جبکہ ڈرائیور نے یہ کام مکمل ہونے پر بسم اللہ پڑھ کر جیپ کو پانی میں اتار دیا اور ماریا جوزف جو پریشان کن اور غیر یقینی کیفیت سے دوچار تھی وہ پچھتا رہی تھی کیوں نہ وفد کے ساتھ چلی گئی اگر اسی نشیبی سڑک کے نیلی پانی نے سب کی جان لے لی تو......

"سارا تھرل، جوش اور سیاحت دھری رہ جائے گی۔" محض دعاؤں کے سہارے بہادری کا یہ نیا مظاہرہ اس کے لئے عجیب چیز تھی اور وہ ہولا رہی تھی۔

"ہوائی سفر سے ایک گھنٹہ لگنا تھا اور آرام سے پہنچ جاتے یہ بھی آپ کا شوق تھا کہ سفر بذریعہ سڑک ہوگا تا کہ قدرتی نظارے دیکھتے چلیں۔" سعید صاحب نے کہا۔

"مجھے کیا پتا کہ فطری نظارے دیکھنا اتنا مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں زندگی اور موت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جب جیسے اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دیں، موت ایسے آئے گی اس سے لحہ پہلے یا پیچھے نہیں، دنیا میں اگر آج آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے تو آپ لاکھ حفاظتی اقدامات کر کے بھی خود کو نہیں بچا سکتیں ایک بات یاد رکھیئے گا اول و آخر اللہ ہی ہمارا محافظ ہے۔" وہی وصی جو سارا راستہ چٹکلے سناتا ہنسی مذاق کرتا آیا تھا بہت سنجیدگی سے بولا تو ماریا کچھ دیر اس کے الفاظ پہ غور کرتی رہ گئی۔

”خدایہ اتنا پختہ یقین یہ سب حقیقت ہے کیا، واقعی کوئی ہستی ہے کہ موت اور زندگی جس کے ہاتھ ہے یا یہ لوگ محض مجھے دلاسہ دے رہے ہیں۔“ وہ الجھی۔

”کہیں ایسا تو نہیں یہ جان بوجھ کر اس راستے سے آئے ہوں محض مجھے ختم کرنے کو آخر ہیں تو مسلمان اور مسلمان سب سے پہلے دہشت گرد ہے پھر کچھ اور......“ وہ اب دوسری نہج پر سوچنے لگی تو دل میں وہم اور خوف کے سائے لہرانے لگے، اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں موجود ہنستے مسکراتے نوجوان لوگ اب لمبے لمبے چوغے نما لباس میں اونچے عمامے اور لمبی ڈاڑھیوں والے دکھائی دینے لگے، جن کی آستینوں میں بم یا ہتھیار تھے۔

”اُف خدایا میں بری پھنس گئی۔“ وہ بے طرح سہمی ہوئی تھی۔

”یہاں اس جگہ موت۔“ بے وطنی بے چارگی اور بے بسی کا گہرا احساس ہوا تھا۔

”میں موت سے نہیں ڈرتی، بہت بار موت کو قریب سے بلکہ چھو کر دیکھا ہے، میں نے لیکن اس کا بھی ایک مقصد ہے جو زندگی میسر ہے بنا مقصد مرنا افسوناک ہے۔“ خود کو بہادر بناتی وہ کچھ نہ کچھ بولنے کے منہ کھولنے لگی، لیکن اندر سے خوف زدہ ہونے کے باعث اسے بالکل معلوم نہ تھا وہ کیا اور کیوں کہہ رہی ہے۔

”آپ کے نزدیک کیا مقصد ہے زندگی کا۔“ خاموش بیٹھی فاطمہ نے پوچھا۔

”ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہنا اور ذاتی خوشی کا حصول۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی تو آمنہ نے نرمی سے کہا۔

”ذاتی خوشی کا حصول بری بات نہیں لیکن بحیثیت انسان زندگی کی اصل جاننا ہی مقصد اعلیٰ ہے اور اصل حقیقت اللہ تبارک تعالیٰ اور اس کے احکامات ہیں۔“

”میں اتنا جانتی ہوں کہ خدا نے انسان کو زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا اور اسے ایک ذمہ داری سونپی کیا میں یہ نہیں جانتی، جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”سب سے پہلے ایک تصحیح کر لو کہ ہم اللہ پر یقین رکھ کر ہی غیر معمولی قوت کے حصول میں کامیاب اور روزمرہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اللہ کے نائب کا پہلا مقصد اس کی عبادت اور احکامات بجالانے کے ساتھ ہر مدد کا حصول اللہ کو سمجھنا ہے یقین کے ساتھ اور یہ یقین بڑے کام کی چیز ہے، وہ کام جو اپنے قوت بازو کے زور پر مشکل لگے یقین برحق ہو تو آسان ہو جاتا ہے۔“

”مگر کیسے؟“ ماریا اپنے خوف کو بھولے اب آمنہ سے گفتگو میں محو حیرت تھی۔

”ایسے کہ اس نشیبی آبی سڑک سے جیپ گزارنا اور اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنا ایک دشوار کام تھا ڈرائیور نے اللہ پر یقین رکھ کے جیپ پانی میں اتار دی تھی اور دیکھ لو اس اللہ نے اس یقین کو کامیاب کیا ہم اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ چکے ہیں۔“

آمنہ کے کہتے ہی جیپ رک چکی تھی اور وہ سب خوشی حیرت سے نعرے لگاتے نیچے چھلانگیں لگانے لگے، ماریا بھی ان کے ہمراہ اترنے لگی۔

یہاں اس نے سب لڑکیوں کو سر ڈھانپے دیکھا تو وہ بھی انہی کی طرح دوپٹہ سر پر رکھ کر سینے پہ پھیلانے لگی لڑکے ہوٹل کا پتا کرنے لگے اور لڑکیاں منہ ہاتھ دھونے کے لئے جانے لگیں ان کی تقلید میں ماریا بھی وجود میں تھکاوٹ محسوس کرتی فریش ہونے لگی، فریش ہوتے ہی سب نے گرما گرم چائے، پکوڑے اور چپس منگوائے، چونکہ رات ہونے کو تھی گھومنے کا ارادہ اگلے دن پر رکھ کے وہ سب آرام کرنے چلے گئے۔

☆☆☆

میری اتنی سی خواہش ہے کہ
میں اک آسماں ہوتا
اور تو میری زمین ہوتی
میں جھک کر تیرے سارے غم
اپنے کاندھوں پہ ڈھو لیتا
تیری تکلیفیں اور کٹھنائیاں
خود میں سمو لیتا
اور میرے بادلوں سے بارشیں
چھم چھم برستیں تو
تجھے سیراب کر دیتیں
وہ تیری پیاس کو پی کر
تجھے شاداب کر دیتیں
میرے سورج کی کرنیں
تجھ پر پڑتیں تو
بڑی انمول ہو جاتیں
میں تجھ سے روٹھتا تو تاریک رات ہو جاتا
مگر پھر بھی میرا چندا
تیرے ہی ساتھ ہو جاتا
کہیں تارے چمک پڑتے
گو میرا حسن بڑھانے کو

بے تاب رہتے وہ
تیرا آنچل سجانے کو
لیکن جاناں! میں نے مانا
کہ ایسا ہو نہیں سکتا
نہ جانے کس کی سازش ہے
مگر پھر بھی میری اتنی سی خواہش ہے

خوبصورت چہروں روشن ماحول خوشبوؤں سے معطر فضاؤں میں چمکتے سفید گلوب کی روشنی میں

بھاری خوابیدہ اور دلکش لب و لہجہ میں بولتے وہاج حسن کے وجیہہ چہرے پر بالکل سنجیدگی چھائی ہوئی تھی، وہ سامنے سٹیج پر دیکھتے ہوئے چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا جو اپنے عزیز و اقارب کے گھیرے میں بیٹھا بہت پرزور اصرار پر لب کشائی کر رہا تھا، شہریار نے غیر محسوس طور پر سعیہ کو دیکھا تھا جو بہت خاموش بیٹھی تھی اور شہریار کو یہ خاموشی بری طرح چبھی تھی ایسا وقت کہ جب کسی کی شادی ہو اور پھر موسم کا بھی ماحول کے ساتھ خوشگوایت عطا ہو تو وہ انجوائے نہیں کر پا رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" اس کے اعصاب جیسے چیخ گئے تھے۔

"کیا آپ بھی شادی کو بور کا لڈو سمجھ کر پچھتا رہے ہیں کھا کر جو اتنے خاموش بیٹھے ہیں۔" کسی منچلے نے شاید انہیں چھیڑا تھا اور شہریار لب بھینچ کر ذرا سا مسکرایا، پھر اس کی طرف دیکھنے لگا جو اب اٹھ کر وہاج حسن کو کچھ کہہ رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے بے ساختہ ہی شہریار کو دیکھنے لگا، شہریار اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب چلا آیا۔

"اٹس ٹو مچ، وہاج بات صرف شکل و صورت کی نہیں اخلاق و کردار کی بھی ہوتی ہے ایک بہت شاندار حیثیت، خوبصورت شکل رکھنے والا بندہ بھی اچھے روپے و عادات کا مالک نہ ہو تو اخلاقیات پہ جان دینے والے فرد کا اس کے ساتھ رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔"

وہ کس کے متعلق بات کر رہی تھی، شہریار سمجھ نہ پایا لیکن چیئر گھسیٹتا ہوا ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"نو ڈاؤٹ لیکن شہریار جیسے شاندار بندے کو بیوی ہوتے ہوئے ایسی رنجیدہ اور سنجیدہ رائے چہ معنی دارد۔"

"میری رائے کو چھوڑو تم اپنی بتاؤ سہرا کب باندھ رہے ہو۔" سعیہ نے پہلو تہی کرنے والے انداز میں ذرا سا مسکراتے ہوئے پوچھا، گہری سانس لے کر وہ آگے کو جھکا۔

"کیا کہوں اب، وہ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ۔"

تم مقدر میں نہیں تمھیں میرے
تم جیسی اور ملتی نہیں

"جذبات اور دل کے ہاتھ میں کبھی اپنی ذات نہیں دینی چاہیے ورنہ خواری ہوتی ہے۔ جس سے محبت کی جائے واقعی اس کی کمیاں، خوبیاں، نرمی، خوبصورتی، لطافت سب منفرد لگتا ہے اور اس طرح کا کوئی نہیں دکھتا لیکن زندگی واہموں کے سہارے بھی نہیں گزرتی ہر وقت خود میں حقیقت کا سامنا رکھنے کی ہمت ہونی چاہیے۔" سعیہ جیسے درپردہ اسے سمجھا رہی تھی اور جو شہریار سمجھا وہ سمجھ کر اس کے اعصاب تن گئے۔

"ہاں اور اب کرنا کیا ہے۔"

جو زندگی تھی وہ تو تیرے ساتھ گئی
اب تو عمر کے نقشے میں رنگ بھرنا ہے

وہاج نے ہلکی سانس بھرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"وہ لڑکی جسے وہاج محبت کرتا تھا کیا وہ سعیہ تھی؟ وہاج حسن اسے اپنی فرسٹ کزن کہتا تھا تو کیا میری وجہ سے؟" وہ خاموش سا دونوں کو دیکھ رہا تھا اسے وہاج کے الفاظ یاد آئے۔

"جیسے بہت ٹوٹ کر چاہا تھا وہ شاید میری نہیں تھی اور اسے مسلسل اپنا سمجھے جانا میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔"

"تو کیا وہ سعیہ میں انوالو تھا اور شاید سعیہ بھی اسی لئے یہ میرے ساتھ خوش نہیں دکھائی دیتی۔" وہ مضطرب سا ہوا اور اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا، وہاج کے انٹرویو والی مس انڈر اسٹینڈنگ، سعیہ کا اسے جاب دینے سے رفیوز، پھر وہاج کا سوچ کر اس کا مسلسل ڈپریشن اپنے اور شہریار کے درمیان تعلق سے کتراتا، گریز، انکار پھر کسی انجانی مجبوری اور مصلحت کی بناء پر اقرار، وہ پوری تقریب میں یہی سوچتا رہا اور پھر جیسے کڑی سے کڑی ملتی گئی کہانی کا سارا سرا کھل چکا تھا۔

"وہ مصلحت وہ مجبوری کہیں وہاج کی مستحکم پوزیشن تک انتظار تو نہ تھا، شادی رخصتی سے اب تک سعیہ کا بیگانہ انداز اجنبیت اور بے رخی اسی پرانی محبت کو نہ بھلا سکنے کی وجہ تھی، کیا وہ وہاج سے کیے گئے کسی عہد کی پابند تھی یا وہاج دوستی پہ محبت کو قربان کر گیا بنا مجھے بتائے۔"

"یہ اب سے کچھ دیر پہلے والی گفتگو اشعار، الفاظ، معنی، مطالب، سوال، جواب جیسے سب کھلتے گئے اور شہریار اسے سب سمجھ آ چکا تو ایک پل میں جیسے آندھیوں کا شور اسے چھو کر گزر گیا۔" اپنا پورا وجود کسی تار عنکبوت میں جکڑا محسوس ہونے لگا۔

سعیہ کے سارے رویے اسے یاد دلا رہے تھے وہ خالص پن جو شاید یکطرفہ جذبات میں وہ کھو چکا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ سعیہ محض چڑتی ہے اس کے حاکمانہ مزاج اور انا پسند طبیعت سے وہ آہستہ آہستہ اس کی خائف طبیعت کو اپنی محبت کے سہارے خوشی و بشاشت کے ٹریک پر لے آئے گا لیکن ابھی ابھی اس پہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کی زندگی اور دل تک آنے والے راستوں میں محبت تو شاید کہیں تھی نہیں، سعیہ کے دل تک جاتے راستوں پہ کھڑا وہ مدتوں بھی سعی کرتا رہتا تو کچھ نہ پاتا۔

کہ وہاں تو پہلے سے کوئی براجمان تھا اور وہ کوئی اور نہیں اس کا سنگی، ساتھی وہاج حسن تھا وہ اس سے شکست کھا چکا تھا اسٹیڈیز میں اب زندگی میں، محبت میں سب پا کر بھی ناکام تھا کتنا تکلیف دہ انکشاف تھا، جس کے دکھ سے نکلنا مشکل تھا کیسی اذیت اور کرب تھا جس پہ ہنسا جا سکتا تھا نہ رویا، جیت کی خوشی تھی نہ ہار کا غم کچھ بڑھ کر تھا جو رگیں چیرے دے رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

منزل عشق

فرحت عمران

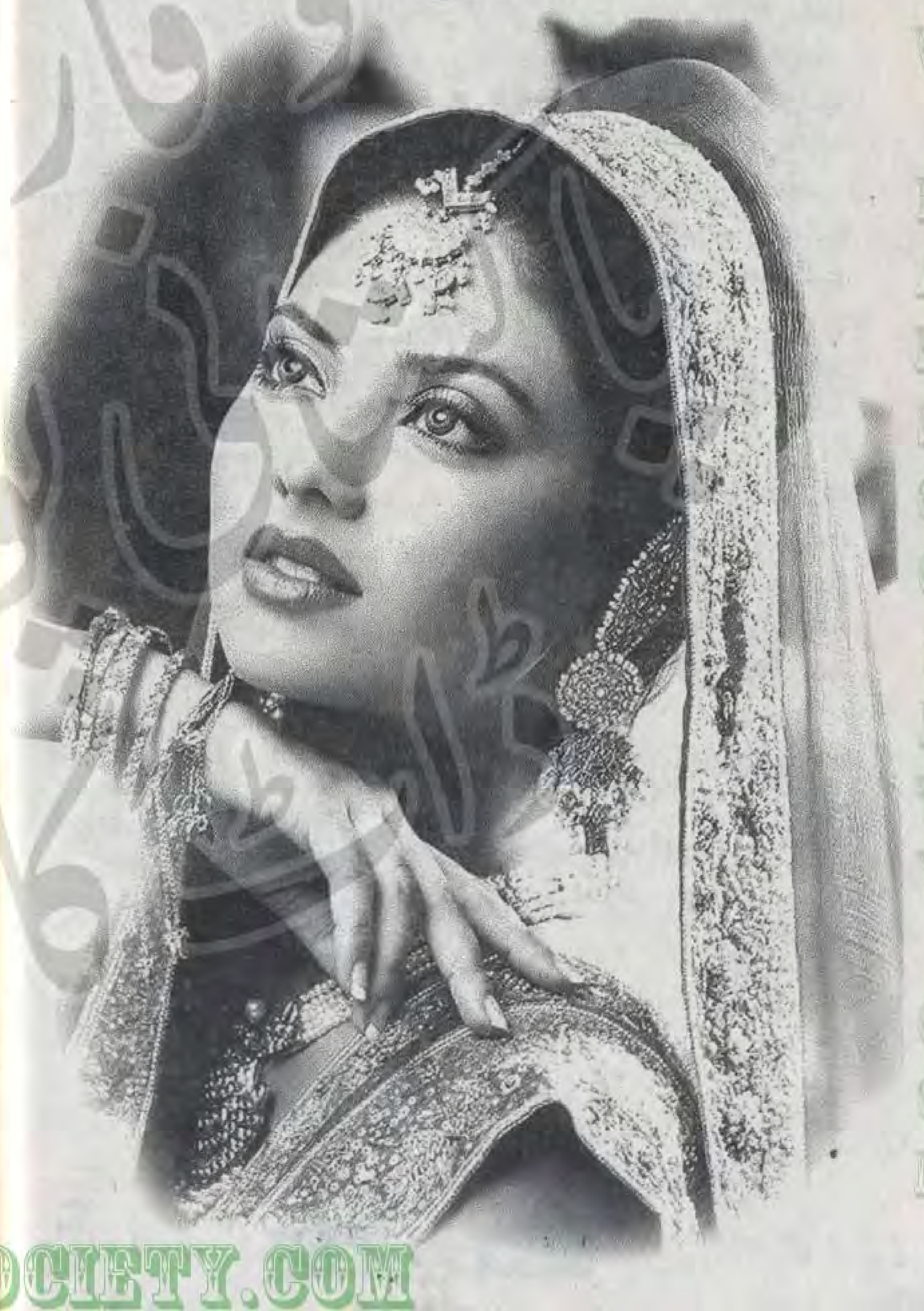

اس نے آہستگی سے بڑے آہنی گیٹ سے ملحقہ چھوٹے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہلکی سی آہٹ سے کھل گیا، گیٹ حسب معمول بند تھا مگر لاک نہ تھا وہ اندر داخل ہو گیا، سب کچھ ویسا ہی تھا، دو مہینوں میں کچھ بھی نہ بدلا تھا، گویا یہاں کسی کو اس کی غیر موجودگی کی پرواہ نہ تھی، مما لان میں گھاس پر بیٹھی پالک کاٹ رہی تھیں اور ملازمہ ان کی مدد کروا رہی تھی، ان دونوں نے کام میں مگن گیٹ کی آہٹ پر دھیان نہ دیا تھا، وہ بوجھل سانس فضا میں خارج کرتا ان کے قریب آن رکا۔

”السلام علیکم!“ اس نے انہیں سلام کرتے ہوئے گویا اپنی آمد کی اطلاع دی، مما کے تیزی سے پالک چنتے ہاتھ ساکت رہ گئے اور انہوں نے اک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا۔

”ارے عبدالاحد بھائی!“ ثناء (ملازمہ) بے ساختہ خوشی کا اظہار کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی، وہ بچپن سے یہیں پلی بڑھی تھی اسی لئے وہ اسے اور بڑے بھیا کو بھائی کہتی تھی، اس نے آغاز میں انہیں ”صاحب جی“ کہنا چاہا تھا لیکن ان دونوں بھائیوں نے اسے سختی سے ٹوک دیا، ان دونوں کے حلق سے ”صاحب“ کا لفظ نیچے نہ اترا تھا، سو وہ عبدالاحد اور عبدالصمد کو بھائی کہنے لگی تھی۔

اگلے لمحے صالحہ بیگم کے رکے ہاتھ متحرک ہو چکے تھے ان کے چہرے پر اک لمحہ کو نمودار ہونے والی ممتا بھری خوشی ناراضگی کا لبادہ اوڑھ کر چہرے کی سختی اور سپاٹ پن میں گم ہو گئی تھی۔

”کیسی ہو ثناء!“ عبدالاحد نے مما کی بیگانگی نوٹ کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں ثناء کی خیریت دریافت کی، اس کے اندر توڑ پھوڑ اور احساس شکستگی نے اودھم مچا رکھا تھا مگر اس کا لہجہ شگفتہ اور متوازن تھا اور چہرے پر نرم مسکراہٹ

مکمل ناول

پھیلی ہوئی تھی۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں کہاں تھے اتنے دن، آپ لاہور کیا گئے ہمیں تو بالکل ہی بھول گئے۔" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے منہ پھلاتے ہوئے شکوہ کیا تو عبدالاحد نے بے ساختہ مما کو دیکھا وہ تو ایسی محبت و اپنائیت بھری شکایت تو ان سے سننا چاہتا تھا جو ارد گرد سے بے نیاز پالک کاٹنے میں مگن تھیں، یوں جیسے وہ یہاں نہ ہو یا پھر اس وقت سب سے اہم کام یہی تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" اس سے قبل کہ وہ ثناء کو کوئی جواب دیتا، زوبیہ (خالہ زاد) کی چہکتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ پلٹا تو سامنے نک سک سے تیار زوبیہ پر نظر پڑی، وہ سٹائلش لائٹ پرپل کلر کے سوٹ میں ملبوس ہم رنگ آویزے پہنے بے حد دلکش و حسین لگ رہی تھی اس کی دودھیا رنگت خوشی سے دمک رہی تھی، اندرونی خوشی سنہری کرنوں کی صورت اس کے روپ کو دوچند کر رہی تھی، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو زوبیہ کے حسین و دلکش روپ پر نہیں مریم کے سلونے روپ پر مرتا تھا، وہ بلاشبہ مریم سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن وہ نہ تو عبدالاحد کے دل کی تمنا تھی اور نہ ہی اس کی دعاؤں میں کہیں زوبیہ کا نام آتا تھا۔

"آؤ میری بچی۔" مما نے بھرپور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں سمو لیا، عبدالاحد کا دل کٹ کر رہ گیا اس کے اندر سانس لیتی موہوم سی آس دم توڑنے لگی۔

لیکن وہ بھی انہی کا بیٹا تھا، آسانی سے ہار نہ ماننے والا، زوبیہ مما کی بانہوں کے حلقے میں گھسی کن اکھیوں سے عبدالاحد کو دیکھتی مسکرا دی، گویا وہ اسے اپنی حیثیت باور کروانے کی کوشش کر رہی تھی، عبدالاحد غصے و شکستگی سے مٹھیاں بھینچتا تیزی سے اندر بڑھ گیا، ثناء نے اک نظر صالحہ اور زوبیہ پر ڈالی جسے اس کے منہ سے اپنے لئے "باجی" نہیں "بی بی جی" سننا زیادہ اچھا لگتا تھا اور صالحہ بیگم کے گہری سوچ میں ڈوبے وجود نے اسے پہلی بار ان سے متنفر کیا تھا، بھلا کوئی ماں یوں بھی اولاد کی خوشیوں سے منہ توڑ سکتی ہے اور دوسری نظر لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے عبدالاحد پر ڈالی، جس کے قدموں سے لپٹا احساس شکست اس کے دل کو چیر رہا تھا، اس نے پہلی بار اس کے حق میں دعا مانگی تھی، ثناء کو بناء دیکھے اور ملے مریم سے انسیت محسوس ہونے لگی تھی، یقیناً وہ بہت اچھی لڑکی ہوگی جو عبدالاحد جیسے شاندار بندے کی چاہ اور تمنا تھی۔

☆☆☆

وہ نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا تھا اس کی آنکھ اذان کی آواز سے کھلی تھی، اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا اور اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، شام کے سائے باہر گہرے ہو چکے تھے۔

"اوہ گاڈ۔" وہ اک جست میں بستر سے باہر تھا، وہ صبح ساڑھے دس بجے گھر پہنچا تھا اور زوبیہ اور مما والی بدمزگی کے بعد سب سے خفا سا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا اور آتے ہی کچھ دیر بعد سو گیا تھا، کچھ سفر کی تھکان اور رات بھر کے رتجگے نے اس پر جلد ہی نیند حاوی کر دی تھی، مما کو تو اس کے کمرے میں نہ آنا اس کی سمجھ میں آتا تھا مگر بھابھی اور ثناء نے بھی اس کی خبر نہ لی تھی، بابا اور بھیا تو یقیناً آفس میں ہوں گے مگر ثناء اور بھابھی، وہ خود سے الجھتا سوچوں میں گم اپنی وارڈ روب سے کپڑے نکال کر واش روم میں نہانے چلا گیا۔

وہ تقریباً پینتیس منٹ بعد نہا کر باہر نکلا تو

ثناء چائے لیے اس کی منتظر تھی، بعض چاہتیں ہمیں بے مول خرید لیتی ہیں وہ مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھام کر ہولے سے ثناء کے سر پر چپت لگاتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑا ہوا، غصہ جھنجھلاہٹ، دکھ اور احساس شکستگی اپنی جگہ مگر اس وقت اسے حقیقتاً چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔

"باقی سب کیا کر رہے ہیں؟" عبدالاحد نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے آئینے میں باہر نکلتی ثناء کے عکس پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بھابھی کل سے میکے گئی ہیں، عبدالصمد بھائی انہیں رات کو لیتے ہوئے گھر آئیں گے، بابا آفس ہیں اور مما زوبیہ بی بی کے ساتھ اپنے کمرے میں ہیں۔" ثناء کا دروازے کی ناب گھماتا ہاتھ تھما اور اس نے پلٹ کر فرداً فرداً سب کا بتایا۔

"واٹ نان سینس۔" عبدالاحد، زوبیہ کی موجودگی کا سن کر جی بھر کر بدمزہ ہوا، تلخی و غصے نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے وجود کو گھیر لیا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا برش ٹیبل پر پٹخا اور سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھا لیا، ثناء اسے بتا کر جا چکی تھی، وہ کھولتے ذہن سے گرم چائے پینے لگا تھا۔

☆☆☆

"مما! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اسے آئے پانچواں دن تھا، وہ محض ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا، زوبیہ تین دن رہنے کے بعد اپنے گھر جا چکی تھی، اس نے زوبیہ کی موجودگی میں خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا، زوبیہ نے اس تک پہنچنے کی بھرپور کوششیں کیں مگر وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا، وہ بابا اور بھیا کے آفس جانے کے بعد اپنے کمرے میں گھستا تو ان دونوں کے رات کو گھر لوٹنے پر ہی کمرے سے باہر نکلتا تھا، ثناء یا بھابھی اسے دوپہر کا کھانا اور چائے اس کے کمرے میں ہی دے جاتی تھیں، بھابھی کا ووٹ بھی اس کے حق میں تھا مگر وہ بے بس تھیں کہ گھر میں حکم اور فیصلہ کا اختیار صرف مما رکھتی تھیں۔

زوبیہ دن میں کئی بار اس کے کمرے میں آنے کی کوشش کرتی لیکن وہ دروازہ نہ کھولتا تھا مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی، مجال ہے جو ذرا سی بھی ہمت ہار جائے، اس کا گھر بھی اسی کالونی کے اینڈ پر تھا، اس کا جب اور جس وقت دل چاہتا ان کے ہاں چلی آتی تھی، عبدالاحد کو اس کی یہ عادت سخت ناپسند تھی اور صالحہ کو اتنی ہی محبوب، انہیں اکلوتی مالدار بھانجی عبدالاحد کے لئے بہت پسند تھی، انہوں نے تو اسے بچپن میں ہی بہن سے بیٹے عبدالاحد کے لئے مانگ لیا تھا، عالیہ نے بچوں کے جوان ہونے تک معاملہ ٹال دیا تھا، نجانے زوبیہ کو کیسے اس بات کی بھنک پڑ گئی تھی وہ دل ہی دل میں عبدالاحد کو چاہنے لگی تھی اور اب تو یہ چاہت دیوانگی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

نماز کے بعد تسبیح پڑھتی صالحہ نے لمحہ بھر کر رک کر اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا وہ ملگجے لباس، الجھے بال، سرخ آنکھیں اور اپنی ذات میں الجھے عبدالاحد کو دیکھ کر پگھل گئیں ان کا دل ممتا بھری چاہت سے دھڑک اٹھا، انہوں نے تسبیح رکھ کر خود سے بھی خفا عبدالاحد کا ہاتھ تھام لیا۔

عبدالاحد ان کی اتنی توجہ و محبت پا کر موم کی طرح پگھلنے لگا، اس کی آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی وہ ماں سے آنسو چھپاتا لب بھینچ کر رہ گیا، دونوں کے بیچ اک نامحسوس سی خاموشی در آئی۔

"مما پلیز مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سونپ دیں۔" عبدالاحد لجاجت بھرے لہجے میں ان کی منت کرتا ان کی گود میں لیٹ گیا،

صالحہ کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی، ان کے چہرے پر سختی اور آنکھوں میں بیگانگی ابھر آئی، وہ عبدالاحد کا سرآہستگی سے پرے کرکے تسبیح میں مشغول ہو گئیں، وہ ساری عمر اپنی من مانی کرتی آئی تھیں، فاروق صاحب نے بھی اس ضمن میں انہیں منانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے تھے۔

"مما! میں زوبیہ کو خوش نہ رکھ سکوں گا اور نہ ہی خود خوش رہ سکوں گا۔" عبدالاحد غصے و جھنجھلاہٹ سے کہتا اٹھ بیٹھا، صالحہ بیگم ٹس سے مس نہ ہوئیں وہ اس کے غصے و ناراضگی کو وقتی جذباتیت اور "جوانی کا ابال" سمجھ رہی تھیں انہیں پورا یقین تھا کہ وہ زوبیہ کی حسین و دلکش قربت میں مریم کو بھول جائے گا جو ابھی سے ان کے فرمانبردار اور سعادت مند بیٹے کو اپنے اشاروں پر نچارہی تھی، اگر وہ عبدالاحد اور مریم کی شادی کر دیتیں تو انہیں بیٹے اور زوبیہ کو بطور جہیز ملنے والے لاکھوں کی پراپرٹی سے دستبردار ہونا پڑتا جو انہیں کسی طور قبول نہ تھا۔

"عبدالاحد! بیٹا زوبیہ بہت اچھی لڑکی ہے تم دونوں کی خوب نبھے گی۔" عبدالاحد منہ بنائے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

صالحہ کے پریقین لہجے نے اسے بری طرح تپا دیا، وہ ناراضگی کے طور پر اپنی کمپنی کی لاہور برانچ میں ٹرانسفر کروا کر گیا تھا کہ شاید وہ اس کی جدائی کے باعث ضد چھوڑ دیں لیکن وہ تو اپنی ضد پر روز اول کی طرح قائم تھیں، وہ غصے میں راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ہوں جب کل کو زوبیہ کی دولت پر عیش کرے گا تو ماں کو دعائیں دے گا۔" صالحہ نے تنفر سے سوچا تھا اور دوبارہ تسبیح میں مشغول ہو گئیں انہیں اس سارے بکھیڑے میں اپنی تسبیح کی تعداد بھی بھول گئی تھی اور اب وہ نئے سرے سے تسبیح کرنے لگیں تھیں انہوں نے عبدالاحد کی ضد اور اپنی تسبیح بھولنے کا غصہ مریم کو دل ہی دل میں کوس کر نکالا تھا۔

☆☆☆

"مریم! بیٹا شام ہونے والی ہے تم یہاں ٹھنڈ میں کیوں بیٹھی ہو؟" اوائل دسمبر کے دن تھے، شام کا ملگجا اندھیرا چہار سو پھیل چکا تھا، آسمان پر پرندے ٹولیوں کی صورت اپنے آشیانوں کی سمت محو پرواز تھے، وہ صحن میں بچھے تخت پر سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ اماں چلی آئیں۔

عبدالاحد نے دو دن سے اس سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا، وہ آج کل لیو پر گھر آیا ہوا تھا مگر دونوں کی ملاقات کی کوئی سبیل نہ تھی، وہ اپنی مما کو منانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن ان کی ضد نہ ٹوٹ رہی تھی۔

"اگر وہ نہ مانیں تو۔" مریم نے اپنی ہی سوچ سے پریشان ہو کر وحشت بھری نگاہوں سے اماں کو دیکھا، وہ تشویش بھری نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں، ان دونوں کا ساتھ دو سالوں سے تھا، دونوں نے اکٹھے ماسٹرز کیا تھا اور نہ جانے کب محبت کے بندھن میں بندھے دونوں ہی کو خبر نہ ہوئی اور جب ادراک ہوا تو جدائی سوہان روح تھی ان دونوں میں کوئی روایتی عہد و پیمان نہ ہوئے تھے، عبدالاحد اپنی محبت میں کھرا اور سچا تھا اسی لئے وہ اپنی مما کو منانے کے جتن کر رہا تھا۔

"تمہاری عبدالاحد سے بات ہوئی۔" اماں جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں انہوں نے مریم کی خاطر دوسری شادی نہ کی تھی، وہ خود بھی باوقار اور صوم و صلوۃ کی پابند تھیں اور انہوں نے بیٹی میں بھی یہی خوبیاں پیدا کی تھیں، جب عبدالاحد نے یونیورسٹی کے آخری روز مریم سے اظہار محبت کیا تو وہ بے یقین رہ گئی، وہ خود بھی اسے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی مگر اس کی چاہت میں اک وقار اور جھجک تھی جس سے عبدالاحد بہت مرعوب ہوا تھا۔

اس نے مریم کو الفاظ میں الجھانے کی بجائے سیدھے سادھے طریقے سے گھر بات کی اور جیسے گھر میں بھونچال آ گیا تھا، اس کی مما نے نہ صرف صاف الفاظ میں انکار کیا تھا بلکہ مریم کے لئے اس کی یونیورسٹی فیلو ہونے کے ناطے نازیبا جملے بھی استعمال کیے تھے، عبدالاحد نے فوراً ماں کے جملوں کی تردید کی تھی مگر ان کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی، مریم کو یہ سب عبدالاحد کی زبانی معلوم ہوا تھا، وہ اسے کبھی کبھار فون کر لیتا تھا مگر مریم نے کبھی اس سے خود رابطہ نہ کیا تھا۔

اماں نے ٹٹولتی نگاہیں اس پر گاڑھتے ہوئے استفسار کیا تھا، اس کے ایگزامز کا رزلٹ بھی آنے والا تھا، انہوں نے جوانی میں بیوگی کا درد سہا تھا اور زمانے کے سرد و گرم سے مریم کو بچانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی لیکن اس نے محبت کا یہ کیسا روگ پال لیا تھا، انہیں اپنی ساری محنت اکارت ہوتی محسوس ہو رہی تھی، بیٹی کے پرملال چہرے نے ان کا دن رات کا سکون چھین لیا تھا۔

"نہیں۔" مریم نے دور افق پر اڑتے پرندوں پر نگاہیں جماتے ہوئے سرسراتے لہجے میں جواب دیا، اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے، اس نے ماں سے آنکھوں میں آئی نمی چھپانے کو خواہ مخواہ دوپٹہ سر پر سلیقہ سے جمانے کی کوشش کی، دونوں کے بیچ اک محسوس کی جانے والی خاموشی در آئی، گویا دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا ہو، اماں اسے کوئی جھوٹا دلاسا یا خواب نہ دکھانا چاہتی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ مریم خود اپنا دکھ سہنے کی طاقت مجتمع کرے، محبت کبھی کبھار یونہی انسان کو تنہا و خاموش کر دیتی ہے، وہ دل میں بیٹی کی خوشیوں کی دعائیں مانگتی مغرب کی نماز کے لئے اٹھ گئیں۔

☆☆☆

اتنا تو میرے حال پر احسان کیا کر
آنکھوں سے میرا درد پہچان لیا کر
کوئی ساتھ دے سفر میں بہت تھک گیا ہوں میں
کچھ پل ہوں تیرے ساتھ میری مان لیا کر
افسانے محبت کے ادھورے نہ چھوڑو تم
جرم وفا کا مجھ سے ہر بیان لیا کر
محبت کی آس پر ٹھہرا ہوا ہوں میں
بھولے سے تو بھی کبھی میرا نام لیا کر
تو اپنی ذات سے وابستہ کر لے مجھے
ہو کر خفا نہ میری جان لیا کر

عالیہ نے صالحہ کی فیملی کی دعوت کی تھی، احمد اور عالیہ اپنی اکلوتی اولاد کی خوشی میں خوش تھے، عبدالاحد لاہور سے آنے کے بعد اک بار بھی ان کے ہاں نہ آیا تھا، انہوں نے اسے بلانے کا یہی حل سوچا کہ صالحہ کی دعوت کر لی جائے اس طرح وہ ساری فیملی آئے گی تو اسے بھی آنا پڑے گا، احمد نے عبدالاحد کے گریز کا جان کر عالیہ اور زوبیہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر لاحاصل، آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

زوبیہ صبح سے سرشاری کے عالم میں سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی، اس نے ملازمہ سے سارے گھر کی صفائی کروانے کے بعد کچن میں اپنی نگرانی میں عبدالاحد کی پسندیدہ ڈشز تیار کروائی تھیں، دوپہر کے دو بج چکے تھے ان لوگوں کے آنے کا ٹائم ہونے والا تھا، زوبیہ کھانے کی تیاری سے مطمئن ہو کر اپنے کمرے

میں چلی آئی۔

اس نے وارڈ روب کھول کر بلیک کرشفون کا ہلکے کام والا سوٹ نکال لیا، کالا رنگ اس کی دودھیا رنگت پر خوب جچتا تھا، اس نے سوٹ پہن کر کڑھائی سے ہم رنگ لائٹ براؤن لپ اسٹک لگائی اور کانوں میں براؤن موتیوں والے ائیر رنگز پہن لئے، وہ صرف لپ اسٹک لگا کر بھی غضب ڈھا رہی تھی، اسے عبدالاحد کا دل اپنی مٹھی میں کرنا تھا اسی لئے وہ اپنے حسن کو دو آتشہ کر رہی تھی، اس نے تیار ہونے کے بعد اپنا اک نظر ناقدانہ جائزہ لیا، اس نے اپنے لمبے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا، مگر اس کا دل مطمئن نہ ہوا اس نے بالوں کو کھول لیا۔

اب وہ تیار تھی، اس کے لبوں پر اک تفاخر بھری مسکراہٹ سج گئی، مریم کس طور بھی اس کے پاسنگ نہ تھی، اس نے مریم کا ذکر صالحہ خالہ کی زبانی ہی سنا تھا۔

”عبدالاحد، تم صرف میرے ہو۔“ اس نے تفاخر سے گردن کو ہلکا جھٹکا دیتے ہوئے سوچا، اسی پل گاڑی کا ہارن ہوا، وہ تیزی سے باہر لپکی اسے آج عبدالاحد پر اپنے حسن کی بجلیاں گرانے کی بے تابی تھی، مگر یہ کیا، وہ جونہی ڈرائنگ روم میں پہنچی اس کے قدم اک جھٹکے سے رک گئے۔

خالہ، انکل، عبدالصمد بھائی، بھابھی سبھی آئے تھے اگر نہ آیا تو وہ ہی دشمن جان زوبیہ کے اندر سناٹے اتر گئے، اس کی بے تابی و سرشاری اک پل میں اڑنچھو ہو گئی، وہ جامد کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکر ٹکر سب کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے میری بچی۔“ اس پر پہلی نظر صالحہ کی پڑی تھی، وہ اس کی دگرگوں حالت بخوبی سمجھ سکتی تھیں اس لئے وہ بشاش انداز میں محبت سے اس کی طرف بڑھیں تا کہ اسے نارمل کر کے تسلی دیں، آخر ہونا تو انہی کی مرضی سے سب کچھ تھا پھر زوبیہ کو خود کو ہلکان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر وہ ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی تیزی سے مڑ گئی، اس نے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا اور خود ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی، اس کی آنکھوں میں وحشت، خوف، اذیت سبھی کچھ تھا، اس نے ائیر رنگز نوچ کر اتارتے ہوئے دور پھینک دیئے، دل میں غبار جمع ہو گیا تھا، وہ عبدالاحد کو نہیں کھونا چاہتی تھی، میں تمہیں مریم کا نہیں ہونے دوں گی۔

”تم صرف میرے ہو عبدالاحد۔“ وہ بچپن سے ضدی اور ہٹ دھرم تھی اس کے اندر غصہ سر ابھارنے لگا، صالحہ اور عالیہ پریشان سی اس کے پیچھے لپکیں، جبکہ باقی سب اک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔

☆☆☆

بارش کی سرد ہواؤں میں پھر کوئی سہانی یاد آئی
کچھ اپنا زمانہ یاد آیا، کچھ بیتی کہانی یاد آئی
اقرار کیا تھا اس نے بھی کہ تم سے محبت ہے مجھ کو
لو بیٹھے بٹھائے آج ہم کو وہ بات پرانی یاد آئی
ہم بھول چکے تھے کہ کسی نے ہمیں دنیا میں اکیلا
چھوڑ دیا
جب غور کیا تو اک صورت جانی پہچانی یاد آئی
کچھ پاؤں کے چھالے، کچھ اشک رواں، کچھ
سپنے اور کچھ تنہائی
اس بچھڑے ہوئے ہمراہی کی ہر اک نشانی یاد آئی

وہ کافی دیر سے کمرے میں آنکھیں موندے بیڈ پر لیٹا تھا، سب گھر والے جا چکے تھے ثناء اس اثناء میں کئی بار اس کے کمرے میں جھانک چکی تھی، لیکن اس کی کیفیت و پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا تھا، اس پر آج مریم کی یادوں کا شدید دورہ

پڑا تھا، وہ مما اور خالہ کی دعوت کا اصل مقصد بخوبی سمجھتا تھا اسی لئے وہ تو اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا تھا، وہ کسی صورت بھی زوبیہ کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا، وہ صبح سے بھوکا پیاسا تھا مگر اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔

”عبدالاحد بھائی!“ ثناء کی برداشت ختم ہو گئی تو وہ دروازہ ناک کرتی اندر آ گئی، وہ اس کی آواز پر چونک کر بیٹھ گیا، اس کے وجیہہ چہرے پر حزن و ملال اور خوبصورت براؤن آنکھوں میں شکستگی کی لالی بکھری تھی، ثناء کا دل دکھ سے کٹ کر رہ گیا وہ اضطراری انداز میں اپنے لب کچلتی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”بھائی...... آپ۔“ اس کے لبوں سے سرسراتے ادھورے الفاظ خارج ہوئے، عبدالاحد نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے واش روم کا رخ کیا۔

”آپ فریش ہو کر آئیں، میں آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں۔“ وہ لہجے میں بشاشت سموتے ہوئے بولی، کمرے میں اک حزن کرلا رہا تھا، ثناء تڑپ کر اس کے پاس آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے تسلی دینے کی سعی کی۔

”پلیز بھائی، آپ کے ساتھ میں بھی چکن پائے کھا لوں گی۔“ عبدالصمد بھائی کل شہر کی مشہور بیکری سے آفس سے آتے ہوئے چکن پائے لائے تھے، جو کچھ بچ گئے تھے، ثناء اسے کچھ نہ کچھ کھلانا چاہتی تھی ورنہ وہ تو جیسے بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھا۔

”اوکے۔“ عبدالاحد کو اس کی بے لوث محبت کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔

”میں صرف پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ وہ جوش مسرت سے چٹکی بجاتی ہوئی چلی گئی وہ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کھانے اور چکن پائے سے لدی ٹرے تھی، زوبیہ نے اسے کبھی گھر کے اک فرد کی حیثیت نہ دی تھی اسی لئے وہ بھابھی اور صالحہ کے اصرار کے باوجود بھی نہ گئی تھی وہ زوبیہ کی نظروں میں محض اک ملازمہ تھی اور وہ اسے اکثر باور بھی کروا دیتی تھی، ثناء کو اپنی انسلٹ کروانے کا کوئی شوق نہ تھا اسی لئے اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا، اسے اپنی عزت نفس بے حد عزیز تھی، عبدالاحد لوازمات سے سجی ٹرے دیکھ کر چپ رہا مگر اس نے صرف چکن پائے کھانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”بھائی اس سے پیٹ نہیں بھرے گا، پلیز چند نوالے بھی لے لیں۔“ ثناء نے اسے چکن قورمہ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے نان کے ساتھ دیا تو اسے چارو ناچار کھانا کھانا پڑا۔

وہ جب سے لاہور سے آیا تھا مریم سے کنٹیکٹ نہ کر پایا تھا، بلکہ وہ خود نہ کر رہا تھا کہ اسے بخوبی ادراک تھا کہ مریم چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا کرے گی اور اس کے پاس اسے دینے کے لئے کوئی مناسب جواب نہ تھا، وہ بزدل یا کم ہمت نہ تھا وہ مریم کو اس گھر میں نہایت عزت و احترام سے لانا چاہتا تھا، وہ ابھی تک ناکام تھا اور مریم کا سامنا کرنے سے گریزاں بھی، اسے علم تھا کہ مریم از خود اس سے کبھی رابطہ نہ کرے گی، اس کو اپنی ماں کی عزت اور معاشرتی اقدار بے حد عزیز تھی۔

”شکر ہے، سو سویٹس آف یو بھیا۔“ ثناء نے اطمینان بھری سانس بوجھل فضا کے سپرد کی تھی، وہ اکثر ان دونوں بھائیوں کو آفس سے لوٹنے کے بعد رات گئے چائے بنا کر دیتی تھی تو وہ دونوں بھائی اسے ”سو سویٹ آف یو سسٹر“

کہتے تھے، ثناء نے ان سے کچھ ٹوٹی پھوٹی انگلش سیکھ لی تھی۔

''ہا...... ہا۔'' ثناء کے ''سویٹس'' کہنے پر عبدالاحد کے حلق سے فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''سسٹر، ابھی تمہیں لینگویج کلاس لینی پڑے گی۔'' عبدالاحد نے بشاشت سے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگاتے ہوئے مذاق کیا، ثناء نے اسے بہت دنوں بعد یوں بے فکری سے ہنستے دیکھا تھا، اس نے بے ساختہ اس کے لئے دائمی خوشیوں کی ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالیں۔

☆☆☆

اک لفظ ہے ''محبت'' اسے کر کے دیکھو
تم تڑپ نہ جاؤ
تو کہنا!
اک لفظ ہے مقدر اس سے لڑ کر دیکھو
تم ہار نہ جاؤ
تو کہنا!
اک لفظ ہے وفا، زمانے میں نہیں ملتی
تم ڈھونڈ پاؤ
تو کہنا!
اک لفظ ہے آنسو، دل میں چھپا کر دیکھو
تمہاری آنکھوں سے نہ نکلے
تو کہنا!
اک لفظ ہے جدائی، اسے سہہ کر تو دیکھو
تم ٹوٹ کے بکھر نہ جاؤ
تو کہنا!

سورج آسمان کے تا حد نگاہ پھیلے تھال پر تنہا اپنی کرنیں کائنات پر نچھاور کر رہا تھا، سنہری دھوپ جسم و جان میں ملائمت و کیفیت آگیں سرور بکھیر رہی تھی، اماں پڑوس میں میلاد میں گئی تھیں، وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگی، آج اس کا دھیان بار بار عبدالاحد کی سمت بھٹک رہا تھا، وہ اپنے دھیان کی طنابیں تھامنے میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی، مگر دھیان تھا کہ کسی ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر اس کا دامن جھٹک دیا تھا، اس نے سالن کا مصالحہ بھونا اور اس میں شملہ مرچ اور آلو ڈال دیئے، مریم نے ہنڈیا کا ڈھکن اوپر دے کر چولہے کی آنچ دھیمی کر دی اور باہر دھوپ میں آن بیٹھی۔

دھیان و توجہ کا محور پھر عبدالاحد کی سمت مڑ گیا، اس نے موبائل کی کنٹیکٹ لسٹ سے عبدالاحد کا نمبر سرچ کر کے اوکے کر دیا، اس کا دل نجانے کیوں تیزی سے دھڑکنے لگا دل کی اتھل پتھل ہوئی دھڑکنوں کے اودھم نے اسے فوراً کال ڈس کنیکٹ کرنے پر مجبور کر دیا۔

عبدالاحد بے وفا نہ تھا یہ اسے پورا یقین تھا مگر وہ مجبور ہو سکتا ہے یہ اس کے گمان میں نہ تھا، وہ صرف دو بھائی تھے اور دونوں ہی والدین کے لاڈلے اور چہیتے تھے، عبدالاحد نے اسے اپنی بات منوا لینے کا پورا یقین دلایا تھا، پھر اب کیسی تاخیر تھی۔

''کہاں ہو تم عبدالاحد۔'' وہ دل و دماغ کی جنگ سے تھک کر اسے پکار بیٹھی جو خود اپنے گھر والوں سے خفا اپنے کمرے میں مقید تھا اور محض اس کی خاطر زوبیہ کی دعوت رد کر دی تھی، مریم کا دل رو رو کر عبدالاحد کو پکار رہا تھا، اسی اثناء میں کچھ جلنے کی بو آئی تھی تو وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی، وہ درد دل دباتی کچن کی جانب بھاگی۔

☆☆☆

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی اس پر اول اول وحشت و اداسی، پھر یاسیت و مایوسی اور اب غصہ و اشتعال حاوی ہو چکے تھے، وہ محبت کی اس بازی میں ہارنا نہ چاہتی تھی وہ ہر حد عبور کر لینا چاہتی تھی، اسے کسی قیمت پر بھی عبدالاحد کو نہ کھونا تھا، وہ اس کی زندگی تھا، وہ خون کی مانند اس کی رگ رگ میں رچ بس چکا تھا، اسے صالحہ خالہ پر بھی غصہ تھا جو اس سے ابھی تک اپنی بات نہ منوا سکی تھیں اور عبدالاحد ابھی بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا، اسے عبدالاحد کے نہ آنے کی وجہ کا اندازہ تھا۔

اور یہی بات اس کی اذیت و اشتعال کو بڑھانے کا موجب تھی، وہ اک دو ٹکے کی بیوہ ماں کی بیٹی کو اس کے مد مقابل لا رہا تھا، وہ جو اپنے والد کے کروڑوں کے بزنس کی تنہا وارث تھی۔

''مائی فٹ۔'' زوبیہ نے نفرت و حقارت سے پاؤں زمین پر پٹخا تھا اس کی ٹانگیں مسلسل پریڈ سے شل ہو چکی تھیں، وہ بیڈ پر آن بیٹھی اور سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا، اسی لمحے اس کے کمرے پر دستک ہوئی۔

''زوبیہ بیٹا! میری جان صرف اک بار میری بات سن لو۔'' غالباً وہ سب واپس جا رہے تھے، صالحہ جانے سے قبل اس کے کمرے میں چلی آئیں، بہر طور گھر میں حتمی فیصلہ و حکم صالحہ بیگم کا ہی چلتا تھا وہ ان سے لگاڑ لے کر اپنا نقصان نہ کرنا چاہتی تھی، اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور خود ان سے پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''زوبی خالہ کی جان! تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔'' وہ اس کی ناراضگی سے بناء کچھ کہے سب کچھ سمجھ گئیں، انہوں نے محبت سے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، زوبیہ بناوٹی انداز میں مصنوعی غصے سے ان کی گرفت میں مچلی ضرور لیکن ان سے الگ نہ ہوئی، وہ اسے خود منانے یہاں تک آئی تھیں یہ کم نہ تھا، وہ ابھی بھی اسی کی طرف مائل تھیں وہی ان کی اولین چوائس تھی نہ کہ مریم، اس کے اندر ڈھیروں سکون پھیل گیا مگر دل میں مریم نامی کانٹا بھی چبھ رہا تھا۔

''خالہ آپ کچھ بھی نہ کر سکیں۔'' زوبیہ نے اپنی چبھن و الجھن ان پر نکالی اس کا سارا زور انہی پر تو چلتا تھا۔

''نہیں زوبیہ! میں نے اسے یہاں لانے کی بہت کوشش کی تھی بیٹا۔'' وہ اس کے الزام پر بلبلا اٹھیں جس سے بدگمانی کی بو آ رہی تھی، انہوں نے یہاں آتے ہوئے عبدالاحد کو منانے کی بہت کوششیں کیں مگر اسے نہ ماننا تھا سو وہ نہ آیا، صالحہ کو زوبیہ کی ناراضگی و غصے کا خدشہ تھا اور ویسا ہی ہوا تھا، زوبیہ انہیں دیکھتے ہی غصے سے کمرے میں آ کر محبوس ہو گئی تھی، انہوں نے بھی اس کے غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا، وہ غصے کی بلا کی تیز تھی اور نہایت بدتمیز تھی، وہ غصے میں کسی کا لحاظ بھی نہ کرتی، اسی لئے وہ اب اس کے پاس آئی تھیں، گو زوبیہ کا غصہ ختم یا ٹھنڈا تو نہ ہوا تھا مگر کم ضرور ہو چکا تھا۔

''میں نے کچھ اور سوچا ہے بیٹا'' اب ہمیں ''کچھ'' کرنا ہی پڑے گا۔'' صالحہ نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے زوبیہ کو محبت سے دیکھا، زوبیہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی اسے اپنی خالہ کی ''صلاحیتوں'' پر پورا بھروسہ تھا مگر وہ اب کیا سوچ بیٹھی تھیں اسے یہی جاننے کی جستجو تھی۔

''وہ کیا؟'' اس سے رہا نہ گیا تو استفسار کرنے لگی، صالحہ اسے دھیرے دھیرے سے سب کچھ بتانے لگیں، اس پر ان کے چہرے پر پھیلی شاطرانہ مسکراہٹ ان کی اصل ذہنیت کا پتا دے رہی تھی، زوبیہ کے چہرے پر دھیرے دھیرے اطمینان پھیلنے لگا، عالیہ بھی ان کے درمیان آ گئیں اور انہیں اپنے ''مفید مشوروں''

سے نوازنے لگیں، وہ بھی ان کی ہم نوا تھیں۔

☆☆☆

وہ جونہی گلی میں داخل ہوئیں تو گلی کی نکڑ پر اونگھتے کتے نے انہیں گھورا جیسے وہ دو اجنبیوں کو وارننگ دے رہا ہو، وہ دونوں اسے نظر انداز کر کے چلتی رہیں، کتا زور سے بھونکا، زوبیہ صالحہ کے پیچھے دبک کر رک گئی، صالحہ بھی سہم چکی تھیں انہیں کتے کی خونخوار نگاہوں سے خوف آ رہا تھا، انہوں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی اور زوبیہ کو حوصلہ آمیز نظروں سے دیکھا، وہ ابھی تک ان کے پیچھے دبکی ہوئی تھی۔

''گوں گوں۔'' کتا دوبارہ زور سے بھونکا گویا انہیں گلی چھوڑنے کا حکم دے رہا ہو، زوبیہ کی چیخ نکل گئی، صالحہ نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا وہ یہاں آنے سے قبل بلند و بانگ دعوے کر کے آئی تھی اور خوب لمبی چوڑی پلاننگ کی تھی اور اب کتے سے ڈر کر اس کا دم نکلا جا رہا تھا، وہ ان کے پیچھے سے نکل کر سائیڈ پر ہو گئی، یقیناً یہ ان کی گھوری کا اثر تھا یا پھر اسے اپنے کیے بڑے بڑے دعوے یاد آ گئے تھے۔

وہ دونوں آہستگی سے کتے سے مناسب فاصلہ رکھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگیں، اب کتا نہ بھونکا تھا، نجانے اسے ان دونوں پر ترس آیا تھا یا اعتماد کہ وہ دونوں اجنبی ضرور ہیں مگر چور یا ڈاکو نہیں۔

زوبیہ نے مطلوبہ گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اک چور نگاہ کتے پر ڈالی جو چوکنا انداز میں دونوں کان اوپر اٹھائے زبان باہر نکالے انہیں گھور رہا تھا، زوبیہ نے بمشکل تھوک نگلا اور دروازے پر لگی زنجیر سے دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

''کون؟'' اندر سے تفتیشی انداز میں سوال ابھرا تو زوبیہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنا کیا حوالہ دے، اس نے گڑبڑا کر خالہ کو مدد طلب نگاہوں سے دیکھا جو دوپٹے کے پلو سے اپنا ماتھا صاف کر رہی تھیں، موسم گرم نہ تھا کہ ماتھے پر پسینہ آتا اور نہ ہی راستہ گرد آلود تھا کہ ان کا ماتھا گرد سے اٹ جاتا، شاید وہ بھی کتے سے ہراساں تھیں۔

''مریم ہے؟'' صالحہ نے گومگو کھڑی زوبیہ پر بیزاری نگاہ ڈالتے ہوئے جواباً پوچھا، اگلے پل دروازہ کھول دیا گیا تھا، سامنے درمیانی عمر کی سانولی مگر نہایت پرکشش عورت کھڑی تھی، جس کے چہرے پر زمانے و حالات کی سختی و تلخی پختہ ہو چکی تھی اور وجود پر اک بے کیف سا سکون تھا، اس کے تن پر سستا سا سوتی لباس اور لمبے بالوں کو سلیقے سے گوندھ رکھا تھا۔

''السلام علیکم!'' وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گئیں، دونوں نے انہیں سلام تک کرنا گوارا نہ کیا تو اماں نے ہی انہیں سلام کیا تھا مگر انہوں نے تو جواب دینا گوارا نہ کیا بلکہ انہوں نے دوبارہ اماں پر بھی نگاہ نہ ڈالی تھی ان کی نگاہیں گھر کا جائزہ لے رہی تھیں، گھر نسبتاً صاف ستھرے اور بہتر لوکیشن میں تھا مگر پرانی طرز تعمیر کا حامل تھا۔

بوسیدہ سا لکڑی کا دروازہ، چھوٹا سا صحن پھر برآمدہ اور برآمدے میں دو کمرے، دونوں کمرے کافی چھوٹے تھے اور صحن سے بھی اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا، گھر خستہ حال مگر صاف ستھرا تھا، صحن میں ہی واش روم اور کچن بھی تھے۔

''ہوں۔'' انہوں نے ہنکارا بھرتے ہوئے گھر کا جائزہ لینے کے بعد اماں کو دیکھا جو الجھی و استفہامیہ نگاہوں سے انہیں ہی گھور رہی تھیں۔

''مریم کہاں ہے؟'' صالحہ نے اماں سے پوچھا زوبیہ کو اس گھر سے گھن آ رہی تھی اور اس کا یہاں لمحہ بھر کو رکنے کو جی نہ چاہ رہا تھا، مگر اسے خالہ کا ساتھ بھی تو دینا تھا، سو اسے ناچار رکنا پڑ رہا تھا۔

''آپ کون ہیں؟'' اماں نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال داغ دیا، ان کا جہاندیدہ ذہن معاملے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا انہوں نے نرمی سے سنبھل کر محتاط لہجہ اپنایا، صالحہ کو ان کی یہ ہوشیاری اک آنکھ نہ بھائی تھی انہیں اماں پر شدید غصہ آیا مگر وہ ضبط کر گئیں۔

''ہمیں آپ سے نہیں مریم سے بات کرنی ہے۔'' صالحہ ضبط کے باوجود اونچے لہجے میں دھاڑ پڑیں، اماں کے ماتھے پر ناگواری کی کئی سلوٹیں ابھر آئیں، زوبیہ البتہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے کھڑی تھی اور بے نیازی سے اپنے ناخن کھرچ رہی تھی۔

''اماں آپ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ گھر کا دروازہ کھلا مت چھوڑا کریں۔'' اس سے قبل کہ اماں جواباً کچھ کہتیں، مریم خفگی سے بولتی اندر داخل ہوئی صالحہ اور زوبیہ نے بے ساختہ مڑ کر پیچھے دیکھا تو ان کی نظر لائٹ ریڈش کاٹن کے سادہ سوٹ اور سی گرین دوپٹے اوڑھے مریم پر پڑی، اس کا سنولا روپ ملائمت بھرا تھا، لمبے گھنے بال چوٹی کی صورت اس کی پشت پر تھے، بڑی بڑی سیاہ پرکشش آنکھیں، ستواں ناک، دراز قد، صراحی دار گردن اور خمدار ہونٹ جن پر ہلکی لالی بکھری تھی، وہ مجموعی طور پر بے حد پرکشش اور حسین تھی بلاشبہ وہ زوبیہ سے زیادہ دمک رہی تھی، زوبیہ قیمتی ڈریس اور جیولری اور اپنے حسن و نازکی کے سانچے میں ڈھلے وجود کے باوجود مریم کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔

''اوہ تو تم مریم ہو۔'' انہوں نے کن اکھیوں سے زوبیہ کا جائزہ اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد اسے مخاطب کیا، ان کے لہجے سے حقارت مقصود تھی مگر ان کی نگاہوں اور کسی بھی انداز سے ستائش بھی نہ جھلک رہی تھی۔

''عبدالاحد کی چوائس ہمیشہ لاجواب ہوتی ہے۔'' انہوں نے دل میں اسے سراہنے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' صالحہ کو یکایک تھکن کا احساس ہوا تو انہوں نے رعونت بھرے انداز میں یوں کہا جیسے وہ میزبان اور اماں و مریم مہمان ہوں، اماں کو مجبوراً حق میزبانی نبھانا پڑا اور وہ زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے انہیں کمرے میں لے آئیں، کمرے کی حالت بھی باقی گھر جیسی تھی لکڑی اور ٹائلز کی چھت، سامنے دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ تھا جس پر بچھی چادر ڈھل ڈھل کر اپنا ڈیزائن اور رنگ دونوں کھو چکی تھی بیڈ کی پائنتی کی طرف دو پرانی لکڑی کی کرسیاں اور ان کے آگے درمیانی سائز کی میز تھی، میز پر رکھا گلدان قدرے بہتر تھا۔

درمیان میں بچے فرش پر پلاسٹک شیٹ بچھا کر غالباً کارپٹ کا کام لیا گیا تھا۔

مریم ان کے لئے ڈرنک لینے چلی گئی، ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، عبدالاحد نے اسے بتائے بغیر اپنے گھر والوں کو ان کے ہاں بھیج کر سرپرائز دیا تھا اس نے صالحہ کی نگاہوں میں چھپی پسندیدگی بھانپ لی تھی۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میری ممی تمہیں دیکھ کر ریجکٹ کر دیں۔'' اس کی یادداشت سے ماضی کا لمحہ جھانکا تو مسکراہٹ خود بخود لبوں پر مچلنے لگی، دل کی منتشر دھڑکنیں خوشگوار نے کا روپ دھار چکی تھیں۔

''آپ بیٹھیں۔'' صالحہ اور زوبیہ کمرے کا

جائزہ لینے میں مصروف تھیں کہ اماں نے انہیں بیٹھنے کا کہا وہ مریم کو بوتل گلاسوں میں انڈیلتا دیکھ چکی تھیں انہیں مناسب نہ لگا کہ جب مریم اندر آئے تو وہ انہیں کھڑا پائے، اس کا نازک دل کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاتا، اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر رب کے حضور تڑپ کر اپنی خوشیوں کی دعائیں مانگی تھیں، وہ ماں تھیں ان کی نگاہیں بیٹی کے انگ انگ سے چھلکتی خوشی بھانپ چکی تھیں مگر نجانے وہ خود کیوں چاہ کر بھی خوش نہ ہو پا رہی تھیں، کچھ تھا جو انہیں اندر ہی اندر ہولا رہا تھا لیکن کیا؟ ان کا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔

صالحہ اور زوبیہ دونوں اک نزاکت سے چیئرز پر یوں بیٹھیں جیسے ان چیئرز پر بیٹھ کر انہوں نے اماں کی سات پشتوں پر کوئی احسان کیا ہو، اماں کے اندر احساس کم مائیگی شدت سے ابھرا تھا، اسی لمحہ مریم بھی ٹرے لئے آ گئی، اس نے صالحہ کو ڈرنک سرو کی تو انہوں نے نزاکت سے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا غالباً انہیں پیاس ستا رہی تھی، زوبیہ نے قدرے تحیر سے انہیں دیکھا اور پھر اس نے بھی گلاس اٹھا لیا، جو مریم اس کے سامنے لئے کھڑی تھی، اس نے گلاس ہاتھ میں پکڑ کر دو تین بار گولائی میں گھمایا، گلاس عام سستے کراکری سیٹ کا تھا۔

''مریم! ہمارے گھر میں تو نوکر بھی ایسے گلاسز میں بوتل یا پانی نہیں پیتے جن گلاسز میں تم لوگ مہمانوں کو ڈرنکس سرو کرتے ہو۔'' زوبیہ نے پرغرور لہجے میں نزاکت سے گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے گویا پینے سے انکار کر دیا تھا، مریم اور ماں حق دق رہ گئیں، مریم احساس توہین سے سرخ پڑ گئی، اس کی سانولی رنگت سرخی گھلنے سے مزید پرکشش ہو گئی تھی صالحہ نے بھی آدھا گلاس پی کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا، نجانے انہیں اتنی یہ طلب تھی یا زوبیہ کی بات کا اثر تھا، اماں کی پریشانی بڑھ گئی تھی، انہوں نے تفکر سے مریم کو دیکھا جو ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔

''آپ وہ بات کریں جو آپ کو یہاں تک لائی ہے۔'' بالآخر اماں کا ضبط کھو گیا، انہوں نے قدرے سخت لہجہ اپنایا تو زوبیہ نفرت و حقارت سے بل کھا کر رہ گئی۔

''آپ کی لاڈلی جو خواب دیکھ رہی ہے نا، اسے کہیں کہ یہ اپنے خواب آنکھوں سے نوچ کر پھینک دے۔'' زوبیہ نے آنچ دیتے لہجے میں مریم کو سلگتی نظروں سے گھورا جیسے اسے جلا کر بھسم کر دے گی، مریم بت کی مانند ساکت تھی، اسے لگا جیسے سامنے موجود خواتین ہی انسان ہیں اور وہ حقیر کیڑا، اس نے اپنی حیثیت ان کی نظروں سے بھانپ لی تھی۔

''زوبیہ تم خاموش رہو، میں بات کرتی ہوں۔'' صالحہ نے درشتی و سختی سے اسے ڈانٹا، وہ بنا بنایا کھیل بگاڑنے پر تل گئی تھی وہ حسد کی آگ میں اندھی ہو کر کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی، صالحہ کی خواہش تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، زوبیہ نے غصے سے لب بھینچ لئے مگر مریم کو گھورنے سے باز نہ آئی۔

''دیکھیں ہم آپ سے لڑنے جھگڑنے نہیں آئے ہیں، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مریم عبدالاحد کا پیچھا چھوڑ دے۔'' صالحہ نے مصلحتاً نرم رویہ اختیار کیا، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس معاملے کی بھنک عبدالاحد کے کانوں تک پہنچے۔

مریم کی خوش گمانیاں دم توڑ گئیں، اس کی آنکھوں میں سجے خواب اک چھناکے سے ٹوٹ گئے، وہ بے دم سی ہو کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی، اس کی دگرگوں حالت نے زوبیہ کو بہت لطف دیا تھا، اس کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بہن جی! آپ میری بیٹی کو کچھ کہنے کی بجائے اپنے بیٹے کنٹرول کریں، آپ کا کوئی حق نہیں ہے کہ آپ مریم کو کچھ کہیں، عبدالاحد نے اسے خواب دکھائے تھے یہ اس کے پیچھے نہیں گئی تھی۔'' اماں نے خوش اخلاقی کا چولا اتار کر تلخی کا اظہار کیا تو صالحہ لمحہ بھر کو چپکی رہ گئیں، ان کی بات سو فیصد درست تھی، انہیں ان دونوں ماں بیٹی کے رویئے سے فوراً محسوس ہو گیا تھا کہ وہ عزت نفس پر مر مٹنے والوں میں سے ہیں۔

''اچھا یہ تو چھوٹی کاکی ہے نا، اسے تو کسی بات کا پتہ ہی نہیں ہے۔'' زوبیہ نے ہنوز حقارت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے مریم کو نفرت سے گھورا اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ مریم کا من موہنا چہرہ نوچ لیتی، اس کے اسی سہانے روپ نے ہی تو عبدالاحد کو دیوانہ بنا رکھا تھا اور وہ زوبیہ کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا، صالحہ نے زوبیہ کا بازو دبا کر اس کا غصہ کم کرنا چاہا۔

''آپ اگر اپنی بیٹی کو قابو میں رکھتیں تو یہ یونیورسٹی میں لڑکوں کو قابو کرنے کی بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دیتی۔'' زوبیہ کی بات نے ان کی لمحہ بھر قبل کی سوچ کا اثر زائل کر دیا اور وہ ان کی عزت نفس پر وار کر گئیں ان دونوں کی روح بلبلا اٹھی، مریم اس الزام پر شرمندگی سے کٹی جا رہی تھی جبکہ اماں کا خون کھول اٹھا انہوں نے پوری جوانی بیوگی کی چادر عزت سے اوڑھے رکھی تھی اور آج یہ بڑھاپے میں ان کی تربیت پر وار کر رہی تھیں۔

''الحمدللہ، ہماری اتنی عزت ہے کہ اگر میں ابھی آواز دوں تو آپ سارا محلہ اکٹھا ہو جائے۔'' اماں نے غصے و سختی سے کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی سمت دیکھا گویا انہیں کہہ رہی ہوں۔

''بس بہت ہو گیا اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' صالحہ اور زوبیہ ہکا بکا رہ گئیں، وہ تو ان دونوں کو بے عزت کرنے آئیں تھیں مگر خود اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں، اماں نے ان کی ساری تدبیریں الٹ دیں ان کے پروقار انداز میں ایسا کچھ خاص ضرور تھا کہ صالحہ اور زوبیہ کی زبانیں تالو سے چپک کر رہ گئیں۔

''آپ اس خوش فہمی میں نہ رہیے گا کہ ہم اسے بہو بنائیں گے عبدالاحد بچہ ہے آج نہیں تو کل اس کے سر سے بھی عشق کا بھوت اتر جائے گا۔'' صالحہ اپنا بیگ سنبھالتی کھڑی ہو گئیں زوبیہ نے بھی ان کی تقلید کی، ان کی وارننگ نے اماں کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اگر میری مریم کا جوڑا عبدالاحد ہی ہے تو پھر اسے نہ آپ توڑ سکتی ہیں اور نہ ہی میں۔'' اماں نے متانت و سکون سے بیٹی کا دفاع کیا، صالحہ پھر لاجواب ہو گئیں جبکہ زوبیہ غصے سے کھول اٹھی اس نے پچھلے دنوں اک مووی دیکھی تھی جس میں یونہی لڑکے کی ماں جا کر بیٹے کی محبوبہ کا دماغ صاف کر کے آتی ہے مگر یہاں تو ان کا اپنا دماغ صاف کر دیا گیا تھا، لیکن وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی، وہ رعونت و غصے سے پیر پٹختی چلی گئی، صالحہ کا شاطر ذہن بھی یہاں مات کھا گیا تھا، وہ غصے سے ان دونوں کو گھورتی بھابھی کے پیچھے لپکیں۔

☆☆☆

وہ کب سے یونہی بیٹھی تھی نجانے کتنی ساعتیں گزریں، کتنے پل محض اسے چھو کر گئے اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائی، وہ کسی سنگی مجسمہ کا روپ دھارے بے حس بیٹھی تھی، اماں نے پہلے پہل تو اسے نہ ہلایا کہ وہ خود اپنے دکھ پر سنبھل جائے وہ اسے بہادر دیکھنا چاہتی تھیں، لیکن جب وہ کافی دیر تک نہ سنبھلی تو وہ رہ نہ

سکیں۔

''مریم بیٹا!'' اماں نے مشفق لہجے میں اسے پکارا اس کے ساکت بدن میں حرکت ہوئی، وہ پلٹ کر انہیں ٹکر ٹکر دیکھنے لگی، وہ محبت کے لٹنے کا غم مناتی یا عزت نفس پر وار کا، اس کا غم دوہرا تھا، اماں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس کے چہرے پر دکھ کی جگہ مسکراہٹ بکھیر دیتیں، حزن و ملال نے اس کے حسن کو پرکشش بنا دیا تھا، اس کے ہونٹوں کی لالی بار بار ضبط کی کوشش میں دانتوں تلے کچلنے سے بڑھ گئی تھی، پلکوں پر ٹکے آنسو ستاروں کی مانند چمکنے لگے تھے۔

''اماں! انہوں نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اماں کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا، وہ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں ہولے سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''اماں! میں یہ سب عبدالاحد کو بتاؤں گی۔'' مریم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹل ارادہ ظاہر کیا، اس کے چہرے پر سختی در آئی تھی، اماں نے ہمیشہ اسے نرم و بردبار دیکھا تھا وہ شدید غصے میں تھی۔

''مریم! تم غلط سوچ رہی ہو، وہ دونوں بہت چالاک اور ہوشیار ہیں اگر عبدالاحد نے ان سے کوئی باز پرس کی تو وہ دونوں صاف مکر جائیں گی اور تم جھوٹی بھی جاؤ گی۔'' اماں نے نرمی سے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنا چاہا تھا، مگر وہ آج نرم نہ پڑ رہی تھی، وہ ہمیشہ اماں کی ہر بات اور ہر نصیحت پر عمل کرتی تھی لیکن آج وہ دکھ و اذیت کی انتہا پر تھی، اسے اپنی عزت جان و محبت سے بھی بڑھ کر عزیز تھی، وہ عبدالاحد کو چھوڑ کر تنہا ساری عمر جی سکتی تھی مگر اپنی عزت پر کوئی حرف برداشت نہ کر سکتی تھی، آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔

''آپ نے ہمیشہ مجھے عزت و وقار کا درس دیا ہے، ہمیشہ عزت سے جینے کی نصیحت کی ہے مگر وہ مجھے ملی تو پھر بھی نہیں ہے۔'' اس نے درشتی سے اماں کے ہاتھ جھٹک دیئے اس کا بس چلتا تو ساری دنیا میں آگ لگا دیتی، اماں اپنی جگہ ساکت رہ گئیں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے انہیں ٹوکا تھا، ان کی بات رد کی تھی، وہ ایسی تو نہ تھی، وہ ان کی ہر بات مانتی تھی، وہ اس کا دکھ بخوبی سمجھ سکتی تھیں، مریم انہیں ساکت چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اماں نے ابھی اسے اس کے حال پہ چھوڑنا مناسب سمجھا، ان کے لبوں سے سرد سانس خارج ہوئی۔

☆☆☆

''زوبیہ تم سارا بنا بنایا کھیل بگاڑنے پر کیوں تلی ہوئی تھیں۔'' وہ دونوں جونہی گلی میں موجود کتے سے بچتی بچاتی سڑک کی نکڑ پر گاڑی میں آ کر بیٹھیں تو صالحہ نے سارا غصہ زوبیہ پر اتارا جس کا منہ ابھی بھی غصے سے پھولا ہوا تھا، وہ وہاں جو کہہ کر آئی تھی اگر اس کی بھنک عبدالاحد کے کانوں تک پہنچ گئی تو ان کا سارا پلان چوپٹ ہو جاتا، زوبیہ نے خفگی بھری نگاہ سے انہیں گھورا مگر خاموش رہی۔

''میں اتنا کچھ سوچ کر آئی تھی مگر تمہاری جلد بازی سے ساری گیم الٹ گئی اگر کل کو کچھ غلط ہو گیا تو میرے پاس روتی ہوئی نہ آنا اور نہ ہی مجھے قصور وار گردانتا، عبدالاحد میرے ہاتھوں سے پہلے ہی نکلتا جا رہا ہے وہ اب یہاں ٹرانسفر کروا رہا ہے تو تمہارے لئے نہیں صرف اور صرف مریم کے لئے۔'' صالحہ نے غصے سے مزید تپتے ہوئے اسے طویل جھاڑ پلا دی وہ ان کی بات سمجھنے کو تیار ہی نہ تھی اور اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا وہ عبدالاحد کے دوبارہ یہاں ٹرانسفر سے خائف تھیں بلکہ وہ تو خوش تھیں کہ عبدالاحد اسی بہانے مریم سے تو دور تھا اگر وہ دوبارہ اسی شہر میں آ گیا تو وہ یقیناً مریم سے ملے گا انہیں دل میں یہ اعتراف کر لینے میں کوئی عار نہ تھی کہ مریم اور اس کی والدہ نہایت سلجھی ہوئی تھیں اگر مریم کسی امیر گھرانے کی لڑکی ہوتی تو وہ زوبیہ کو بھی بہو بنانے کا نہ سوچتی۔

زوبیہ منہ پھٹ، بدلحاظ اور جھگڑالو طبیعت کی مالک تھی وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی انہیں بخوبی علم تھا کہ زوبیہ محض عبدالاحد کو پانے کے لئے ان کی سنتی ہے ورنہ تو وہ انہیں بھی گھاس نہ ڈالے۔

''خالہ! آئی ایم سوری، میں ناراض نہیں ہوں۔'' زوبیہ آخر انہی کی بھانجی تھی اور انہی کی ذات کا پرتو بھی، اس نے فوراً سے بیشتر معاملے کی نزاکت و سنگینی کو بھانپتے ہوئے خوش اخلاقی کا چولا پہنتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چٹا پٹ ان کے گال چوم لئے، ڈرائیور نے اس کی محبت کے مظاہرے کو مرر میں اچنبھے سے دیکھا، وہ عالیہ اور احمد کے ہاں برسوں سے ملازمت کرتا تھا، اسی لئے اسے زوبیہ کے مزاج سے بھی کافی واقفیت تھی اگر وہ صالحہ سے کسی بات پر معافی مانگ رہی تھی تو یقیناً بات کچھ خاص ہی تھی نہ چاہتے ہوئے اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''اچھا بس بس۔'' صالحہ نے بیزاری سے اسے پیچھے کیا، زوبیہ کو خوب تاؤ آیا مگر غصہ کا گھونٹ پی گئی، ابھی اسے صالحہ سے بگاڑنا نہ تھی، اس نے فوراً ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''اگر جو مریم نے عبدالاحد سے کچھ کہہ دیا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں عبدالاحد کو کیا جواب دوں گی، وہ مجھ سے پہلے ہی ناراض ہے۔'' صالحہ نے نرمی اختیار کی ان کا تفکر کم نہ ہو رہا تھا ڈرائیور کا دھیان انہی کی طرف تھا اور کس حد تک وہ بھی ساری صورتحال سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔

''میں اور آپ مل کر سب سنبھال لیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' زوبیہ نے بناوٹی مسکراہٹ سے انہیں مسکہ لگایا، حالانکہ اسے صالحہ کا تفکر و تشویش زہر لگ رہی تھی، صالحہ جواباً مسکرا بھی نہ سکیں اور خاموشی سے بنا کوئی جواب دیئے گاڑی سے باہر دیکھنے لگیں زوبیہ احساس توہین سے سلگ اٹھی، دفعتاً اس کی نگاہ ڈرائیور پر پڑی جو مرر میں اسے دیکھ رہا تھا، وہ غصے سے کھول اٹھی۔

''ڈرائیور گاڑی تیز چلاؤ۔'' وہ غصے سے اس پر دھاڑی گویا اسے کہا ہو کہ تم اپنی اوقات میں رہو، ڈرائیور سنبھل کر بیٹھ گیا، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، وہ محتاط ہو کر ڈرائیونگ کرنے لگا، گاڑی تیزی سے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

☆☆☆

جب پیار کی بات ادھوری ہو
جب بیچ میں تھوڑی دوری ہو
جب ملنا بہت ضروری ہو
پر ملنے میں مجبوری ہو
تم دل میں یاد جگا لینا
کچھ پیار کے دیپ جلا لینا
جب مجھ سے ملنے آ نہ سکو
اور یاد سے باہر جا نہ سکو
تم تھوڑا دل کو سمجھا لینا
بس!
یاد سے دل بہلا لینا

اس نے ایم بی اے کے بعد ماسٹرز محض بابا اور بھیا کے بزنس میں انٹرسٹ لینے کے اصرار سے چھٹکارا پانے کے لئے کیا تھا حالانکہ اس کا سمپل ماسٹرز کا بالکل ارادہ نہ تھا لیکن زندگی میں بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے جو ہماری سوچ کی حد سے پرے ہوتا ہے، بھیا اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کرنے کے بعد بزنس میں بابا کا ہاتھ بٹا رہے تھے جبکہ اسے بزنس سے کوئی انٹرسٹ نہ تھا وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کئی کمپنیز میں اپلائی کیا ہوا تھا اور بالآخر اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی، اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماسٹرز میں ایڈمیشن کے بعد اس کی زندگی کا دھارا بدل جائے گا، اسے مریم سے محبت نہیں عشق تھا، مما سے جب اس نے ذکر کیا تو وہ بدک گئی اور کسی قیمت پہ اس کی شادی اپنی بھانجی سے کرنے کا طے کیا، گھر والوں خصوصاً مما کے مسلسل انکار سے تنگ آ کر اسلام آباد سے لاہور آ گیا مگر حالات نہ بدلے ایک سال بعد اس نے دوبارہ اسلام آباد ٹرانسفر کروا لیا تھا وہ اسلام آباد آنے کے ایک ہفتے بعد اسے آفس کے ایک اہم کام کی وجہ سے دوبارہ لاہور جانا پڑا وہ مریم سے چاہ کر بھی رابطہ نہ کر پایا تھا، موبائل اس کا آف تھا، اس نے لاہور واپسی تک اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، دو دن میں تو اسے واپس آ جانا تھا، وہ اپنے کمرے میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔

”یس۔“ اس کے کمرے کے دروازے پر ناک ہوئی تو اس کی مصروف آواز ابھری، بھابھی اس کے لئے دودھ لائی تھیں، عارفہ بھابھی دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پلٹی تو وہ بیگ کی زپ بند کر رہا تھا، اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی، عارفہ الجھی الجھی سی تھی، عبدالاحد نے اسے سرتاپا دیکھا وہ جیسے کچھ بتانا چاہتی تھی۔

”بھابھی! سب خیریت ہے نا۔“ عبدالاحد نے دودھ کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا کر اس پر نگاہیں جماتے ہوئے نرمی سے استفسار کیا، وہ اسے دیکھ کر رہ گئی، عبدالاحد الجھ کر رہ گیا۔

”بھابھی! شاید آپ کوئی بات کرنا چاہتی ہیں مجھ سے۔“ عبدالاحد نے اس کی مشکل آسان کی وہ آہستگی سے چلتی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”عبدالاحد! تم اس روز دعوت میں نہیں گئے تھے، تو زوبیہ نے بہت ہنگامہ مچایا تھا، اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور ہماری واپسی تک باہر نہ نکلی پھر آنٹی اس کے کمرے میں گئیں تو عالیہ، آنٹی اور زوبیہ کافی دیر اندر بیٹھی رہیں۔“ عارفہ نے گول مول انداز میں اشارتاً اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ اسے اپنی کوئی رائے نہ دینا چاہتی تھی گھر میں آنٹی کا سکہ چلتا تھا اور وہ کوئی رائے دے کر ان کی مخالفت مول نہ لینا چاہتی تھی، وہ اس سے کافی روز سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی مگر اسے موقع نہ مل رہا تھا۔

”پھر بھابھی؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا وہ بات کا سرا تھامنا چاہ رہا تھا جو اسے نہ مل رہا تھا۔

”پھر یہ کہ وہ تمہیں زوبیہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی ہے، وہ تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہے۔“ عارفہ کو زوبیہ بالکل نہ پسند تھی، وہ بہت مغرور و خودسر تھی اور عارفہ سے بھی محض ضرورتاً بات کرتی تھی، دعوت والے دن ان تینوں کی طویل میٹنگ نے اس کے دل میں کھٹکا پیدا کر دیا تھا اور پھر ان تینوں کی اکٹھی واپسی اور زوبیہ کا انہیں گیٹ تک چھوڑنے کے لئے آنا، سبھی کچھ بہت مختلف تھا، اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا چونکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا، اس لئے وہ خاموش تھی، اسے عبدالاحد بھائیوں جیسا عزیز تھا وہ اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی، اس نے عبدالاحد کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

”پلیز بھابھی میں اک جیتا جاگتا انسان ہوں، کوئی بے جان شے یا کھلونا نہیں ہوں کہ وہ جسے صرف پانا چاہتی تھی کھونا نہیں۔“ وہ اس وقت مریم کے خوش کن تصور اور خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا وہ بدمزہ ہو کر بھابھی کو ٹوک گیا۔

”میرا کام تمہیں بتانا تھا، تم خود سمجھ دار ہو جو بہتر سمجھو وہ کرو۔“ عارفہ کو اس سے اس رویے کی امید نہ تھی وہ خفگی بھرے نرم لہجے میں کہتی گلاس اٹھا کر باہر جانے لگی۔

”بھابھی!“ وہ دروازے تک پہنچی تو عبدالاحد کی پکار نے اس کے قدم روک لئے، وہ پلٹی تو عبدالاحد اس کے مدمقابل تھا۔

”بھابھی! مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہے، بس مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں، آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہوں گی تو مجھے میری منزل بھی ضرور مل جائے گی۔“ اسے اپنے رویئے کی بدصورتی کا احساس شرمندہ کر گیا تو وہ ازالہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میری دعائیں ہمیشہ میرے بھائی کے ساتھ ہیں۔“ اس نے محبت سے کہتے ہوئے اس کے بال بکھیر دیئے اور ہنستے ہوئے چلی گئی، عبدالاحد کا ذہن سوچوں کا تانا بانا بننے لگا۔

☆☆☆

بہت افسردہ لگتے ہیں مجھے اب پیار کے قصے
گل و گلزار کی باتیں، لب و رخسار کے قصے
یہاں سب کے مقدر میں فقط زخم جدائی ہے
سبھی جھوٹے فسانے ہیں وصال یار کے قصے
بھلا عشق و محبت سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے
سنو تم کو سناتا ہوں میں، کاروبار کے قصے
میرے احباب کہتے ہیں یہی اک عیب ہے مجھ میں
سر دیوار لکھتا ہوں، پس دیوار کے قصے
میں اکثر اس لئے لوگوں سے جا کر خود نہیں ملتا
وہی بیکار کی باتیں، وہی بیکار کے قصے

اس نے صحن دھونے کے بعد وائپر لگا کر خشک کیا، پانی کا پائپ نل سے الگ کر کے سائیڈ پر سمیٹ دیا، پھر بندھا دوپٹہ کھول کر سر پہ سلیقہ سے جمایا اور کچن میں چلی آئی، بارہ بجنے والے تھے، اماں سوئی ہوئی تھیں اسے ان کے جاگنے سے قبل کھانا تیار کرنا تھا، اماں نے سونے سے قبل پالک کاٹ دی تھی اس نے پالک دھو کر ابلنے کے لئے چولہے پر رکھ دی اور پیاز، لہسن لے کر اماں کے قریب بیٹھ کر پیاز کاٹنے لگی۔

دفعتاً موبائل بپ نے اسے چونکایا تھا، اس نے ہاتھ صاف کر کے موبائل اٹھایا، سکرین پر عبدالاحد کالنگ جگمگا رہا تھا، اسے شدت سے اس کی فون کال کا انتظار تھا، مگر وہ تھا کہ فون ہی نہ کر رہا تھا حالانکہ اس نے ایک بار اسے فون بھی کیا تھا لیکن اس نے ریپلائی نہ کیا تھا۔

اس نے کال ڈراپ کر دی وہ اس پر اپنی خفگی ظاہر کرنا چاہتی تھی وہ اسے ستانا چاہتی تھی چند لمحے بعد پھر موبائل بجنے لگا، عبدالاحد اس کے کال ڈراپ کرنے پر پریشان ہو گیا تھا وہ اس سے سخت خفا تھی اور یہ اس کا حق بھی تھا۔

”ہیلو۔“ بالآخر اس نے کال ریسیو کر لی، وہ کٹھور نہ تھی، دل اس کی آواز سننے کا تمنائی تھا۔

”میں آ گیا ہوں مریم، لاہور سے واپس اسلام آباد مستقل۔“ اس نے چھوٹتے ہی بے قراری سے اسے آگاہ کیا، مریم کے لبوں پر زہر

خند مسکراہٹ بکھر گئی، وہ اسے اسی روز خود کال کرکے سب کچھ بتانا چاہتی تھی مگر اماں نے اسے بمشکل سمجھا بجھا کر منایا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ رابطہ عبدالاحد خود کرے تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ آیا وہ ابھی بھی مریم کا طلبگار ہے یا وہ ماں کی ضد سے ہار کر اپنی محبت سے دستبردار ہو چکا ہے، یہ دن مریم نے کس اذیت سے گزارے تھے یہ صرف وہی جانتی تھی۔

''اپنے گھر یا زوبیہ کے گھر۔'' مریم نے زہر خند لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''واٹ ڈو یو مین۔'' عبدالاحد بھونچکا رہ گیا، مریم کے سوال نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے، اسے مریم کی شدید خفگی کا اندازہ تھا، مگر وہ اسے یہ بات کیسے کہے گی یہ گمان نہ تھا، وہ بھیا اور بھابھی کی موجودگی میں اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا مما نہیں مانی تھیں، اس نے بھیا کو منا لیا تھا اور عارفہ بھابھی تو اسے بھائیوں جیسا عزیز رکھتی تھیں، اس کی خوشیوں میں خوش ہوتی تھیں وہ اسے اپنی طویل غیر حاضری پر معذرت کرکے خوشخبری سنانا چاہتا تھا، ایسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا پورا ہفتہ مریم سے بات نہ ہو سکی۔

''میں نے کوئی مشکل یا انہونی بات نہیں کی ہے عبدالاحد صاحب!'' مریم کا لہجہ بیگانگی بھرا تھا، عبدالاحد تڑپ کر رہ گیا، مریم کی اجنبیت و بیگانگی اس کا دل چیر رہی تھی۔

''مریم! تمہیں ہو کیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ میں نے کافی دنوں بعد تم سے رابطہ کیا ہے، اتنی شدید ناراضگی کیوں ہے؟'' مریم بہت نرم مزاج اور بردبار لڑکی تھی وہ کسی سے خفا نہیں ہو سکتی تھی اور عبدالاحد سے خفگی و ناراضگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، مریم کا غصہ تو عبدالاحد کی آواز سنتے ہی صابن کی جھاگ کی طرح ختم ہو چکا تھا وہ محض اسے جانچ رہی تھی۔

''عبدالاحد! کیا تم نے اپنی مما کو ہماری بے عزتی کے لئے ہمارے گھر بھیجا تھا۔'' مریم نے بالآخر وہ بات کہہ دی جس نے عبدالاحد کی ذات کے پرخچے اڑا دیئے۔

''واٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ یکسر انجان و لاعلم تھا، اس کے لہجے سے پریشانی و لاعلمی مترشح تھی، مریم کا اندازہ درست نکلا وہ ابھی تک لاعلم تھا، اس نے عبدالاحد کو ساری بات بتا دی۔

''اوہ نو مریم! میں نے بھیا اور بھابھی کو منا لیا ہے اور میں نے تمہیں یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا، مجھے اس سارے قصے کا بالکل علم نہیں ہے۔'' عبدالاحد نے ساری بات سن کر پریشانی سے اسے بتایا اسے بخوبی سمجھ آ گیا کہ عارفہ بھابھی نے اسے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی اس کا ذہن تیزی سے کڑیاں ملانے لگا۔

''عبدالاحد! مجھے اپنی انسلٹ کے بدلے محبت کی قربت قبول نہیں ہے۔'' مریم نے چالاکی و ہوشیاری سے اسے اپنے دام میں الجھا لیا وہ اسی کا تھا اور اسی کا دم بھرتا تھا، وہ صالحہ کو مات دینا چاہتی تھی وہ ان سے اپنی انسلٹ کا بدلہ لینا چاہتی تھی اور ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ عبدالاحد کو ان سے چھین لیتی، وہ والدین کی دعاؤں کے حصار میں رہنا چاہتی تھی لیکن صالحہ نے اس کے عزت نفس اور خودداری پر وار کرکے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔

''پلیز پلیز مریم تم جانتی ہو نا کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا، میں تو اول روز سے تم سے کورٹ میرج کے لئے بھی تیار تھا مگر یہ تمہاری ضد ہی تھی کہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے ہاں لاؤں۔'' وہ ملتجی ہو گیا، وہ اسے ہر صورت منانا

چاہتا تھا یہ حقیقت تھی کہ وہ اس سے کورٹ میرج تک کے لئے راضی تھا مگر یہ مریم کی ضد تھی کہ وہ کورٹ میرج نہیں ارینج میرج کرے گی، اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی مما کو مریم کے گھر کا ایڈریس بھی دیا تھا، مگر وہ تو راضی ہی نہ تھیں شاید انہیں دولت و وقار اولاد سے بڑھ کر عزیز تھا جبھی وہ اس کی ضد سے نہ ہاری تھیں اور خود مریم کی انسلٹ کرنے اس کے گھر پہنچ گئی تھیں، اسے مما سے یہ توقع ہرگز نہ تھی، وہ اس کی مریم سے شادی کے لئے بھلے تیار نہ ہوتیں مگر اس کی انسلٹ بھی نہ کرتیں، اسے مریم کی خودداری بہت عزیز تھی مما نے اسے اس کی اپنی نگاہوں میں گرا دیا تھا۔

''پلیز تم یہ ڈائیلاگ بازی بند کرو، جب تم نے کچھ کرنا ہی نہیں ہے تو مجھے کیوں محبت کی راہ پر چلانا چاہتے ہو تم اپنی مما کو نہیں چھوڑ سکتے اور میں تم دونوں کے درمیان ہرگز آنا پسند نہ کروں گی، بہتر ہے تم زوبیہ سے شادی کر لو۔'' مریم نے اسے متحرک و اشتعال دلانے کے لئے جذباتی ایکٹنگ کا سہارا لیا، عبدالاحد شاید انہیں کبھی نہ منا پاتا اور وہ عبدالاحد کے بغیر نہ جی پاتی، دو ماہ کے دوران اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے لئے کیا ہے، وہ اس کے بغیر ادھوری تھی اسے اپنی ادھوری ذات کی تکمیل چاہیے تھی اور وہ ہر قیمت پر عبدالاحد کو پانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

''مریم تم نے جہاں اتنے روز انتظار کیا مجھے صرف چند روز اور دے دو پلیز۔'' عبدالاحد نے اس کی منت کی اور وہ اتنی کٹھور نہ تھی کہ محبوب کے گڑگڑانے پر نہ تڑپتی اور اس کی تڑپ کا مزہ لیتی۔

''او کے مگر جو بھی کرنا، خوب سوچ سمجھ کر اور جلدی کرنا، پھر مجھے الزام نہ دینا۔'' مریم کا دل اپنی فتح پر خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا، اس کا پلان کامیاب رہا تھا، عبدالاحد اسی کا تھا، اس نے الوداعی کلمات کے بعد مطمئن ہو کر فون بند کر دیا اور کھانا کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

موسم نے یکایک اپنے تیور بدل ڈالے، آسمان پر سورج کی جگہ بادلوں نے تیزی سے چھین لی تھی، کچھ دیر قبل پھیلی سنہری روشنی کی جگہ ملگجے اجالے نے لے لی تھی۔

وہ آفس سے خلاف معمول جلدی گھر آ گیا، وہ کافی بجھا بجھا تھا، موسم کی خوشگواریت نے اس کے بوجھل پن کو زائل کر دیا، وہ لان میں بچھی چیئرز پر آن بیٹھا اور سر بیک سے ٹکا لیا، ہوا شرارت سے اسے چھو کر گزر گئی، آسمان پر پرندوں کے غول محو پرواز تھے وہ ہوا سے اٹکھیلیاں کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔

عارفہ نے اسے تنہا لان میں پایا تو وہیں آ گئی، عبدالاحد نے چوڑیوں کی کھنک پر چونک کر اسے دیکھا اور سیدھا ہو بیٹھا، عارفہ اس کے سامنے والی چیئرز پر ٹک گئی وہ اسے بہت اداس اور بجھا بجھا لگا۔

''عبدالاحد! تم اتنے اداس کیوں ہو؟'' عارفہ نے ٹٹولتی نظریں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے محبت سے استفسار کیا، وہ تو جیسے کسی ہمدرد کی تلاش میں تھا اس نے فوراً سارا قصہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''اوہ تو اس روز یہ پروگرام پلان کیا گیا تھا۔'' عارفہ کے منہ سے ساری بات سن کر بے ساختہ نکلا۔

''مما نے بالکل غلط کیا بھابھی، انہیں مریم کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' عبدالاحد کو مما کے رویئے نے سخت ہرٹ کیا تھا اسے سمجھ نہ آ رہی

تھی کہ وہ کیسے اس کی تلافی کرے اور مریم کے دل سے میل و خفگی نوچ ڈالے، ہوا کا شریر جھونکا آیا اور اس کے بال ماتھے پر بکھر گئے۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا وہ ٹھیک تھا، مجھے اپنی اولاد کی بھلائی سوچنے کا پورا حق ہے۔" اس سے قبل کہ عارفہ اس سے کچھ کہتی، صالحہ بول پڑیں، وہ دونوں بیک وقت چونک کر پلٹے صالحہ نجانے کب وہاں آئی تھیں انہیں اپنی باتوں میں مگن علم نہ ہو سکا، صالحہ کا لہجہ ٹھوس تھا ان کے چہرے پر شرمندگی و ملال کا شائبہ تک نہ تھا، وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھیں۔

"مما! مجھے زوبیہ سے شادی نہیں کرنی ہے، پلیز اسے کہیں میرا پیچھا چھوڑ دے۔" عبدالاحد نرمی سے چیخا وہ ان سے بدتمیزی نہ کرنا چاہتا تھا اس نے اپنا لہجہ قابو میں رکھنا چاہا، انہیں اپنے رویے پر رتی بھر شرمندگی نہ تھی۔

"عبدالاحد تمہیں مریم سے کیا ملے گا، نہ جہیز، نہ پراپرٹی اور نہ ہی بزنس، زوبیہ کی پراپرٹی سے ہمارے بزنس پر بھی کافی گہرا اثر پڑے گا، ہم سوسائٹی میں مزید موو کر سکیں گے، یہ دور خالی خولی محبت کا نہیں ہے بیٹا۔" صالحہ کے لہجے سے ہوس و لالچ کی واضح بو آ رہی تھی، ان کی مادیت پرستی کھل کر سامنے آ گئی تھی، عبدالاحد دکھ سے ساکت رہ گیا، وہ دولت جیسی فانی شے کو اولاد کی خوشیوں پر فوقیت دے رہی تھیں گویا انہیں زوبیہ سے زیادہ اس کی دولت میں انٹرسٹ تھا، زوبیہ اپنے ساتھ کروڑوں کی پراپرٹی اور بینک بیلنس لا رہی تھی۔

"مما اٹس مین کہ اگر زوبیہ بھی غریب ہوتی تو آپ کبھی اسے بہو نہ بناتیں۔" عبدالاحد نے ان کی بات کی گہرائی جانچتے ہوئے نپا تلا لہجہ اپنایا، اس کی نگاہوں میں ماں کا بنا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔

"شٹ اپ، عبدالاحد تم مریم کو بھول جاؤ، میں تمہاری شادی اس سے کسی صورت نہیں ہونے دوں گی۔" صالحہ نے غصے و تنفر سے اسے انگلی اٹھا کر وارننگ دی وہ اک دو ٹکے کی لڑکی کے لئے ماں سے الجھ رہا تھا، ان کا خون کھول اٹھا، وہ بے خبر تھیں کہ مریم اس کے جسم و جان میں خون کی مانند رچ بس چکی ہے وہ تو عبدالاحد میں مجسم سانس بستی ہے وہ کیسے اسے خود سے جدا کرتا۔

"ارے احمد انکل آپ۔" اسی پل عارفہ کی نظر خود سے چند قدم دور ساکت کھڑے احمد صاحب پر پڑی تو وہ چونک اٹھی، ان کے ساتھ عالیہ بھی تھیں، ان دونوں کے چہرے سے بخوبی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صالحہ کی تمام باتیں سن چکے ہیں، صالحہ کی ان کی سمت پشت تھی وہ تیزی سے جھٹکا کھا کر پلٹیں، احمد اور عالیہ کی ملامت کرتی نگاہوں نے انہیں لمحہ بھر کو شرمندہ کر دیا، اگلے پل وہ خود کو کمپوز کرتی چہرے پر مسکراہٹ سجائے بشاشت سے ان کی طرف بڑھیں۔

"ارے آؤ، آؤ عالیہ!" وہ محبت و بشاشت سے ان کے گلے جا لگیں، عالیہ میں گرمجوشی مفقود تھی وہ بہن کا مکروہ چہرہ دیکھ چکی تھی، صالحہ کے چہرے پر پڑی نقاب الٹی تو اسے اپنی ماں جائی سے گھن آنے لگی، کوئی بہن دولت کی چاہ میں بہن کو لوٹ سکتی ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، انہیں عبدالاحد کی مریم سے وابستگی کا علم تھا مگر صالحہ نے ہمیشہ انہیں جھوٹی تسلیاں دی تھیں، عالیہ نے عبدالاحد کا جائزہ لیا، وہ ماں سے خفا لگ رہا تھا اس کا انگ انگ ظاہر کر رہا تھا کہ اگر اس کی شادی زوبیہ سے ہو گئی تو نہ وہ خود خوش رہ سکے گا اور نہ ہی زوبیہ کو خوش رکھ سکے گا۔

بعض اوقات انسان اک فیصلے کو طویل مدت تک لٹکائے رکھتا ہے اور بعض اوقات اک

لمحے میں فیصلہ ہو جاتا ہے، وہ بھی اک فیصلہ کر چکی تھیں اور ایسا ہی فیصلہ احمد نے بھی فوراً کر لیا تھا عالیہ نے نرمی سے صالحہ کو الگ کیا وہ نفرت بھری نظروں سے بہن کو دیکھنے لگیں نجانے کیوں انہیں صالحہ کا اصل روپ پہلے نظر نہ آیا تھا، صد شکر کہ ابھی وقت ان کی مٹھی میں تھا ورنہ وہ ساری عمر پچھتاتی رہ جاتیں۔

"عالیہ وہ......" صالحہ گڑبڑا کر بوکھلاتے ہوئے کوئی وضاحت کرنے کو تھیں کہ احمد نے ہاتھ اٹھا کر انہیں سختی سے روک دیا، صالحہ کو بازی ہاتھوں سے جاتی محسوس ہوئی۔

"صالحہ کانوں سنی باتوں کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔" احمد کے کٹیلے لہجے نے صالحہ کو سخت نادم کر دیا اور وہ نظریں چرا کر رہ گئیں ان کی تقدیر کے ستارے گردش میں تھے۔

"چلو عالیہ!" انہوں نے پلٹ کر بیوی کو سختی سے حکم دیا تو وہ بھی شوہر کے ہم قدم ہو گئیں، وہ بہن سے سخت خفا تھیں اگر اعتماد کرچی کرچی ہو جائے تو دل یونہی خفا ہو جاتا ہے۔

"عالیہ...... احمد پلیز میری۔" وہ گھبرا کر ان کے راستے میں حائل ہو گئیں۔

"صالحہ کچھ کہنے کو نہیں بچا ہے۔" احمد نے نرمی سے انہیں لتاڑا، وہ فطرتاً نرم دل تھے ان سے صالحہ کی ہار دیکھی نہ گئی، وہ دونوں چلے گئے، صالحہ ہارے ہوئے جواری کی طرح پیچھے بیٹھتی چلی گئیں، ان کی ساکت نگاہیں عالیہ اور احمد کے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے قدموں پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

کمرے میں دو نفوس کی موجودگی کے باوجود گہری خاموشی تھی، دونوں ہی اک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے تھے، بوجھل فضا نے اک سوگواریت طاری کر دی تھی جو دل و دماغ کو قطرہ قطرہ ڈس رہی تھی، باہر رات کی تاریکی پھیلی تھی، ساری کائنات نیند کی نرم میٹھی آغوش میں آرام کر رہی تھی مگر ان دونوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، شاید اپنوں پر اعتماد ٹوٹے تو دل دنیا کی ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے، دل میں شدت سے بغاوت ابھرنے لگتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کو آگ لگا دیں۔

عالیہ نے کمرے کی کھڑکی کھولی تا کہ کمرے میں گھٹن ختم ہو لیکن جب دلوں میں گھٹن پیدا ہو جائے تو بیرونی موسم کی خوشگواریت بھی گھٹن کا اثر ختم نہیں کر پاتی ہے، البتہ گھٹن کچھ گھٹ ضرور جاتی ہے لان میں لگے گلاب اور چنبیلی کے پھولوں سے اٹھتی بھینی مسحور کن خوشبو نے کمرے کی فضا میں گھٹن ذرا کم ضرور کر دی تھی۔

"عالیہ!" احمد نے پیچھے سے آ کر ان کے کندھوں پر نرمی سے دباؤ ڈالا تو وہ چونک کر پلٹیں، ان کی آنکھیں ضبط شدت سے سرخ ہوئی جا رہی تھیں، انہوں نے احمد سے نظریں چرا لیں، احمد نے نرمی سے ان کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر ان کا چہرہ اونچا کیا، ان کی نگاہوں میں نمی سرخ ڈوروں کی صورت کھلی تھی۔

"عالیہ!" احمد نے نرمی سے ان کی آنکھیں صاف کیں اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بیڈ تک لے آئے، وہ ان کے مزاج کے سب موسموں کے ساتھی تھے، ان کے مزاج کا ہر رنگ پہچانتے تھے تو اب ان کی دگرگوں حالت سے کیسے بے خبر رہتے۔

"تم نے بھی یقیناً وہی فیصلہ کر لیا ہو گا جو میں کر چکا ہوں۔" احمد نے بات گھمانے پھرانے کی بجائے ڈائریکٹ شروع کی، عالیہ کا سر جھک گیا، انہوں نے بہن کی باتوں میں آ کر زوبیہ اور

عبد الاحد کے رشتے کے لئے کتنے جتنوں سے منایا تھا یہ انہی کی خبر تھی، احمد کو عبد الاحد کے بزنس چھوڑ کر جاب کرنے کی ضد بے حد ناگوار لگی تھی اور انہیں اس رشتے پر یہی اعتراض تھا کہ وہ اپنا زبردست بزنس چھوڑ کر محض چند ہزار کی نوکری کر رہا ہے، عالیہ نے انہیں یہ کہہ کر سمجھایا بجھایا تھا کہ آخر سب کچھ عبد الاحد اور عبد الصمد کا ہے، دونوں برابر کے حصہ دار ہیں، وہ بے خبر تھیں کہ صالحہ بھانجی کی محبت میں نہیں دولت کی ہوس میں ان سے رشتہ کا اصرار کر رہی ہیں اگر انہیں خبر ہوتی تو وہ یوں شوہر کے سامنے شرمندہ ہونے کی بجائے بہن کو فوراً ٹکا سا جواب دے دیتیں، وہ احمد سے شرمندہ تھیں اور ان کا سر شرمندگی سے مزید جھکا جا رہا تھا۔

وہ ہنوز چپ تھیں بعض اوقات خاموشی اقرار کا ذریعہ ہوتی ہے ان کی خاموشی میں اقرار تھا انہیں بیٹی کی خوشیاں عزیز تھیں انہیں زوبیہ کی بھی فکر تھی وہ اسے کیسے سمجھاتیں، احمد اب اس رشتے پر کسی طور راضی نہ تھے، عالیہ بھی ان سے مزید اصرار نہ کرنا چاہتی تھیں، اب اصل مسئلہ صرف زوبیہ کا تھا۔

''احمد مجھے زوبیہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔'' عالیہ کے لہجے سے تشویش مترشح تھی اور نظروں میں مستقبل کے اندیشے کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

''تم اس کی فکر نہ کرو، میں خود اس سے بات کروں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات ضرور سمجھے گی۔'' عالیہ انہیں زوبیہ کی ہٹ دھرمی اور خودسری کے متعلق بتانا چاہتی تھی لیکن احمد کے لہجے کے یقین و مان نے ان کی زبان گنگ کر دی وہ دل میں زوبیہ کے مان جانے کی دعائیں کرتے ہوئے سونے کے لئے لیٹ گئیں، احمد بھی لائٹ آف کر کے بیڈ کے دوسرے کنارے پر ٹک گئے۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو گیٹ خلاف معمول کھلا تھا، وہ حیران ہوتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو خلاف معمول پاپا لان میں موجود تھے، جبکہ مما کچن میں مصروف تھیں، سبھی کچھ الٹ ہو رہا تھا، یہ وقت پپا کے آفس کا تھا وہ صبح کے گئے رات کو گھر لوٹتے تھے جبکہ مما اکثر اپنے بیڈ روم میں ہوتی تھیں۔

''السلام علیکم پپا!'' وہ ان کی قریب آ گئی، وہ لائٹ لیمن کلر کی گول گھیرے والی پرنٹڈ قمیص، کالے چوڑی دار پاجامے اور کالے دوپٹے میں بے حد دلکش لگ رہی تھی، سورج کی اجلی کرنوں نے اس کے تن کے سنہرے پن میں مزید اضافہ کر دیا تھا، صراحی دار گردن پر پسینے کی چند بوندیں تھیں جن سے بالوں کی چند لٹیں چپکی ہوئی تھیں۔

''وعلیکم السلام! ہماری بیٹی تھک گئی ہے۔'' موسم پر حدت نہ تھا، اوائل مارچ کے دن تھے اور سورج کی تمازت بھی قابل برداشت تھی بلکہ بے حد بھلی لگتی تھی، انہوں نے زوبیہ کی گیلی گردن دیکھ کر پدرانہ شفقت کا بھرپور اظہار کیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے اس کو اپنے قریب چیئر پر بٹھا لیا۔

''پپا میں آج بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے کوفت و بیزاری کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے منہ پھلا لیا، گویا وہ پوری دنیا سے روٹھی ہو۔

''پھر تو میرے بچے کو بھوک بھی خوب لگی ہو گی۔'' احمد کو اس پر خوب پیار آیا، صالحہ نے اس کی پسندیدہ ڈشز قیمہ مٹر اور چکن بریانی بنوائی تھی، آج احمد کا آفس جانے کا قطعاً موڈ نہ تھا انہوں نے اپنے مینجر کو فون کر کے چھٹی کی اطلاع دے دی تھی، ضیاء (منیجر) قابل اعتماد محنتی نوجوان تھا، اس نے سال بھر قبل ان کا آفس جوائن کیا تھا اس نے اپنی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر پچھلے دو نہایت اہم پروجیکٹس قلیل مدت میں مکمل کر کے کمپنی کا معیار بہتر سے بہترین بنایا تھا اسی لئے وہ احمد کا خاصا چہیتا بن گیا تھا۔

''واؤ، زبردست خوشبو آ رہی ہے، آج کیا پکا ہے پپا۔'' کچن سے آتی اشتہا انگیز خوشبو سونگھتے ہوئے زوبیہ نے رازداری سے استفسار کیا۔

''آپ دونوں آ جائیں کھانا لگ گیا ہے۔'' اس سے قبل کہ احمد صاحب کوئی جواب دیتے، صالحہ نے آ کر اطلاع دی، وہ دونوں ہنستے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے، کھانا خاموشی سے کھایا گیا، زوبیہ نے خاموشی محسوس کی مگر نظر انداز کر گئی اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں کپڑے چینج کرنے چلی گئی۔

''یس۔'' دروازے پر ناک ہوئی تو زوبیہ کی آواز ابھری، احمد صاحب ملازمہ کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔

''یہاں رکھ دو اور تم جاؤ۔'' احمد نے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازمہ کو تاکید کی، وہ چائے رکھ کر چلی گئی، زوبیہ انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران تھی۔

''بابا آئیں بیٹھیں۔'' زوبیہ مؤدب ہو گئی، وہ لاکھ ضدی و خودسر سہی مگر اسے باپ سے بے پناہ محبت تھی وہ ان کا بہت احترام کرتی تھی اور ان کی کوئی بات نہ ٹالتی تھی، وہ ماں سے بھی کبھار بدتمیزی کر جاتی تھی لیکن ان سے کبھی بدتمیزی نہ کی تھی، اسی لئے صالحہ نے انہیں زوبیہ کو ساری صورتحال سمجھانے کی ذمہ داری سونپی تھی وہ صالحہ کی کوئی نہ سنتی اور غصے سے ہتھے سے اکھڑ جاتی، وہ مزید ضد پر اتر آئی تو احمد کے لئے بھی بات سنبھالنا مشکل ہو جاتا، اسی لئے صالحہ نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ زوبیہ سے بات کریں، انہوں نے بھی صالحہ کا مشورہ معقول جانا تھا۔

''بیٹا! والدین ہمیشہ اولاد کا بھلا چاہتے ہیں، انہیں اولاد کی خوشیاں بے حد عزیز ہوتی ہیں، اگر اولاد اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگائے یا انہیں تباہی ملے وہ برداشت نہیں کر سکتے، اولاد کا غم والدین کو اندر سے ڈھے دیتا ہے۔'' احمد نے جذباتی انداز میں تمہید باندھی تھی وہ الجھ کر ان کی باتیں سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے خوبصورت چہرے پر الجھن کے سائے تیرنے لگے تھے۔

''پاپا!'' زوبیہ ان کے بازو سے لپٹ گئی ان کے الفاظ میں کچھ تو ایسا تھا کہ زوبیہ موم کی طرح پگھلنے لگی تھی، احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی مگر وہ کتنے بے بس تھے کہ اسے اس کی زندگی کی سب سے قیمتی خوشی نہ دے پا رہے تھے، وہ بے بسی سے آنسو ضبط کرتے ہوئے اپنے لب کچلنے لگے، انہوں نے زوبیہ کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا، زوبیہ نے چونک کر سر اٹھایا تو ان کی نمی بھری آنکھیں دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

''پاپا!'' وہ بے چینی سے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مسلنے لگی، ان کی آنکھوں میں چھپی اذیت سے اسے بے کل کر دیا تھا، وہ اسے کیا بتانا چاہتے تھے زوبیہ نے ناسمجھی سے ان کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔

''زوبیہ! میں تمہیں جو بتانے لگا ہوں، بیٹا اسے دھیان سے سننا اور ہماری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' احمد نے گلوگیر لہجے میں دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔

''پاپا! آپ مجھے بتائیں تو سہی، آخر کیا

بات ہے۔'' وہ بے حد نروس ہوگئی تھی، گھبراہٹ اس کے لہجے و چہرے پر واضح درج تھی، احمد نے تاسف و دکھ سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبالیا، زوبیہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی، احمد صاحب دھیرے دھیرے سے ساری بات بتانے لگے، زوبیہ کے چہرے پہ آہستہ آہستہ بے یقینی و دکھ جگہ بنانے لگا، احمد نے بات کے اختتام پر بے دم ہوکر یوں آنکھیں موندیں جیسے میلوں کی مسافت طے کرکے آئے ہوں، زوبیہ اندر سے ڈھے گئی، وہ بے دم ہوکر سوچوں میں گھری تھی، احمد اسے سوچوں میں گھرا چھوڑ کر چلے گئے تاکہ وہ خود بہتر فیصلہ کرے، ان کا دل بیٹی کی خوشیوں کے لئے دعا گو تھا۔

☆☆☆

''سارہ بیٹا! تم ضیاء سے پوچھو وہ کب گھر پہنچے گا۔'' راحت نے گھڑی پر نظر پڑتے ہی تفکر سے بیٹی کی تاکید کی، ضیاء پر چند روز سے کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا وہ رات کے نو ساڑھے نو بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا لیکن اب تو گیارہ ہونے والے تھے، ان دونوں نے ضیاء کے انتظار میں ابھی تک کھانا بھی نہ کھایا تھا، سارہ کو بھوک ستا رہی تھی وہ رات کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے، گھر میں صرف تین نفوس تھے ضیاء آفس اور سارہ کالج چلی جاتی تو راحت بیگم سارہ کے آنے تک گھر میں اکیلی ہوتی تھیں، ان کے والد کا چار برس قبل انتقال ہوگیا تھا، ضیاء نے گھر کی ذمہ داری بخوبی سنبھال لی تھی، وہ بہت سمجھ دار، ذمہ دار اور سلجھا ہوا تھا، اس کے تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے اک بہترین کمپنی میں شاندار اکیڈمک ریکارڈ کی بدولت بہتر جاب مل گئی تھی، ضیاء نے اپنی ذہانت و قابلیت کا سکہ منواتے ہوئے جلد کافی ترقی کی تھی۔

''سارہ بھائی آگیا ہے بیٹا دروازہ کھول دو۔'' وہ ضیاء کو فون کرنے ہی والی تھی کہ ڈور بیل ہوئی، راحت اسے دروازہ کھولنے کا حکم دے کر کچن میں چلی آئیں تاکہ کھانا گرم کرکے لگا سکیں۔

''السلام علیکم! امی کہاں ہیں؟'' ضیاء نے صحن میں بائیک کھڑی کرتے ہوئے باآواز بلند سلام کرنے کے بعد راحت بیگم کو پکارا، اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا، براؤن آنکھوں میں ستاروں سی چمک تھی، کشادہ پیشانی پر سکون کی مہر ثبت تھی جبکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھیں، راحت بیگم بیٹے کی بلائیں لیتی اس کی طرف بڑھیں تو وہ ان سے لپٹ گیا۔

''امی میری پروموشن ہوئی ہے اور مجھے کمپنی کی طرف سے گاڑی ملی ہے۔'' ضیاء کی خوشی دیدنی تھیں، راحت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو پھیل گئے سارہ خوشی سے بے قابو ہوکر بھائی سے لپٹ گئی۔

''امی! یہ سب آپ کی دعائیں ہیں۔'' ضیاء نے سعادت مندی سے ان کے ہاتھ تھام لئے، راحت بیٹے کی ترقی کی بہت دعائیں مانگتی تھیں جو رنگ لے آئی تھیں۔

''بھیا! میری بھی۔'' سارہ اس سے الگ ہوکر ٹھنکی، وہ دھیرے سے مسکرا دیا اسے بہن بے حد عزیز تھی، اس نے لاڈ سے اپنا ماتھا سارہ کے ماتھے سے رگڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا، راحت کا انگ انگ رب تعالیٰ کا شکر گزار تھا۔

''ضیاء بیٹا تم چینج کرو، پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' گیارہ ہونے والے تھے اور وہ دونوں اس کی خاطر بھوکی تھیں، وہ مزید دیر کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، جبکہ سارہ ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

☆☆☆

وہ سلسلے، وہ شوق، وہ نسبت نہیں رہی
اب زندگی میں ہجر کی وحشت نہیں رہی
ٹوٹا ہے جب سے دل میں اس کی مسیحائی کا طلسم
دل کو کسی اور کی مسیحائی کی حاجت نہیں رہی
پھر یوں ہوا کہ کوئی شناسا نہیں رہا......
پھر یوں ہوا کہ درد میں شدت نہیں رہی
پھر یوں ہوا کہ ہوگیا مصروف وہ بہت
اور ہم کو بھی یاد کرنے کی فرصت نہیں رہی
اب کیا کسی کو چاہیں کہ ہم کو تو ان دنوں
خود اپنے آپ سے بھی محبت نہیں رہی

وہ لان میں اترتی سیڑھیوں پر دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپائے کافی دیر سے بیٹھی تھی، وہ سیاہ اور فیروزی کنٹراسٹ کے سٹائلش سوٹ میں شام کی دھیرے دھیرے پھیلتی تاریکی کا حصہ لگ رہی تھی، بالوں کی لٹیں ہوا کے زور سے بار بار اسے ذات کی یاسیت و اداسی سے باہر نکالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، اسے مما اور پاپا نے فیصلہ کرنے کا پورا اختیار دیا تھا اور وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی یا شاید حقیقت کی تلخی سے نظر انداز کیے فیصلہ کرنا ہی نہ چاہتی تھی، جو شخص جسم و جان میں جزو ناگزیر کا درجہ پا جائے اسی سے دائمی جدائی کا فیصلہ انسان کو یونہی کڑے عذاب سے دوچار کر دیتا ہے، وہ بھی کڑے عذاب سے گزر رہی تھی۔

''زوبیہ بی بی!'' مالی نے آکر اسے سوچوں سے نکالا، زوبیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا تو بالوں کی بکھری لٹیں، اس کے دلکش چہرے پر پھیل گئیں، زوبیہ نے بال سمیٹے بغیر مالی کو سوالیہ نظروں سے گھورا، اسے مالی کی آمد ناگوار گزری تھی، اس کی آنکھوں میں واضح خفگی تھی۔

''بی بی جی! کوئی رابعہ بی بی آئی ہیں آپ سے ملنے کے لئے۔'' مالی گھر کا پرانا نوکر ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا، وہ اس کے غصے سے سہم کر جلدی سے بولا، زوبیہ ان کی عمر کا لحاظ کیے بغیر انہیں اکثر ڈانٹ کر رکھ دیتی تھی، حالانکہ احمد اور صالحہ اسے فوراً ٹوک دیتے تھے مگر وہ باز نہ آتی تھی۔

''رابعہ آئی ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی، وہ ایک ہفتے سے یونیورسٹی سے غیر حاضر تھی رابعہ اس کی کلاس فیلو اور فرینڈ تھی، وہ یقیناً اس کی غیر حاضری کا پوچھنے آئی ہوگی۔

''تم اسے بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔'' وہ مالی بابا کو تاکید کرکے فریش ہونے کے لئے واش روم چلی گئی، وہ اس حلیے میں ہرگز اس کے سامنے نہ آنا چاہتی تھی، رابعہ سے اس کی دوستی یونیورسٹی میں ہوئی تھی اور ان دو سالوں میں اتنی پختہ ہوچکی تھی جیسے وہ برسوں سے ساتھ ہوں، رابعہ کو اس کی خود پسندی و ہٹ دھرمی سے سخت چڑ تھی لیکن دونوں کی دوستی میں فرق نہ آیا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ چینج کرکے آئی تو رابعہ اس کے ڈرائنگ روم کی اشیاء کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی، قیمتی فرنیچر، بھاری پردے، امپورٹڈ کارپٹ اور دیواروں پہ لگی قیمتی آرائشی اشیاء۔

''ہیلو۔'' رابعہ نے جواباً کہتے ہوئے اٹھ کر اس کے گالوں سے گال مس کرتے ہوئے زوبیہ کے نزاکت بھرا بوسہ لیا، زوبیہ خود کو کمپوز کرتی اس کے قریب صوفے پر ٹک گئی۔

''کہاں تھی تم اتنے دنوں سے۔'' رابعہ نے چھوٹتے ہی تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا، زوبیہ کبھی بھی اتنے روز یونیورسٹی سے غیر حاضر نہ رہی تھی ان کی فائنل ٹرم کے ایگزامز بہت قریب تھے، وہ دونوں مل کر نامکمل نوٹس کی تیاری میں لگی تھیں کہ اچانک زوبیہ غائب ہوگئی، زوبیہ کے چہرے پر اک پل کو تاریک سایہ دوڑ گیا۔

"بس یار! ذرا طبیعت خراب تھی۔" زوبیہ نے آنکھوں میں آئی نمی اندر اتارتے ہوئے بہانہ گھڑا، رابعہ نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے پرسوچ انداز میں سر ہلایا، زوبیہ کی حالت دگرگوں تھی مگر طبیعت خراب نہ تھی، اگر اس نے رابعہ سے بہانہ بنایا تھا تو وہ لازماً اس سے کچھ چھپانا چاہتی تھی، رابعہ اس کے مزاج سے واقف تھی وہ لاکھ اسے کریدتی مگر اس نے کچھ نہ بتانا تھا، وہ چاہتی تھی کہ زوبیہ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے خود پوری سچائی سے ساری بات بتائے۔

"تم سناؤ، یونیورسٹی میں کلاسز کیسی جا رہی ہیں؟" دونوں کے بیچ خاموشی کی دبیز تہہ حائل ہو گئی تھی جسے زوبیہ نے محسوس کرتے ہوئے موضوع بدلا، اسے رابعہ کی خفگی کی فکر ستانے لگی تھی، رابعہ اس سے ہر بات شیئر کرتی تھی، وہ بھی اس سے سب کچھ شیئر کرتی تھی مگر اسے اپنی ہار کے قصے کیسے سناتی، زوبیہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ عبدالاحد یا خالہ صالحہ کے متعلق کچھ بتاتی، ابھی تو اسے خود کو سنبھالا تھا، وہ کسی کی آنکھوں میں اپنے لئے ترحم یا ہمدردی نہ دیکھنا چاہتی تھی، اسے ترس نہیں چاہیے تھا۔

وہ والدین کی اکلوتی اولاد اور ناز و نعم میں پلی لڑکی تھی، اس کی ہمیشہ ہر خواہش پوری ہوئی تھی، اسے کبھی کسی چیز کے لئے جدوجہد نہیں کرنا پڑے تھی اس کی زندگی ہر خواہش اس کی جھولی میں بن مانگے گری تھی لیکن اب...... اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش...... اس کی زندگی ادھوری رہ گئی تھی احساس تشنگی پوری شدت سے اس کے اندر جاگا تھا، اک کسک جسم و جان میں درد کی صورت دوڑ گئی تھی، اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی تھی۔

"زوبیہ! تم ٹھیک تو ہو نا۔" رابعہ نے زوبیہ کے لئے دیئے انداز کے بعد اس سے کچھ بھی نہ پوچھنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکی اور زوبیہ کا سوال ٹالتے ہوئے اس سے استفسار کرنے لگی، رابعہ کے لہجے میں چھپے خلوص نے اس کی آنکھوں میں پھیلی نمی کو مزید پھیلا دیا اور آنسو کسی ضدی بچے کی طرح انگلی چھڑوا کر زوبیہ کے گالوں پہ پھسل آئے۔

"پلیز مجھے پریشان مت کرو، بتاؤ کیا ہوا ہے۔" رابعہ نے پریشان ہو کر اس کو خود سے لپٹا لیا اور اس کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا، زوبیہ کے آنسوؤں میں شدت آتی گئی۔

"کیا عبدالاحد نے کچھ کہا ہے؟" رابعہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اگلا سوال کیا، زوبیہ کے بہتے آنسو رک گئے، اس کے دل پر درد نے چٹکی لی، تو وہ بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا کر ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی، رابعہ نے نرمی سے اس کے ہاتھ مسلے۔

"ہوں تو کیا تم بھی ضیاء سے شادی پر راضی ہو۔" رابعہ نے پوری بات سننے کے بعد ہنکارا بھرتے ہوئے پرسوچ نگاہیں زوبیہ کے چہرے پر گاڑ دیں، زوبیہ کا چہرہ آنسوؤں سے دھل کر یوں نکھر گیا تھا جیسے بارش سے پتے دھل کر نکھر جاتے ہیں احمد نے زوبیہ کو ساری بات بتانے کے بعد ضیاء کے متعلق بھی بتایا تھا، احمد کو ضیاء بے حد پسند تھا مگر انہوں نے کبھی اسے اس نظر سے نہ دیکھا تھا، لیکن انہوں نے صالحہ کی خود غرضی کے مظاہرہ کے بعد ضیاء کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا اور فیصلہ زوبیہ پر چھوڑ دیا تھا، وہ فیصلہ کر چکی تھی مگر درد دل حد سے سوا تھا، سو وہ ابھی پپا کو اپنا فیصلہ نہ سنا پائی تھی۔

"ہوں۔" زوبیہ نے دھیمے سے ہنکارا بھرا، رابعہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"زوبیہ میرا تمہیں مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم اپنے اس فیصلے پر قائم رہنا۔" رابعہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تا، وہ بے شک ضدی و مغرور سہی مگر اس میں نرم دل لڑکی بھی چھپی ہوگی رابعہ کو قطعاً اندازہ نہ تھا۔

"زوبیہ! اولاد والدین کا مان توڑ کر کبھی سکھی نہیں رہ سکتی ہے، مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے کہ تم نے والدین کی دعائیں سمیٹنے کا فیصلہ کیا ہے، تم زندگی میں ہمیشہ یہ یقین رکھنا کہ والدین کی دعائیں سدا تم پر سایہ فگن ہیں۔" رابعہ نے رسانیت سے بھری نرمی سے اسے سمجھایا، اسی اثناء میں عالیہ ملازمہ کے ہمراہ طرح طرح کے لوازمات سے سجی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"السلام علیکم آنٹی!" رابعہ احتراماً انہیں سلام کرتی کھڑی ہو گئی، عالیہ نے اسے محبت سے ساتھ لگاتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

"تم دونوں باتیں کرو میں چلتی ہوں۔" وہ ملازمہ سے سامان ٹیبل پر چنوا کر انہیں مخاطب کرتی ہوئی چلی گئیں۔

"میں چائے پیئوں گی۔" زوبیہ مما کے جانے کے بعد رابعہ کے لئے گلاس میں جوس نکالنے لگی تو اس نے اسے منع کرتے ہوئے ٹی پاٹ کی طرف اشارہ کیا، زوبیہ کھلکھلا دی، رابعہ نے دوست کی خوشی کی ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالیں، دونوں کی باتوں میں مگن وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا اور رابعہ کو لینے کے لئے آ گئے۔

"تم کل یونیورسٹی ضرور آؤ گی۔" زوبیہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تو رابعہ نے اس کے گالوں پر الوداعی بوسہ دیتے ہوئے سختی سے تاکید کی، زوبیہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا، رابعہ اس سے مل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی زوبیہ مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگی، لان میں آئی عالیہ نے اسے مسکراتے دیکھا تو انہوں نے تشکر بھری سانس لی تھی۔

زوبیہ کی خاموشی انہیں دہلائے دیتی تھی، وہ اس کے لئے بہت پریشان تھیں، انہوں نے اسے بہت دنوں بعد مسکراتے ہوئے دیکھا تھا، زوبیہ پلٹی تو عالیہ کو لان میں موجود پایا وہ کچھ سوچ کر ان کے پاس آ گئی اس پر چھائی اداسی کا غبار قدرے کم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا بوجھل اداسی کی دبیز تہہ میں پناہ لے چکی تھی، ہر فرد اپنی اپنی جگہ خاموش، اک دوسرے سے نظریں چرائے بظاہر اپنی روٹین میں مگن تھا، بابا، عبدالصمد، عبدالاحد صبح کے آفس گئے رات کو گھر لوٹتے، صالحہ سارا دن اپنے کمرے میں مقید رہیں، نجانے انہیں شرمندگی تھی یا اپنی ہار کا غم تھا، بہرحال وہ صرف کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلتیں، عارفہ اور ثناء تھیں جو آپس میں مل بیٹھ کر ٹائم گزارتی تھیں۔

"صالحہ! پھر تم نے اب کیا سوچا ہے۔" اس روز کے بعد عالیہ اور احمد پلٹ کر نہ آئے تھے اور نہ ہی انہوں نے کوئی فون کیا تھا ان کی خاموشی ان کی ناراضگی کا واضح اظہار تھی، حالانکہ عالیہ کا ہر دوسرے روز ان کے ہاں لازماً اک آدھ چکر لگتا تھا اور زوبیہ تو اکثر و بیشتر ادھر ہی پائی جاتی تھی، فاروق صاحب نے اس روز آفس سے لوٹنے کے بعد ڈنر کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر سب کی موجودگی میں صالحہ سے پوچھا، انہوں نے قصداً یہ ذکر چھیڑا تھا، مقصد گھر میں پھیلے بوجھل پن کو کم

کرنا تھا، صالحہ خاموشی سے پلیٹ میں چاول ڈالے کانٹے اور چمچ سے کھیلتی رہیں۔

''بیگم! کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے مسئلے حل نہیں ہوتے ہیں اس سے زندگی میں بے سکونی پھیلتی ہے۔'' فاروق کو صالحہ کی خاموشی ناگوار گزری سب انہیں منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، وہ زوبیہ کو بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں جو چکنا چور ہو چکے تھے، عبدالاحد کی شادی مریم سے ہو یا نہ ہو، انہیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا ان کی نگاہیں تو بہن کی دولت پر تھیں جو ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔

اگر وہ کسی امیر گھرانے کی بہو لاتیں تو اس کے ساتھ جہیز بھی خوب آتا مگر وہ آتے ہی ان کے بیٹے کو لے کر الگ ہو جاتی، وہ زوبیہ کو بہو بنانے کی ضرورت اسے دباؤ میں رکھ سکتی تھیں، زوبیہ بھلے ہٹ دھرم و خودسر سہی مگر ان کے کنٹرول میں رہتی، زوبیہ صرف ہٹ دھرم اور غصیلی تھی اس میں چلتر بازی بالکل نہ تھی وہ اسے باآسانی اپنے قابو میں رکھ سکتی تھیں۔

''مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔'' وہ بیٹے کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھیں وہ مریم کو بہو بنا کر یقیناً فائدے میں رہتیں، عبدالاحد بھی خوش ہو جاتا اور ماں کی عزت اس کے دل میں بڑھتی جبکہ مریم کے آگے پیچھے کوئی نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنے دباؤ میں رکھ سکتی تھیں، فیصلہ تو وہ کر چکی تھیں محض اپنا بھرم رکھنا مقصود تھا سو انہوں نے بات ٹال دی۔

''تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو، میں چاہتا ہوں کہ اب عبدالاحد کی سونی زندگی میں بھی رنگ بکھر جائیں۔'' فاروق نے اشارتاً اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا تاکہ صالحہ اپنی ہٹ دھرمی و ضد چھوڑ دیں اور عبدالاحد کی خوشی میں خوش ہو جائیں۔

عبدالاحد روز بروز کم گو ہوتا جا رہا تھا، وہ زندہ دل، ہنس مکھ اور شوخ مزاج نوجوان تھا، مگر اس کی زندہ دلی اور شوخی بھری شرارتیں تو قصہ پارینہ ہو چکی تھیں، انہیں اپنے دونوں بیٹے بے حد عزیز تھے، وہ دونوں کو خوش باش اور ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے تھے۔

صالحہ پر چڑھا ضدی و ہٹ دھرمی کا خول دھیرے دھیرے چٹخنے لگا تھا انہوں نے عبدالاحد کو دیکھا جو ساری دنیا سے خفا لگ رہا تھا، وہ جیسے ہنستا مسکراتا تو بالکل بھول چکا تھا، اس کی شوخی بھری شرارتیں ہی تو گھر کی رونق تھیں جو ان کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں، ان پر طاری نام نہاد ضد کا خول اترا تو ان کے سینے میں ممتا بھرا دل دھڑکنے لگا۔

بکھرے بالوں، ملگجے کپڑوں اور بڑھی شیو والا عبدالاحد ان کی سوئی ممتا کو جھنجھوڑ گیا، وہ اتنی خودغرض بھی نہ تھیں کہ بیٹے کے لبوں سے ہنسی اور دل سے سکون چھین لیتیں، وہ اک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو چکی تھیں ان کے دل سے مریم کو اپنے قابو میں رکھنے کی خواہش بھی ختم ہو چکی تھی، انہیں صرف عبدالاحد کی خوشی عزیز تھی اور اسے دوبارہ سے وہی ہنستا مسکراتا اور کھلنڈرا عبدالاحد بنانا تھا، سامنے بیٹھا سنجیدہ چہرے والا خاموش عبدالاحد انہیں اک آنکھ نہ بھایا تھا، وہ نرمی سے ہنس دیں۔

☆☆☆

محبت خواب ہوتی ہے، محبت بات ہوتی ہے
جو کوئی پوچھ بیٹھے تو، محبت راز ہوتی ہے
مچلتی ہوئی امنگوں کا، سہانا ساتھ ہوتی ہے
جو کوئی ڈھونڈنا چاہے تو یہ نایاب ہوتی ہے
محبت پھول ہے شاید غموں کی دھول ہے شاید
چمکتی رات ہے شاید، کسی کی یاد ہے شاید
محبت پرسکون ہے، مگر بے تاب ہوتی ہے
اگر نہ مل سکے تو پھر عذاب جان ہوتی ہے
محبت خواب ہوتی ہے، محبت خواب ہوتی ہے

شہر کے اس پوش ایریا میں سڑک کے اطراف بنے تمام بنگلے طرز تعمیر کا جدید اور شاندار نمونہ تھے، وہ مطلوبہ گھر کے سامنے رک گیا، اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل بغل میں دابی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے الجھے بال سنوارنے لگا، گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ لان تھا، جو سڑک سے اپنی بہار دکھا رہا تھا، سفیدے اور سرو کے درخت باہر روڈ پر بھی چھاؤں کا موجب تھے، بوگن ویلیا کی بیل دیوار سے گیٹ کی طرف پھیلی ہوئی تھی، وہ موتیے اور گلاب کی خوشبو گیٹ بند ہونے کے باوجود باآسانی سونگھ سکتا تھا، گھر اپنے مکینوں کے حسن ذوق کا مظہر تھا۔

''احمد صاحب سے کہیں ضیاء آیا ہے۔'' اس نے بیل بجائی تو اندر سے چوکیدار بھاگا آیا، ضیاء نے اپنا تعارف کروایا، وہ الٹے قدموں اندر چلا گیا، سامنے ماربل کا کار پورچ تھا جس کے انتہائی سرے پر منقش لکڑی کا خوبصورت دروازہ تھا، دائیں طرف لان تھا جس میں مختلف پودے، درخت اور پھولوں کی بیلیں لگی ہوئی تھیں، دروازے کے دائیں طرف لان کے ساتھ دو سیڑھیاں اترتی تھیں، سیڑھیوں کے اوپر چھوٹا سا برآمدہ تھا جس میں دو دروازے کھلتے تھے، جبکہ بائیں طرف چھوٹا سا اراضی قطعہ تھا جس کے آخری سرے پر ایک کمرہ اور اٹیچ باتھ تھا، اٹیچ باتھ کے ساتھ باہر کی طرف ایک واش بیسن بھی تھا۔

''آئیں، آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔'' وہ گھر کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا کہ چوکیدار نے آکر اسے پیغام دیا، وہ اس کے ساتھ ہو لیا، چوکیدار اسے بائیں سمت لے جانے کی بجائے گھر کی اندرونی حصے کی طرف لے جانے لگا، وہ خاموشی سے متحیر سا اس کے پیچھے ہولیا، اس کا خیال تھا کہ بائیں جانب بنا کمرہ مردان خانے کی طور پر استعمال ہوتا تھا۔

وہ اندر داخل ہوا تو وسیع لاؤنج تھا، لاؤنج کے دوسری طرف اک دروازہ تھا چوکیدار اب دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، دروازے کے پار اک طویل راہداری تھی جس کے دونوں طرف کمرے تھے چوکیدار نے دائیں طرف بنے تیسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے پلٹ کر اندر جانے کا اشارہ کیا اور واپس پلٹ گیا۔

وہ چند ثانیے باہر کھڑا رہا اور وہ دروازے کی ناب گھمانے کو تھا کہ کوئی تیزی سے باہر نکلا اور سیدھا اس سے ٹکرا گیا۔

''نان سینس۔'' زوبیہ کا سر ضیاء کے کشادہ سینے سے ٹکرایا تو وہ جھنجھلا کر زیر لب بڑبڑائی، ضیاء کی حساس سماعت نے فوراً اس کی بڑبڑاہٹ کیچ کرلی وہ لائٹ ریڈش سوٹ فیروزی دوپٹے اور کانوں میں فیروزی آویزے پہنے اپنی سادگی سمیت اس کے دل میں اتر گئی لمبے بالوں کو چوٹی کی صورت گوندھ کر سامنے رکھا گیا تھا، غلافی آنکھیں، ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک گلابی ہونٹ، وہ حسن و سادگی کا مجسم تھی، میک اپ سے عاری چہرہ ضیاء پر سحر پھونک چکا تھا، وہ یک ٹک غصے سے بھری زوبیہ کو دیکھے جا رہا تھا جو اس کے گھورنے پر اسے نجانے کیا کیا سنائے جا رہی تھی، ضیاء کے دل کی دھڑکن بدل گئی تھی۔

''ارے ضیاء بیٹا! آؤ آؤ۔'' ضیاء فائل لئے ان کے پیچھے تھا، ضیاء نے اک پروجیکٹ ہفتہ بھر کی محنت کے بعد تیار کیا تھا اسے یہ فائل آج ہر صورت احمد صاحب کو دکھانا تھی کیونکہ کل اسے

متعلقہ کمپنی کے چیئر مین بورڈ آف ڈائریکٹرز سے میٹنگ کرنا تھی وہ دو ہفتے کے لئے امریکا جارہے تھے اگر میٹنگ لیٹ ہو جاتی تو لامحالہ ٹینڈر اپروو ہونے میں بھی تاخیر ہوتی، جس سے کمپنی کی ساکھ متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔

”اگر میں آفس آ جاتا تو تم کیسے یہاں آتے۔“ احمد صاحب نے اس کا سوال گول کر کے خوشدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا، ضیاء بھی ہولے سے مسکرا دیا، جیسے ان کی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔

”سر فاروقی ملز سے کل میری میٹنگ ہے ان کے چیئر مین بورڈ آف ڈائریکٹرز امریکہ جانے والے ہیں اگر آج یہ کام ادھورا رہ جاتا تو پھر ٹینڈر کی منظوری میں ایک ماہ مزید لگ جاتا جس سے کمپنی کی ساکھ متاثر ہوتی۔“ ضیاء نے بغل میں دبائی فائل کھولتے ہوئے ان کے آگے رکھ دی تا کہ وہ پروجیکٹ پر اک نظر ڈال لیں۔

”ضیاء مجھے تم پر بہت اعتماد ہے اگر تم مطمئن ہو تو کل میٹنگ اٹینڈ کر لو۔“ احمد نے فائل دیکھے بنا سائیڈ ٹیبل پر رکھی چائے کپوں میں انڈیلی جو ملازم ان کی گفتگو کے دوران رکھ کر گیا تھا، ضیاء ان کے اعتماد پر شکر گزار تھا۔

”تھینک یو سر! اگر آپ مطمئن ہیں تو میں کل چلا جاؤں گا میٹنگ میں۔“ ضیاء نے ممنونیت سے انہیں دیکھا، اس کی ترقی میں اس کی اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ احمد صاحب کی خصوصی شفقت بھی شامل تھی۔

”ضیاء تمہارے فادر کیا کرتے ہیں؟“ احمد نے چائے کا کپ ضیاء کے سامنے رکھنے کے بعد اپنا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے استفسار کیا، ان کے لہجے میں کچھ انوکھا یا الگ تھا، ضیاء چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”سر! ان کی چار سال قبل ڈیتھ ہو گئی تھی۔“ ضیاء سنبھل کر نرمی سے گویا ہوا، ضیاء پر احمد کا التفات روز بروز بڑھ رہا تا، وہ پہلے ٹھٹکا تھا مگر اس نے اپنی قابلیت و ذہانت پر باس کی خوشی کا اظہار سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا، احمد کے چہرے پر تاسف ابھرا، وہ دیر تک اس سے اس کی ذاتی لائف کے متعلق سوال کرتے رہے تھے۔

☆☆☆

گھر میں ہو کا عالم تھا، امی کچن میں مصروف تھیں اس نے صحن میں گاڑی لا کر روکی تو وہ چونک کر کچن سے باہر آ گئیں سارہ اور ضیاء کے پاس گیٹ کی ایک ایک چابی ہمیشہ موجود ہوتی تھی، وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ بند کر رہا تھا سارہ کالج سے نہ لوٹی تھی۔

”ارے بیٹا! تم اتنی جلدی آ گئے۔“ راحت بیگم نے ٹائم دیکھنے کے بعد تشویش سے اسے دیکھا، کہ ضیاء خلاف معمول بہت جلد گھر آ گیا۔

ضیاء نے آہستگی سے انہیں سلام کرتے ہوئے ان کے سامنے پیار لینے کے لئے سر جھکایا راحت نے بیٹے کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرنے کے بعد محبت سے اس کا ماتھا چوم لیا، انہیں ضیاء پر بہت فخر تھا اور ان کا مان روزانہ اس پل بڑھ جاتا تھا جب وہ آفس روانگی اور واپسی کے وقت سیدھا ان کے پاس آتا تھا، وہ ان کا سوال نظر انداز کرتا چینج کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چند روز سے کچھ الجھا سا تھا، راحت کی تشویش بڑھ گئی، وہ اس کے کپڑے چینج کر لینے تک کھانا تیار کرنا چاہتی تھیں، ضیاء چینج کر کے صحن میں بچھے تخت پر آن لیٹا، راحت کھانا تیار کر چکی تھیں، انہوں نے پلٹ کر بیٹے کو دیکھا جو پر سوچ انداز میں آسمان کو گھور رہا تھا، انہوں نے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھیں اور سالن ڈونگے میں ڈال دیا۔

”ضیاء! کیا بات ہے بیٹا؟“ انہوں نے محبت بھرا گلہ کیا تو ضیاء شرمندہ ہو گیا، اس نے نظریں جھکائے انہیں احمد صاحب کا مدعا بتا دیا، راحت کے چہرے پر دھیرے دھیرے سکون پھیلتا گیا، انہیں تو نجانے کیا کیا اندیشے ستانے لگے تھے۔

”تو بیٹا! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے، کیا تمہیں کوئی اور لڑکی پسند ہے۔“ امی نے اس کی مشکل آسان کرتے نرمی سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”نہیں امی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ ضیاء کے تصور میں زوبیہ کا دلربا سراپا در آیا تو لبوں پہ ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو میرا خیال ہے کہ پھر لڑکی دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، مانا کہ وہ لوگ دولتمند اور امیر و خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں مگر بیٹا جب انہیں ہم سے رشتہ جوڑنے میں عار نہیں ہے تو ہم کیوں خواہ مخواہ احساس کمتری کا شکار ہوں۔“ راحت ماں تھیں انہوں نے بیٹے کی خودداری اور الجھن بھانپ لی تھی، اسی لئے انہوں نے رسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے تسلی دی، وہ ماں کو دیکھ کر رہ گیا، وہ واقعتاً اسی الجھن میں تھا کہ زوبیہ بے حد امیر اور خوشحال گھرانے کی اکلوتی اولاد ہے نجانے وہ ان کے گھر ایڈجسٹ ہو بھی پائے گی یا نہیں۔

”واؤ بھیا کی شادی ہو رہی ہے۔“ نجانے سارہ کب آئی انہیں باتوں میں بالکل علم نہ ہوا، راحت نے محبت سے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا سارہ مارے خوشی کے بھائی سے لپٹ گئی سارہ اور ضیاء میں دس سال کا گیپ تھا، ضیاء نے باپ کی شفقت محسوس کی تھی جبکہ سارہ سکس میں تھی تو ابو کا انتقال ہو گیا تھا، اسے لگتا تھا کہ سارہ باپ کی شفقت سے جلد محروم ہو گئی ہے اسی لئے ضیاء اس پر باپ اور بھائی دونوں کی شفقت نچھاور کرتا تھا ضیاء نے بازو بہن کے کندھوں کے گرد پھیلا دیئے۔

☆☆☆

وہ نماز عصر کے بعد کھلی ہوا کے لئے لان میں آ گئیں، موسم کافی بدل چکا تھا کمرے میں گھٹن تھی وہ گھٹن سے فرار چاہتی تھیں، بعض اوقات خوشگوار ہوا کا اک جھونکا ساری کلفت و گھٹن زائل کر دیتا ہے خوشگوار ہوا نے ان پر خاصا اثر کیا تھا، ہوا کے زور پر اٹکھیلیاں کرتے پھول بے حد بھلے لگ رہے تھے، یکایک ان کی نگاہیں گیٹ کی سمت اٹھیں اور ساکت رہ گئیں، یہ ان کا وہم یا خواب و الوژن نہ تھا، اک اٹل حقیقت تھی، انہوں نے زور سے پلکیں جھپکیں حقیقت ان کے سامنے تھی۔

”عالیہ!“ وہ بے تابی سے اٹھ کر بہن کی طرف بھاگیں، وہ ان سے ناراض تھی اس نے دوبارہ ان سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا اور نہ ہی انہیں ملنے آئی تھیں، عالیہ نے آگے بڑھ کر بہن کو کھلے دل سے گلے لگا لیا، ان دونوں کا اک دوسرے کے علاوہ کون تھا وہ دو بہنیں اور دو بھائی تھے، دونوں بھائی برسوں سے لندن میں مقیم تھے، دونوں نے وہیں ایک ہی فیملی میں شادیاں کر رکھی تھیں، ان کا وہاں بزنس تھا، دونوں بھابھیاں بہنیں تھیں اور دونوں کا پاکستان سیٹل ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

ان دونوں بہنوں کو بھائیوں سے قطعاً کوئی توقع نہ تھی اگر وہ بھی اک دوسرے سے روٹھ جاتیں تو ان کا میکہ کا سہارا بالکل چھن جاتا، عالیہ

نے سمجھا بجھا کر شوہر کو راضی کر لیا تھا احمد کو بھی صالحہ بہنوں جیسی عزیز تھیں، صالحہ بہن کو لئے چیئرز پر بیٹھ گئیں، انہیں خدشہ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ چھوڑ کر چلی جائے گی وہ ریحان اور سلمان کی طرح ان سے کبھی نہ ملے گی۔

''صالحہ باجی! جو کچھ بھی ہوا ہم اسے بھلا کر آپ کو زوبیہ کی منگنی کی دعوت دینے آئے ہیں۔''

ماحول پر خاموشی کی چادر تنی تھی جسے احمد نے چاک کیا، صالحہ کے اندر اتنی اخلاقی جرأت موجود تھی کہ وہ دل سے زوبیہ کا خیال نکال دیں، انہیں زوبیہ سے زیادہ بہن کی خفگی کی پرواہ تھی، جو عالیہ اور احمد کے آنے سے ختم ہو گئی تھی۔

صالحہ شرمندہ ہو گئیں، انہیں نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا، احمد انہیں زوبیہ کے رشتے کی تفصیل بتانے لگے، وہ بہن اور بہنوئی کی اتنی عزت افزائی دینے پہ تہہ دل سے ان کی مشکور تھیں۔

''عالیہ! بیٹھو نا تم ابھی تو آئی تھی۔'' عالیہ اور احمد انہیں دعوت دے کر کچھ دیر بیٹھ کر جانے لگے تو انہیں نئے سرے سے ان کی خفگی کا احساس ستانے لگا کہ شاید وہ ناراض ہے اسی لئے وہ دونوں جلدی جا رہے ہیں۔

''باجی ہمیں اور انتظامات کرنے ہیں ہم سب سے پہلے آپ کو دعوت دینے آئے تھے۔'' احمد نے نرمی سے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

''ہم پھر آئیں گے باجی۔'' عالیہ نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے یقین دلایا تھا۔

''نہیں تم دونوں چائے پیئے بغیر نہیں جا سکتے۔'' صالحہ کا دل نجانے کیوں مطمئن نہ ہو رہا تھا، ان دونوں کو شاپنگ کے لئے جانا تھا، وہ عجلت میں تھے لیکن صالحہ کا اصرار دیکھتے ہوئے احمد نے عالیہ کو رکنے کا اشارہ کیا، وہ شوہر کا اشارہ پا کر پھر بیٹھ گئیں، صالحہ کی خوشی و اطمینان دیدنی تھا، انہوں نے وہیں سے ثناء کو آواز دے کر چائے کی ہدایت دی، عارفہ میکے گئی ہوئی تھی، اسی لئے ان سے نہ مل سکی تھی، البتہ ثناء نے اسے آتے ہی اسی کی غیر موجودگی میں مہمانوں کی آمد کا بتا دیا تھا۔

☆☆☆

در قفس سے پرے جب صبا گزرتی ہے
کسے خبر ہے کہ اسیروں پہ کیا گزرتی ہے
تعلقات کبھی اس قدر نہ ٹوٹے تھے
کہ تیری یاد بھی ہو کے مجھ سے خفا گزرتی ہے
وہ اب ملے بھی تو ملتا ہے اس طرح جیسے
بجھے چراغ کو چھو کر جس طرح ہوا گزرتی ہے
یہ اہل ہجر کی بستی ہے ذرا احتیاط سے چل
مصیبتوں کی یہاں پر انتہا گزرتی ہے
نہ پوچھ اپنی انا کی بغاوتیں محسن
در قبولیت سے بچ کر دعا گزرتی ہے

دن بھر کی تھکی ہاری دھوپ در و بام تک پہنچ گئی تھی اور ذرا ستانے کو کناروں پر ٹک گئی تھی، سنہری کرنیں، سنہری چولا اتار کر نارنجی چولا پہننے کو تھیں، موسم بے حد خوشگوار تھا، مما اور پپا خالہ کے ہاں اس کی منگنی کی دعوت دینے گئے تھے، دونوں ماموؤں کے بیرون ملک سیٹل ہونے کے بعد مما اور خالہ پاکستان میں تنہا تھیں انہیں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانا تھا، وہ بہن سے ساتھ نبھانے کے لئے گئی تھیں۔

زوبیہ کی پلکیں بھیگنے لگیں اس نے کپکپاتے ہونٹوں کو سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کر لیا، ضبط شدت سے اس کی صبیح پیشانی پر ہلکی سبز رگ ابھر آئی تھی اس نے آنسو ضبط کرنے کے لئے آنکھیں زور سے میچ لیں، یکا یک کمرے میں گھٹن بڑھنے لگی تھی۔

زوبیہ نے سر جھٹک کر کھڑکی کھول دی وہ

سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی مگر بھلانا آسان کام نہ تھا، اس نے شعور کی پہلی منزل سے محبت جیسے لطیف جذبے کو محسوس کیا تھا اور اسے اس جذبے سے روشناس کرانے والا عبدالاحد تھا، زوبیہ محبت کی سیڑھی پر قدم قدم آگے بڑھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ محبت کی انتہا پائی تھی۔

عبدالاحد کو بھلانا اس کے لئے ناممکنات سے تھا، لیکن اب اسے اسی ناممکن کو ممکن کر کے اپنی زندگی سہل بنانا تھی، دو روز قبل ضیاء اپنی امی اور بہن کے ساتھ ان کے ہاں آیا تھا، وہ راحت بیگم کو پہلی نظر میں ہی بے حد بھائی تھی۔

راحت بیگم اور سارہ کی پسندیدگی نے اس کے وجود میں بن باس کا جنگل اگا دیا تھا، وہ یاسیت کی انتہا پر تھی مگر وہ انکار کر کے اپنے والدین کا مان نہ توڑنا تھا، وہ ضدی، خودسر اور ہٹ دھرم زوبیہ تو اسی روز قصہ پارینہ بن گئی تھی جس روز احمد نے پورے مان سے اسے فیصلہ کا اختیار سونپا تھا، اسے ان کا مان بڑھانا تھا، چاہے خود کو اذیت دے کر ہی سہی۔

پہلے عبدالاحد اور مریم کا ذکر اسے اذیت و ضد پر اکساتا تھا لیکن اب وہ خالی الذہنی گھنٹوں اس نہج پر سوچوں میں گم رہتی اور ذہن کوئی فیصلہ نہ کر پاتا تھا۔

اسے نٹ کھٹ اور شوخ سی سارہ بہت بھائی تھی، راحت بیگم بھی مشفق و با اخلاق عورت تھیں اور ضیاء...... سوچوں میں گم ذہن ضیاء پر آ کر اٹک گیا۔

شریر ہوا کے جھونکے نے اسے نرمی سے چھو کر سوچوں کے گرداب سے نکالا، وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر لان میں جھانکنے لگی اور آنکھیں بند کر کے لمبا سانس بھرتے ہوئے خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

خوشگوار موسم اور گلاب کی بھینی خوشبو نے جسم و جان پر طاری کلفت دور کر دی، اس پر طاری خود اذیتی کا خول دھیرے سے چٹخنے لگا تھا، ذہن نے ہولے سے اسے تھپکتے ہوئے دل کی لے بدلی تھی۔

''ضیاء!'' ذہن نے سوچوں کا ٹوٹا سرا تھاما تو لبوں سے سرسراہٹ خارج ہوئی، وہ دراز قد، خوش شکل، خوش لباس اور گندمی رنگت کا حامل مجموعی طور پر وجیہہ نوجوان تھا، آنکھوں کے سامنے ضیاء کا سراپا لہرایا تو دل کی بدلی لے نے سروں کی صورت اختیار کر لی، زوبیہ نے گھبرا کر سر ارد گرد یوں ہلایا جیسے وہ سامنے موجود ہو اور ضیاء نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

وہ قفس محبت کی برسوں اسیر رہی تھی لیکن اسے یہ اسیری نارسائی کے سنگ قبول نہ تھا عبدالاحد کبھی بھی اس کا نہ ہو سکتا تھا، وہ ہمیشہ تہی داماں رہتی، اسے اپنی نام نہاد اسیری کو ختم کرنا تھا اور خلوص و وفا کے ٹمٹماتے دیئے کو محبت کی انگلی تھمانا تھی اسے یقین تھا کہ وہ ضیاء کی پرخلوص رفاقت میں جلد محبت کی انگلی تھام لے گی، زوبیہ نے مطمئن ہو کر سر کھڑکی سے ٹکا دیا۔

☆☆☆

چلو اب مل کے ہجر و حبس کا موسم بدلتے ہیں
ذرا سا تم بدل جاؤ، ذرا سا ہم بدلتے ہیں
رہی اپنی یہ عادت کہ ویسے کم بدلتے ہیں
مگر جب ہم بدلتے ہیں، تو پیہم بدلتے ہیں
اگر تم کو یہ لگتا ہے کہ تمہارا غم زیادہ ہے
تو اب کی بار ہم آپس میں اپنے غم بدلتے ہیں

وہ گاڑی آفس کے پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے لاک کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی، پارکنگ ایریا میں کافی رش تھا، اس نے کال ڈس کنیکٹ کر دی، وہ پر سکون جگہ پر کال

ریسیو کرنا چاہتا تھا، اس نے ذاتی گاڑی پچھلے ہفتے خریدی تھی، وہ بابا جان کے اصرار پر جاب چھوڑ کر ان کے بزنس کو ٹائم دے رہا تھا۔

بابا جان کو انجائنا کا معمولی اٹیک ہوا تھا گو ان کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی، مگر وہ کام کا برڈن زیادہ ہونے کی وجہ سے ٹینس رہتے تھے انہوں نے عبدالاحد سے جاب چھوڑنے کا تقاضا کیا تو وہ ان کی بات رد نہ کر سکا۔

اس نے اگلے روز سے اپنی جاب سے ریزائن دے کر بابا کا آفس جوائن کر لیا تھا، بھیا نے اس کے فیصلے کو بے حد سراہا تھا، وہ لمبے ڈگ بھرتا آفس پہنچ گیا، اس نے کوٹ اتار کر سیٹ کی بیک سے لٹکایا اور ہینڈ بیگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا، اس نے موبائل نکال کر کال ملائی اور دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا، دوسری طرف کال ریسیو نہ کی گئی، اس نے پھر نمبر ملایا تو پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''جی بھابھی آپ کی کال آئی تھی، میں اس وقت پارکنگ ایریا میں تھا اسی لئے کال ریسیو نہ کی تھی۔'' عبدالاحد نے تفصیلاً ان کی کال ریسیو نہ کرنے کی توجیہہ پیش کی، اس نے موبائل کان اور کندھے کے درمیان اٹکایا اور سامنے دھری فائلز کو ترتیب دینے لگا، پھر اس نے ایک فائل میں سے باہر نکلے بے ترتیب کاغذات فائل کلپ سے نکالا اور انہیں برابر کر کے فائل میں لگا دیا۔

''تمہارے پاس ٹائم ہے یا بزی ہو؟'' عارفہ نے کاغذات کی سرسراہٹ سن لی تھی وہ اسے ڈسٹرب نہ کرنا چاہتی تھی اور اسے عبدالاحد کو خوشخبری سنانے کی بھی بہت بے تابی تھی۔

''آف کورس بھابھی! آپ کہیں میں سن رہا ہوں۔'' عارفہ کے لہجے سے چھلکتی خوشی نے اسے چونکا دیا، اس کے تیزی سے متحرک ہاتھ رک گئے اس نے موبائل ہاتھ میں تھام لیا اور اٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے، تیز روشنی کی منعکس شعاعوں سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

''فرائیڈے کو زوبیہ کی منگنی ہے۔'' عارفہ نے دھماکہ کیا، عبدالاحد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ خوش ہو یا زوبیہ سے ہمدردی کرے، اسے کبھی بھی زوبیہ سے محبت نہ ہوئی تھی، وہ بلاشبہ بے حد دلکش و حسین لڑکی تھی مگر اس نے لائف پارٹنر کے حوالے سے جو خاکہ بنایا تھا، وہ اس پر پورا نہ اترتی تھی، عبدالاحد نے کبھی اپنے دل میں زوبیہ کے لئے کچھ خاص محسوس نہ کیا تھا۔

''ہوں۔'' وہ محض ہنکارا بھر کر رہ گیا اس کے وجیہہ چہرے پر سنجیدگی پھیلی تھی، عارفہ اسے عالیہ خالہ کی آمد منگنی کی دعوت اور صالحہ کی رضا مندی کا بتانے لگی، انہیں احمد صاحب نے اس روز جاتے ہوئے عبدالاحد اور مریم کی شادی کا مشورہ دیا تھا۔

''واٹ مما مان گئی ہیں۔'' عبدالاحد ان باتوں سے اکتانے لگا تھا یکایک اس نے چونک کر پوچھا، اسے گھریلو معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی عبدالصمد اسے اکثر گھریلو معاملات میں دلچسپی لینے کو کہتا تو وہ لاپروائی سے کندھے اچکا دیتا تھا اسے عارفہ کی ساری باتوں میں صرف یہی بات دلچسپ لگی تھی۔

''جی اور وہ بھی جلد تمہاری منگنی کا سوچ رہی ہیں۔'' صالحہ نے صبح عارفہ کو بلوا کر عبدالاحد کی منگنی کی شاپنگ کی تاکید کی تھی، عارفہ سے عبدالاحد کی واپسی تک صبر تک نہ ہو سکا تو اس نے اسے فون کھڑکا دیا تھا۔

''عارفہ جلدی کرو بھئی، تم تیار ہو جاؤ مارکیٹ چلتے ہیں۔'' صالحہ نے عارفہ کو آواز دیتے ہوئے ہدایت کی تھی، وہ ناشتہ کر چکی تھیں اور شاپنگ کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگیں۔

''آئی امی جان۔'' عارفہ نے موبائل کان سے الگ کرتے ہوئے وہیں سے اونچی آواز میں جواب دیا اور فون بند کر دیا، عبدالاحد کو اپنے چاروں اور خوشیاں رقصاں محسوس ہونے لگیں، اسے یہ خوشخبری مریم کو بھی سنانا تھی، وہ اس کا نمبر پش کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ درجن بھر مہینوں سے
سدا ممتاز لگتا ہے
جون کس لئے آخر......؟
وہ ہمیشہ خاص لگتا ہے
بہت سہمی ہوئی صبحیں
اداسی سے بھری شامیں
دوپہریں روئی روئی سی
وہ راتیں کھوئی کھوئی سی
گرم دبیز شعلوں کا
وہ کم روشن اجالوں کا
کبھی گزرے حوالوں کا
کبھی مشکل سوالوں کا
بچھڑ جانے کی مایوسی
ملن کی آگ لگاتا ہے
مارچ کس لئے آخر......؟
وہ ہمیشہ خاص لگتا ہے

وہ صحن میں لگے پیپل کے درخت کے اردگرد بنی باؤنڈری وال پر بیٹھی صحن میں پھدکتی چڑیوں کو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال رہی تھی، درخت کے گرد آدھے فٹ اونچی اور گولائی میں تین فٹ لمبی باؤنڈری وال اماں اور مریم نے خود بنائی تھی، گلی کی نکڑ پر محمود صاحب (محلے دار) نے اوپر تلے دو دکانیں بنوائی تھیں جس کی تعمیر کے بعد کچھ میٹریل بچ گیا تھا، محمود صاحب کی بیگم نے اماں سے پوچھ کر وہ ان کے گھر ڈلوا دیا تھا، بلکہ محمود صاحب نے اماں کے لاکھ انکار کے باوجود گھر کی بیرونی دیواریں دو فٹ اونچی کروا دی تھیں کہ اس طرح گھر محفوظ ہو جائے گا۔

تھوڑا سا سیمنٹ اور اینٹیں بچ گئیں تو مریم نے اماں سے کہہ کر باؤنڈری وال بنالی تھی اماں نے پہلے اینٹیں ترچھی کر کے چھوٹی باؤنڈری وال بنائی ہوئی تھی جسے وسیع اور پختہ کر دیا تھا، مریم نے اس میں پودینہ، دھنیا، ٹماٹر اور پالک کے بیج بھی بو دیئے تھے۔

''مریم بیٹا! تمہاری کال ہے۔'' اماں کمرے میں سوتی ہوئی تھیں ان کی آنکھ موبائل کی بپ سے کھلی، وہ کھانا کھا کر ذرا سستانے لیٹیں تو ان کی آنکھ لگ گئی، نماز ظہر کا وقت تنگ پڑ رہا تھا، وہ اسے موبائل تھما کر وضو کرنے چلی گئیں۔

''عبدالاحد کالنگ۔'' مریم کی نظر جگمگاتی سکرین پر پڑتے ہی لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''یار میں آج بہت خوش ہوں۔'' عبدالاحد نے سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی کہا، خوشی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی، عبدالاحد نے اسے چند ماہ اگنور کیا تھا جس کا ازالہ وہ مریم کو روزانہ فون کر کے کرتا تھا، اکثر مریم شرارت سے اسے ٹوکتے ہوئے کہتی ''تم اپنی ساری پے تو موبائل پر خرچ کر دیتے ہو گے تو مجھ پر کیا خرچ کرو گے۔''

''یہ بھی تو تم پر ہی خرچ ہو رہے ہیں۔'' وہ جواباً اسے چھیڑتا تھا، وہ بہت کیئرنگ تھا اس نے بزنس جوائن کرنے کے بعد بہت زیادہ بزی ہو جانے کی وجہ سے کال کا ٹائم ضرور چینج کر دیا تھا مگر اس نے کبھی ناغہ نہ کیا تھا، وہ شاید اپنی مما کے رویئے کا بھی ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

''ویسے تو جناب روزانہ ہی خوش ہوتے

ہیں پھر آج خوشی کس لئے؟'' مریم نے مصنوعی حیرت بھرے لہجے میں اسے چھیڑا تھا۔

''مریم! مما جلد تمہارے گھر آنے والی ہیں۔'' اس نے مریم کو سرپرائز دیا، وہ دھیرے سے مسکرادی، منزل اب قریب تھی صرف چند قدم کا فاصلہ تھا عبدالاحد اسے تفصیلاً زوبیہ کی منگنی اور مما کی رضامندی کے متعلق بتانے لگا تھا۔

''اوہ تو انہیں اپنے کیے کا انجام ملا ہے، ویسے بھی لالچ بری بلا ہے۔'' مریم نے سوچا تھا وہ خاموشی سے عبدالاحد کی باتیں سننے لگی۔

''کیا تم خوش نہیں ہوئی ہو۔'' اپنی خوشی اور باتوں میں مگن عبدالاحد نے اس کی خاموشی محسوس کی تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، میں تمہیں سن رہی تھی۔'' مریم نے فوراً بات بناتے ہوئے گود میں رکھی روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھری پلیٹ چڑیوں کی طرف اچھال دی جو روٹی کے ٹکڑے ختم ہونے کے بعد اسے منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور اس کے گرد پھدک رہی تھیں بلکہ ایک چڑیا نے تو اس کی گود میں روٹی کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا، مریم کے چہرے پر اطمینان و سکون پھیلا ہوا تھا۔

''اوکے پھر کل بات کرتے ہیں۔'' عبدالاحد نے مطمئن ہو کر کال کاٹ دی، وہ روزانہ چند منٹس کے لئے مریم سے بات کر لیتا تھا، مریم نے صالحہ کو معاف کر دیا تھا مگر وہ بہت محتاط ہو چکی تھی، اسے عبدالاحد سے شدید محبت تھی اور اسے عبدالاحد کو کھونا نہ تھا۔

مریم نے موبائل کی تاریک سکرین پر اک نظر ڈالی، صحن سے تمام چڑیاں اڑ چکی تھیں، مریم نے آسودگی سے پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

اماں کے چھوٹے سے صحن میں برسوں بعد خوشیاں برسات کی صورت اتری تھیں، مریم کی پیدائش پر بھی یونہی خوشیاں منائی گئی تھیں، ابا بیٹی پا کر خوشی سے نہال تھے لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اماں اور تین سالہ مریم کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہی عدم سدھارے تھے۔

اماں نے مریم کی منگنی میں محلے کے چند معززین کو مدعا کیا تھا ان کے اپنے عزیز و اقارب تو برسوں پہلے انہیں زندگی کی جھلستی دھوپ میں جلنے کو تنہا چھوڑ گئے تھے، صرف مریم کی اک پھپھو تھیں جو ان کا ساتھ دیتی تھیں ان کا بھی چند برس قبل انتقال ہو گیا تھا اور ان کی اولاد نے اماں سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا، سو ان کے ہاں عزیز و اقارب مدعو نہ تھے، صرف چند مہمان تھے۔

اماں کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہ ٹک رہے تھے، قدرت نے انہیں بن مانگے، ڈھیروں خوشیوں سے نوازا تھا، وہ رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتیں اتنا کم تھا، انہوں نے ابا کی جمع پونجی سے بمشکل گزر بسر کی تھی، مریم نے بھی انٹر کے بعد محلے کے بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دی تھیں، یوں وقت جیسے تیسے کر کے گزر رہا تھا۔

گھر کی سادگی مگر خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، مریم کے ایک شاگرد نے گلاب کے پھولوں کو لمبی لڑیوں کی صورت پرو کر برآمدے میں لٹکا دیا تھا، جس سے پورا گھر بھینی بھینی خوشبو میں معطر تھا، مریم لائٹ لیمن کلر کے ہلکے کامدار سوٹ میں ملبوس، بالوں میں موتیے کے پھولوں کی لڑیاں اٹھکائے بے حد حسین لگ رہی تھی، اس کے چہرے میں بلا کی جاذبیت گھلی ہوئی تھی، وہ دلکشی و سادگی کا پیکر لگ رہی تھی، دل کی خوشی نے چہرے کی چمک کو دوگنا کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں مہمان بھی آ گئے، صالحہ، عالیہ اور احمد صاحب، سبھی خوش تھے، زوبیہ نے دل میں مریم نمکین حسن کے کھلے دل سے سراہا تھا، وہ بلا کی جاذبیت اور لاکھوں کی دلکشی کی مالک تھی۔

زوبیہ بھی اپنی منگنی کے سی گرین کامدار سوٹ، ہم رنگ پرل جیولری اور لائٹ میک اپ میں اپنی حسین کی چکا چوند سے دیکھنے والی آنکھ کو خیرہ کر رہی تھی۔

اماں نے مہمانوں کی اپنی حیثیت سے بڑھ کر تواضع و خدمت کی انہیں نہایت عزت و احترام سے برآمدے میں لگائی کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا، زوبیہ کی ذات میں اترے سناٹے اور سونا پن رفتہ رفتہ کم ہو گیا تھا، وہ عبدالاحد کو بھلانے کی سعی کر رہی تھی، اسے زندگی ضیاء کے سنگ بتانا تھی تو دل پوری ایمانداری سے اسے ہی سونپنا تھا، وہ خائن نہ تھی اسے یقین تھا کہ وہ ضیاء کی پر محبت و پروفا رفاقت میں آسودہ زندگی بسر کرے گی۔

عالیہ بھی خصوصی طور پر اسے تیار کروا کر ساتھ لائی تھیں تا کہ وہ اپنی ماضی کے گنبد سے باہر نکل کر حقیقت کا سامنا کرے، حقیقت کڑوی و تلخ ضرور ہوتی ہے مگر انسان اس سے نظریں نہیں چرا سکتا ہے، زوبیہ کافی بدل چکی تھی، اس نے والدین کے کہے کی لاج رکھ کر ان کا خود پر مان بڑھا دیا تھا۔

کولڈ ڈرنکس کے بعد کھانا پیش کیا گیا، کھانے سے فارغ ہونے تک عصر کا وقت ہو چکا تھا، عالیہ آج کل زوبیہ کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھیں انہیں جلدی واپس جانا تھا، رسم شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

''صالحہ! بہو کو انگوٹھی پہناؤ۔'' فاروق نے ڈائمنڈ رنگ، رنگ کیس سے نکال کر صالحہ کی طرف بڑھائی، صالحہ نے غائب دماغی سے رنگ پکڑی وہ خود میں مریم کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پا رہی تھی، مریم کو اندر کمرے میں تیار کر کے بٹھایا گیا تھا،

وہ اٹھ کر کمرے میں اماں کے ہمراہ چلی گئیں، مہمان بھی ان کے ساتھ تھے، مریم کی سہیلیاں اور سٹوڈنٹس جا چکی تھیں اب اس کے پاس صرف تین لڑکیاں موجود تھیں۔

مریم اور صالحہ کی نظریں ملیں تو صالحہ نے نظریں چرا لیں، وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھیں مریم انہیں مزید شرمندہ نہ کرنا چاہتی تھی اس نے مسکرا کر شرماتے ہوئے چہرہ جھکا لیا اور اپنے قریب صالحہ کے لئے جگہ بنائی صالحہ گم صم سی اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

مریم کے چند پل کا انتظار کر کے ان کے سامنے اپنا ہاتھ الٹا کر کے پھیلا دیا صالحہ ساکت رہ گئیں، مریم نے ان کا مان و بھرم رکھ لیا تھا اور انہیں شرمندہ نہ ہونے دیا تھا، مریم نے اپنا ظرف بڑا کر کے ان کا دل جیت لیا تھا، صالحہ کی آنکھوں میں مارے تشکر کے ہلکی نمی پھیل گئی۔

انہوں نے اس کی انگلی میں رنگ ڈال دی اور محبت و شفقت سے اسے خود سے لپٹا کر اس کا ماتھا چوم لیا، مریم دوسروں کا بھرم رکھنا جانتی تھی اور انسان بعض اوقات یونہی اپنی زندگی کی راہیں سہل بنا لیتا ہے، مریم نے بھی اپنی انا مار کر خود داری اور بھرم کا راستہ چنتے ہوئے صالحہ کے دل کو موم کر دیا تھا اور ان کے دل سے ملال ختم ہو گیا تھا، انہیں یقین تھا کہ مریم ان کے آنگن میں خوشیاں اور محبتیں بکھیر دے گی کہ اس لڑکی کو یہ ہنر آتا تھا، صالحہ کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

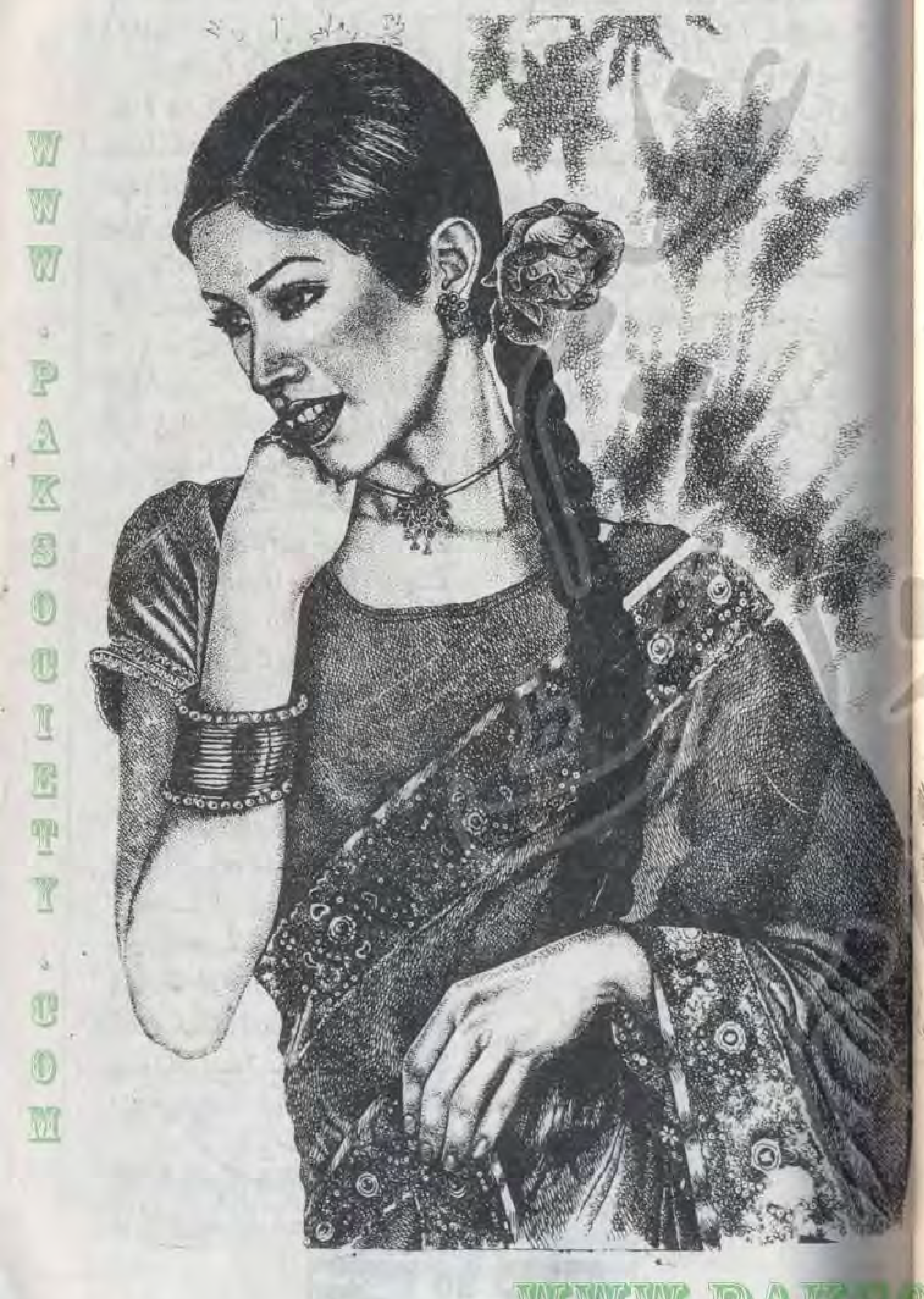

طلسم سردار

سمیرا حمید

یہ شہر سرگودھا ہے اور کہا کمال کی بات ہے کہ آگے پیچھے مالٹوں کے باغات ہیں اور ان باغات کے درمیان ایک پیارا سا گھر ایک چھوٹی سی حویلی اور اس حویلی میں رات کو جلدی سو جانے والے اور صبح دم اٹھ جانے والے لوگ آباد ہیں اور جیسا کہ ایسا کرنے والے ہی راتوں کو جلدی سو جانے والے کچھ کچھ سنت کے پابند اور فرائض میں کوتاہیوں سے پناہ مانگنے والے ہوتے ہیں، بہت ہی پیارے لوگ ہیں اور پیارے لوگوں کے بارے میں تو بہت کچھ ہی کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ کہا کافی ہو کہ وہ مالٹوں والی حویلی میں اتنے سارے لوگ اس طرح سے آباد ہیں کہ مالٹوں میں رس اور مٹھاس بڑھتا ہی جاتا ہے، خوشبو ہے کہ سارے میں پھیلتی ہی جاتی ہے، خاندان میں دوست احباب جنہیں چین و قرار نہیں وہ مالٹوں والی حویلی آن آباد ہوتا ہے،

حویلی میں بڑے بڑے کمرے ہیں، برآمدے ہیں، آگے پیچھے دائیں بائیں بہت بڑے احاطے ہیں، درخت گملے، پھول پودے بہت ہیں، پھل کے نام پر باغ کے باغ ہیں، دو دو تین تین دروازوں والے کمرے ہیں،

تازہ پالش، درختوں کی کانٹ چھانٹ، چند نئی چارپائیاں، بے شمار موڑھے، یہ احاطے کے لئے اور یہی شادی کے لئے، اس حویلی

مکمل ناول

میں عنقریب شادی ہونے والی تھی، جمال اور ہاشم کی۔

وہ دونوں تو ابھی آئے بھی نہیں جرمنی سے، تو یہاں حویلی میں رہنے والے اپنے یہاں آنے والوں کو پانی بعد میں پلاتے ہیں اپنے باغات کا فروٹ پہلے کھلاتے ہیں، گرمی یہاں قریب وجوار سے ہوکر حویلی جاتی ہے۔

جاڑوں میں حویلی اور آس پاس کے گھروں کے لڑکے شرطیں باندھ باندھ باغوں میں جاتے ہیں اور دور اندر درختوں کی ٹہنیوں پر اپنی ٹوپیاں، مفلر، دستانے یا موزے باندھ آتے ہیں اور اگلے دن صبح ہی جا کر دیکھتے ہیں کہ کون زیادہ آگے تک گیا۔

بعد کو تو یہ سب کھیل تماشہ ہی لگتا ہے لیکن سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں اس کم آبادی والے علاقے اور راتوں کو جلدی سو جانے والے لوگوں میں، رات گئے آوازوں کو دبائے، اندھیرے میں دھند میں، باغ کے اندر دوڑ کر جانا اور اکیلے جانا کوئی کھیل تماشہ نہیں تھا اور پھر جن جگہوں کے بارے میں آئے دن امیاں تائیاں، دادیاں کئی کئی قصے کہانیاں سنائی ہو اور جہاں انہوں نے ہر جن چڑیل، آسیب اور بد روح کو آباد کر رکھا ہو تو ایسے علاقے میں ایسے وقت جانا دوران جنگ دشمن کے علاقے میں گھس جانے سے کہیں بڑھ کر تھا، پھر واپسی پر کپکپاہٹ کو دباتا کہ ”نہیں میں نہیں ڈر رہا“ پھر یہ آٹھ، گیارہ، پندرہ سالوں کے لڑکے آوازیں دبا کر اپنے اپنے کمروں اور گھروں کو چلے جاتے۔

ذرا ٹھہریئے یہ سب ایک اور کام بھی کرتے ہیں، یہ صبح جلدی اٹھ کر باغ کی طرف بھاگتے ہیں اور کسی درخت کی آڑ میں چھپائے ٹوپی، دستانے یا مفلر کو وہاں سے نکال کر دور آگے تک بھاگ کر ٹہنی پر لٹکا آتے ہیں کہ دیکھو رات میں، میں کتنی آگے تک گیا تھا، ایک دو اتفاقوں میں سب ہی جان گئے ہیں کہ کبھی ڈرپوک صبح ہی نکلتے ہیں لیکن پھر بھی کھیل جاری ہے، اس کھیل میں کسی کا کوئی نقصان نہیں، کسی کا لین نہیں دین نہیں، آیۃ الکرسی پڑھتے وہ کسی قریبی درخت کے پاس چند منٹ کھڑے ہوکر واپس بھاگ جاتے ہیں۔

اس شہر، اس گھر، ان باغوں، ایسا بچپن گزارنا لطف ہے، شرط لگا کر سکول کو بھاگنا، رات دن بھٹے کھانا، مالٹے کے چھلکوں کو آنکھوں میں نچھوڑنا، آگ جلا کر گھیرا بنا کر بیٹھ جانا، آنے والوں مہمانوں کے ساتھ مالٹوں کے کریٹ بھیجنا اور ہر آئے گئے کا ہاتھ پکڑ پکڑ باغوں کی سیر کروانے والے، سادہ معصوم، پیارے سے لوگ، بہت خوش باش تھے، بیمار بھی ہو جاتے، غصہ بھی کرتے، لڑتے بھی، روتے بھی تھے اور پھر بھی خوش رہتے سکون سے رہتے۔

اب ایسے لوگ اب کہاں ہیں، جو کہتے ہیں ”ہاں جی کرم پاک ذات کا، میں خوش باش، سامنے آنے والا کہتا، سنا تمہاری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، دوکان جل گئی، لاکھوں کا نقصان ہوا۔“

”ہاں ٹوٹی تھی راڈ ڈلوالیا۔“

”دوکان کا کیا کیا؟“

”جس نے پہلے بنادی تھی وہ رب پھر بنا دے گا۔“

”چلنے میں تکلیف ہوتی ہوگی؟“

”بہت ہوتی ہے۔“

”ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟“

”ڈاکٹر کہتا ہے تکلیف جاتی رہے گی۔“

”چھ مہینے ہونے کو آلے کب جائے گی؟“

”کبھی تو چلی ہی جائے گی۔“

”تم سے تو نہ چلا جارہا ہے نہ بیٹھا، اتنی دیر سے کام بھی کر رہے ہو، اوہ کتنی تکلیف میں ہو تم؟“

”نہیں میں خوش ہوں۔“

تو ایسے ہی وہ سب لوگ خوش تھے، چڑیوں کی طرح چہلیں پہلیں کرتے، کبھی کوؤں کی طرح کائیں کائیں اف اتنا شور۔

آج کل یہ شور اس لئے بھی زیادہ تھا کہ لڑکیوں کے بعد پہلی بار لڑکوں کی شادیاں ہو رہی تھیں، سب نے خاص الخاص تیاریاں کی ہیں، جمال اور ہاشم دونوں سگے بھائی ہیں اور جرمنی سے آرہے ہیں، ہاشم بڑا ہے، پہلے وہ تین سال سویڈن میں کام کرتا رہا جرمنی گیا تو جمال کو بھی بلوالیا، ایک سال بعد انہیں ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی شادی کے لئے انہیں بمشکل چار ہفتوں کی چھٹی ملی تھی اور ان چار ہفتوں میں ہی انہیں پاکستان آنا تھا شادی کرنی تھی اور واپس جانا تھا۔

تایا جی نے دونوں کے لئے لڑکیاں پسند کرلی، دادی نے ہاں کہہ دی جرمنی میں انہیں بتایا اور انہوں نے مان لیا اور اب شادی کی تیاریاں ہو رہی تھی۔

دونوں لڑکیاں چچا زاد بہنیں ہیں، حریم تین بھائیوں کی اکلوتی چھوٹی بہن ہے اور رانیہ کے دو چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے یہ رانیہ کے گھر کی پہلی شادی ہے، جیسے مالٹوں والے چار خاندان ایک ہی حویلی میں رہتے تھے ایسے ہی حریم اور رانیہ بھی ایک ہی

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیئے

ابنِ انشاء

اردو کی آخری کتاب	1[illegible]5/-
خمار گندم	200/-
دنیا گول ہے	225/-
آوارہ گرد کی ڈائری	200/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	200/-
چلتے ہو تو چین کو چلئے	130/-
نگری نگری پھرا مسافر	[illegible]5/-
خط انشا جی کے	200/-
بستی کے اک کوچے میں	[illegible]
چاند نگر	165/-
دل وحشی	165/-
آپ سے کیا پردہ	250/-

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قواعد اردو	200/-
انتخاب کلام میر	60/-

ڈاکٹر سید عبداللہ

طیف نثر	160/-
طیف غزل	120/-
طیف اقبال	120/-

لاہور اکیڈمی، چوک اُردو بازار، لاہور

فون نمبرز: 7321690-7310797

گھر میں رہتے ہیں، جسے وہ لوگ تھے ایسے ہی یہ لوگ تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت خوش ہوتے ہیں، سانحات کا ان کی زندگی سے واسطہ نہیں ہے، ہر حال میں خوش رہنے والے۔

☆☆☆

مہندی والے دن وہ دونوں گھر آئے، رات میں مہندی ہوئی اور اگلے دن حویلی والوں نے لڑکی والوں کے یہاں مہندی لے کر جانا تھا اور اسی ٹولے نے جو باغ میں ٹوپیاں اور مفلر لٹکا آتے ہیں دونوں دلہوں کو تیار کرنا چاہا کہ ساتھ چلیں۔

"دونوں ایک دوسرے کی مہندی لے کر آنے کا بہانہ کر دیں۔"

ہاشم تو نہ مانا لیکن جمال تیار ہو گیا، یہ وہی جمال تھا کہ نو عمری میں تو بہت ہی بگڑ گیا تھا پھر پانچ وقت مسجد جانے لگا پھر ہاشم کا کہا مان لیا اور جرمنی چلا گیا اور جو قسم کھائی اس قسم پر قائم رہنے کے لئے سر توڑ کرتا رہا، سرمئی مائل تقریباً نہ نظر میں آنے والا محراب بھی تھا پیشانی پر۔

شال کندھوں پر ڈال کر وہ لڑکوں کی ٹولی میں جا بیٹھا ان کی الگ جیپ تھی جس پر وہ شور برپا کرتے گئے، ہاشم کی مہندی لے کر آئے جمال نے محفل لوٹ لی جیسے، اس کی آمد کی خبر ہوئی، لڑکیوں نے بھاگ بھاگ کر کل آنے والے دولہے کو آج رات ہی دیکھ لیا، خوب شور اٹھا۔

کمرے میں چند خواتین بھی تھیں تو دانیہ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف ننگے پیروں بھاگی اس نے پیلے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور پاؤں میں پازیبیں، اسے ایسے بھاگتے دیکھا تو خواتین خوب ہی ہنسی، چند لڑکیاں اسے تنگ کرنے کو اس کے پیچھے لپکی۔

وہ چھت پر آ گئی، چھت پر اندھیرا تھا اور اوپر کھڑے پیچھے سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا سامنے پھاٹک میں دو سفید سجی سجائی گھوڑیوں کے درمیان اس نے جمال کو بھنگڑے ڈالتے دیکھ لیا، وہ اس کا دولہا تھا اور اسے کل بارات لے کر آنا تھا لیکن وہ آج ہی آ گیا تھا اور اوپر سے اسے دیکھتے دانیہ کا دل چاہا کہ بھاگ کر پہنچ جائے اور اس پر پھول برسائے، بڑھ کر اس کا استقبال کرے، تھوڑا سا جھکے اور اس کے پاؤں چھو لے اور بس اتنی سی ہی دیر لگتی ہے عورت کو مرد کی داسی بننے میں اور وہ بہت شوق سے بنتی ہے، آس پاس کھڑی سہیلیاں دانیہ کو تنگ کر رہی تھیں اور دانیہ مسکرائے جا رہی تھیں۔

"یہ تو تصویر سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔" ایک نے کہا۔

"خدا بچائے اس پر تو میرا دل آ رہا ہے۔" اس کی چھبیلی بولی دانیہ دل لگا کر ہنسی۔

"میں نے دولہا بھائی کو بتاؤں گی کہ تم کیسے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھتی رہی ہو۔" خالہ زاد نے ساتھ چٹکی بھری اس کی کمر پر۔

کہاں کی مہندی اور کیسی مہندی سب دولہے کے واری صدقے ہونے لگے، حریم اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی پہلے تو مہندی لانے والوں کو دیکھتی رہی پھر، پھر اس کی نظریں جمال پر ٹک گئیں اور وہ جامد کھڑی اسے ہی دیکھتی رہی دانیہ کے دولہا کو، وہ یہ بھول گئی کہ آج اس کی بھی مہندی ہے اور کل اس کی بارات آنی ہے، جس پر اس نے نظریں ٹکی ہیں وہ اس کا دیور ہے اور بس، بہت برا ہوا

لیکن ایسا ہی ہوا، اس نے کھڑے کھڑے خود کو فراموش کر دیا آہستہ آہستہ سب اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزر کر پنڈال کی طرف جانے لگے، دانیہ کو اوپر ہی روک لیا گیا اور صرف حریم کو نیچے لے آئے، خواتین اپنی رسمیں کرنے لگیں۔

رشتے کی ایک بھابھی جمال کو گھسیٹ کر لے گئی کہ اپنی بھابھی کو مہندی لگاؤ، دلہن کا گھونگھٹ ناک سے نیچے تک تھا ذرا دور سے جمال کو آتے دیکھا تو جیسے ہی وہ چار قدم پر آیا حریم نے گھونگھٹ کو بائیں ہاتھ سے اٹھایا سر کو دائیں طرف خم دیا، اس کا یہ خم اور گھونگھٹ کو ایسے اٹھانا، جمال نے اس کی سمت دیکھا دونوں کی نظریں ایک ہوئیں۔

پھر......؟

پھر بہت ہمت سے قدم اٹھا کر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھا، حریم کا گھونگھٹ نیچے آ چکا تھا اسے دبی دبی ڈانٹ پڑی تھی، وہ اس کے دائیں طرف آ کر بیٹھ گیا اور سبز گوٹا لگے پیلے باریک شیفون کے دوپٹے کے اس پار سے ان کی نظریں کئی بار اس کی طرف اٹھیں جمال کی بہن نے کہا کہ وہ تھوڑی سی مہندی سامنے رکھے تھال میں سے لے کر اس کی ہتھیلی پر رکھے سبز پتے پر لگا دے، اس نے ایسا ہی کیا اور جب اس کی انگلی اس کی ہتھیلی پر رکھے سبز پتے پر لگی تو حریم نے جیسے مٹھی بند کر لی اور فوراً کھول لی۔

جیسے تیسے جمال نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر کر نوٹ سامنے رکھے تھال میں رکھ دیئے۔

اس کی بہن کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"ہزار ہزار کے اتنے روپے۔"

جمال اٹھ کر دور اپنی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا، وہ سامنے دیکھتا رہا، فاصلہ زیادہ نہیں تھا وہاں سے بھی اسے ہی دیکھا جا رہا تھا، پھر......؟

پھر بس اتنا کہ وہ اس لڑکی کے قدموں تلے اپنا دل چھوڑ آیا تھا، یکدم سارے مزے ہوا ہوئے، ساری خوشی کافور ہوئی، وہ پیاس جو پانی کی نہیں ہوتی اس کے اندر جاگی، اندر باہر سے وہ خشک تر ہو گیا اور کلانچ بھر کر اڑا لے جانے کی جو خواہش ہوتی ہے اس سے وہ آشنا ہوا، معشوق کو اڑا لے جانے کی۔

پنڈال کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی سے دانیہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ ہاشم کی دلہن کو دیکھ رہا تھا، ہاشم کی دلہن دانیہ کے دولہا کو دیکھ رہی تھی۔

ایک پل پھیل کر بہت سے پل بن گیا اور حد پھلانگی گئی۔

☆☆☆

دونوں کو جرمنی میں تصویریں بھیجی گئی تھیں اس کی ضرورت تو نہیں تھی نا ہی انہوں نے کہا تھا لیکن دادی نے کہا کہ نہیں نیا زمانہ ہے بعد میں کوئی بات نہ رہ جائے، اس نے حریم کو کئی بار تصویر میں دیکھا تھا، پھر اب اسے کیا ہوا، یہ تو وہ تصویر والی حریم ہی نہیں تھی، یہ تو...... یہ تو اب وہ تھی جو اسے چاہیے تھی۔

اگر صنف مخالف میں کشش کے نام پر ایک مقناطیس فٹ ہوتا ہے تو حریم میں اس کشش کا پہاڑ تھا۔

رات گزر گئی وہ حویلی کے احاطے اور پھر مالٹوں کے باغ کی طرف نکل گیا، وہ باغ میں چکر کاٹنے لگا، شدید سردی کا احساس جاتا رہا، شال جو دائیں کاندھے پر تھی اور زمین چھو رہی

تھی تھوڑی ہی دیر میں وہ نیچے جا گرے گی اور اسے معلوم بھی نہیں ہوگا، اگر اسے کوئی وہاں ایسے دیکھ لیتا خاص کر گھر کی کوئی عورت تو کہتی ضرور ہی اسے کوئی بلا چمٹ چکی ہوگی، کوئی سایہ ہو گیا ہوگا کوئی چڑیل پیچھے پیچھے ہوگی، دادی نے پیتل کا چھلا دیا تھا اسے انگلی میں پہن کر رکھنے کے لئے کہ حویلی سے باہر اگر جانا ہی پڑے تو...... دادی کے سامنے اس نے چھلا انگلی میں پہن لیا تھا بعد کو وہ جیب میں تھا، پھر وہ نہ جانے کہاں گیا، اب اس کے پاس نہیں تھا، سایہ تو اسے ہو ہی گیا تھا حریم کا۔

فجر کے وقت حویلی میں جا کر وہ بڑے کمرے کے پاس سے گزرا یہاں سب خواتین سو رہی تھیں کارپٹ پر بستر لگائیں، اس نے دروازہ کھول کر لائٹ جلائی۔

وہ آپا کو ڈھونڈ رہا تھا وہ اسے کونے میں نظر آ گئیں۔

”آپا مجھے آپ کا فون چاہیے میرا مل نہیں رہا۔“

”باورچی خانے میں فریج کے اوپر دیکھ لو۔“ آپا نے نیند کی حالت میں جواب دیا، اس نے بتی گل کی اور جا کر فریج کے اوپر سے فون اٹھا لیا، اس کا اندازہ ٹھیک ہی تھا حریم اور دانیہ کے نمبرز موجود تھے اس میں اس نے حریم کا نمبر اپنے فون میں محفوظ کر لیا۔

حویلی میں سب نماز کے لئے اٹھ رہے تھے وہ پھر سے چھپ کر باغ میں آ گیا، دس بار اس نے نمبر ملایا اور درمیان میں ہی بند کر دیا پھر اس نے میسج لکھا۔

”میں جمال......“ بس اتنا ہی اور جواب میں فوری کال آنے لگی، اس نے فون اٹھایا تو کچھ بول ہی نہ سکا، بہت دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔

”میں ساری رات سو نہیں سکی۔“ بات کی ابتدا حریم نے کی تو جمال نے بھی انتہا کر دی تین چار منٹ تک وہ اسے اپنی سوچیں گن گن کر سناتا رہا، اتنے میں آہٹ ہوئی تو حریم کو فوراً فون بند کرنا پڑا اور پھر دوبارہ اس سے بات نہ ہو سکی وہ ہیلو ہی کرتی اور کوئی نہ کوئی آ جاتا یا اسے آواز دے لی جاتی، تفصیل سے بات ہوئی یا نہیں ہوئی دونوں کو معلوم تھا کہ ان دونوں کے درمیان کیا ہے۔

☆☆☆

سردیوں کا موسم تھا تو بارات دن کی ہی تھی، ہاشم بہت چہک رہا تھا، مسجد سے نماز پڑھ کر آیا تھا سب کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا اور خواتین کے ساتھ مل کر کام بھی کروایا، سب کے کپڑے نکلوا کر دیکھے، ان کے جوتے ان کے زیور، وہ کیسے تیار ہونگی، کیسے بال بنائیں گی، وہ تقریباً سبھی سے پوچھ رہا تھا، ان دونوں کے کمرے سجائے جا رہے تھے۔

سب خواتین ہاشم کو بہت پسند کرتیں تھیں، خالہ جی، مامی جی، چچی جان کے بالوں میں گجرے بھی لگا دیتا، چوڑیاں موٹی کلائیوں میں چڑھا دیتا، خواتین خود تیار ہوئی رہتیں اور اس کے حوالے ننھی منی پریاں کرتیں جاتیں اور وہ ان کے بال بناتا، جوتے پہناتا، لب گلوز لگا دیتا، مسکارا اور کاجل بھی لگا دیتا اور تیار کر کر کے انہیں ایک طرف بٹھاتا جاتا، خود اپنے تیار ہونے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

برآمدے سے گزر کر وہ اوپر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ اس نے دور باغ میں جمال کو ٹہلتے دیکھا ذرا رک کر اس نے اسے آواز دی۔

”او جمال...... یارا تیار نہیں ہونا۔“ جمال نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ آتا ہوں، ہاشم کمرے میں چلا گیا۔

دونوں بارات لے کر لڑکی والوں کے گھر آ گئے، دونوں بھائی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

خاندانی رواج تھا تو دونوں دلہنوں نے ناک سے نیچے تک گھونگھٹ کیا ہوا تھا، ہاتھوں کی مہندی چوڑیاں سب نظر آ رہا تھا باقی کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور دلہن کے روپ کے بارے میں اندازہ لگانا کون سا مشکل ہے، اسی حسن کا اندازہ لگا کر جمال کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر بھاگ جائے اسے جو اس کے بھائی کے نکاح کی حد میں اس کے لئے نامحرم تھی۔

جمال نے ایک بھی بار اپنے ساتھ بیٹھی دلہن کی طرف نہ دیکھا، جب وہ لوگ گھر آئے تو دلہن لہنگے میں الجھ کر گر نہ جائے ہاشم نے اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑ لیا اور دلہن نے ہاتھ چھڑوا لیا، ہاشم مسکراہٹ دباتا رہا۔

☆☆☆

ہاشم اور جمال کے دوست احاطے میں آگ جلائے بیٹھے تھے ابھی عشاء کا ہی وقت ہوا تھا اور کسی کے جانے کا ارادہ نہیں تھا وہ طرح طرح کے مذاق کر رہے تھے کسی کسی بات پر وہ آوازیں دبا لیتے اور پھر آسمان کو چھوتے ان کے قہقہے بلند ہوئے، دونوں دلہنیں اپنے اپنے کمروں میں تھیں، رات کا کھانا وہ سب کھا چکے تھے۔

ان سب کے لئے اندر سے ایک بار پھر سبز چائے بن کر آئی تو جمال خالی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر اوپر آ گیا، دروازہ کھول کر وہ اندر چلا گیا، حریم کھڑکی کی طرف رخ کیے موٹے پردے کا ذرا سا کونا اٹھا کر باہر دیکھ رہی تھی، دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ چونکی لیکن پلٹی نہیں، جمال دبے پاؤں چلتا عین اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اس کا گھونگھٹ اٹھا ہوا تھا اور وہ۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ یکدم اچانک سے اس کی تایا زاد ہاتھ میں ٹرے لئے اندر آئی، جمال خوف سے کانپ کر رہ گیا۔

”میں ہاشم کی دلہن کو منہ دکھائی دینے آیا تھا آپا۔“

”بھابھی نہیں کہا جاتا تم سے، بہت جلدی ہے تمہیں منہ دکھائی دینے کی جب سب دے رہے تھے تب تو تم نے نہ دی، ہاشم نے دانیہ کو سونے کی انگوٹھی دی تم نے کچھ نہیں دیا، اب آ گئے۔“ مسکراہٹ روکنے کے لئے حریم نے ہونٹ کا کونا دبایا، جمال نے جلدی سے پیسے نکال کر حریم کے آگے کیے، حریم نے پیسے پکڑ لیے اور جب باہر نکلنے سے پہلے وہ پلٹا تو اس نے حریم کو ان روپوں کو ہونٹوں تک لے جاتے دیکھا۔

ایک کی بیوی دوسری کا شوہر، انسان کی حدیں پھلانگتیں کی حد آخر کہاں ختم ہو گی، ہو گی بھی کہ نہیں۔

☆☆☆

ولیمہ ہو گیا، ایک دن، دو دن، تین دن، مہمان رخصت ہونے لگے اور سبھی نے محسوس کیا کہ جمال کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، ٹوہ لینے والے لوگ نہیں تھے، فکر مند ہی ہوئے خلش سی رہی کہ کچھ ادھورا رہ گیا ہے اور کیا؟ وہ نہیں جان سکتے تھے۔

چند اور دن گزرے محسوس کیا کہ جمال جیسے سانس روکے سانس لے رہا ہے، نکلتا بھی نہیں اور نگلتا بھی نہیں، نہ بیٹھتا ہے نہ بولتا، کوئی روک کر پوچھ لے تو اس کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے، ایسے چلتا ہے جیسے آنکھوں پر پٹی بند بھی ہو یا بینائی آخری نقطے پر جا پہنچی ہو، ایک ایک کر کے سبھی مہمان رخصت ہو گئے صرف تایا جی کی تین شادی شدہ بیٹیاں ان کی دو شادی شدہ بہنیں، پھوپھی اور پھوپھی زاد تین بہنیں اور ایک بھائی ہی رہ گئے مہمان کے نام پر۔

☆☆☆

دسمبر کے شروع کے دن تھے تو سب دھوپ میں بیٹھے تھے، جمال پاؤں پٹخ پٹخ کر چل رہا تھا۔

''اسے کیا پریشانی ہے؟'' دادی نے اپنے بڑے بیٹے کے کان میں سرگوشی کی ساتھ ہی بڑی بہو کو اشارہ کیا کہ جمال کی طرف دیکھو، دوسری طرف باورچی خانے میں کام کرتی جمال کی بڑی بہن نے بھی تایا زاد بہن سے سرگوشی میں پوچھا۔

''کیسی دلہنیں ہیں یہ آپا، خوش ہو کر نہیں دکھاتیں۔''

''دانیہ تو ایسے لگتا ہے جیسے روتی رہتی ہے۔'' تایا زاد بلقیس نے کہا۔

''توبہ...... توبہ اماں تو برا مان جاتیں ہیں اور وہ حریم تو ایسے جیسے شکار کرنے نکلی ہو، اماں کہتی ہیں بھابیوں پر فقرے نہیں کستے، یہ فقرہ ہوا بھلا۔''

''جمال!'' جمال تیز تیز باغ کی طرف جا رہا تھا کہ دادی نے آواز دے کر روکا۔

''پتر جمال میں اب یہ پوچھوں کہ بیوی سے ان بن ہوئی ہے یا یہ کہ اسے میکے جانا ہے اور تو اسے جانے نہیں دے رہا۔'' دادی نے تو بس اسے ہنسانا چاہا تھا لیکن وہ ہنسا نہیں۔

جمال نے ایک نظر احاطے پر ڈالی، سبھی دھوپ میں ایسے ذوق و شوق سے بیٹھے تھے جیسے انٹار کٹکا سے آئیں ہو اور دھوپ کبھی نہ دیکھی ہو اور آج پہلی اور آخری بار ہی یہ موقعہ ملا ہو، ذرا فاصلے پر ہاشم کھڑا دو چھوٹے لڑکوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بنائی گئی پتنگ اڑا رہا تھا، دونوں لڑکے اس سے ڈور لے کر خود پتنگ اڑانا چاہ رہے تھے اور وہ اچھل اچھل کر ڈور اچک لینا چاہتے تھے لیکن ہاشم ہنستا ہوا ڈور والا ہاتھ اور اوپر کر لیتا، جمال کی نظر اس پر آ کر تھمی۔

''میں خود اس بد ذات کو میکے دفعان کروں گا۔'' وہ اتنی قوت سے چلایا کہ ڈور کھینچتے ہاشم کے ہاتھ رک گئے اور اس نے ذرا دور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف حیرت سے دیکھا، ڈور پھینکی کہ چھوڑی کہ پھسلی، وہ لپک کر ان سب کی طرف آیا۔

آواز اتنی ہی اونچی تھی کہ باورچی خانے میں کام کرنے والیوں نے سنی کام چھوڑ کر باہر کو لپکی اور جو جمال کے پاس ادھر ادھر مختلف نشستوں پر بیٹھے تھے وہ ایسے ہو گئے گویا آسمانی بجلی ان کے عین سامنے گری ہو اور ان کے کان بہرے ہو گئے ہوں اور آنکھوں سے کچھ دکھائی نہ دیتا ہو، کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا کہتے ہو، اپنا انداز اور آواز تو دیکھو، یہ تو دیکھو کن کے سامنے کہتے ہو اور یہ بھی کہ کس کے بارے میں کہتے ہو، وجہ کیا ہے، دراصل بد ذات کے لفظ نے سارے کے سارے خاندان کو جھنجھا کے رکھ دیا تھا، اتنے پیارے لوگ تھے کیسے ان کے گھر کا جوان بیٹا ان کی بہو کو بد ذات کہہ رہا تھا۔

''جمال!'' دادی اتنا ہی کہہ سکی۔

''کیا کہتے ہو؟'' تایا جی بے چارے اس کے انداز سے ڈر سے گئے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' اس کے ابا جی ذرا غصے سے بولے۔

''سچ کو بکواس کہہ رہے ہیں، دیکھتے نہیں، میرا کیا حال ہو گیا ہے۔''

سب چارپائیوں پر، موڑھوں پر، کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ اکیلا ہی کھڑا تھا ان کے درمیان میں، ذرا فاصلے پر چودہ سالہ جمشید مالٹے کا رس نکال رہا تھا، اس کا ہاتھ گول گول گھومتے دستے پر تھا اور اس کی آواز پر وہیں رک گیا تھا، مشین کی طرف دیکھتے بچے اب گردنیں گھوما کر جمال کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' جمال کی اماں اٹھ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں، جمال ہاشم کو گھورنے لگا جو اسی کی طرف تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

''میں مر جاؤں گا۔'' اس بار وہ رونے پیٹنے والی حالت میں، پہلے سے زیادہ شدت سے چلایا، بچے ڈر کر رونے کے قریب ہو گئے، جو پہلی بات پر حیران تھے اس پر دھک سے رہ گئے، اندر کمروں میں موجود باقی ماندہ خواتین بھی باہر نکل آئیں،، جمال کی حالت جمال کا انداز، تایا جی چھوٹے چچا گھبرا کر اٹھے، بہنیں اس کی طرف بڑھیں۔

''چھوڑو مجھے۔'' اس نے خود سے پرے کیا۔

''دانیہ سے کوئی بات ہوئی ہے، لڑے ہو۔'' بہن نرگس نے پوچھا۔

''میں اس پر تھوکتا بھی نہیں۔'' اس بات نے پچھلی ساری بات کو راکھ کیا اور ایک نئی ہی آگ لگائی، تایا، چچا، دادی، اماں ابا سب دنگ رہ گئے، دس دن ہوئے تھے شادی کو اور وہ اپنی دلہن پر تھوکنا بھی نہیں چاہتا تھا، جمال کتنا بھی پیارا تھا انہیں لیکن اپنے گھر کی بہو کے لئے ان الفاظ پر ان کا خون کھول اٹھا۔

''جمال زبان سنبھال پتر، بیٹھ کر بات کر یہ بازاری زبان یہاں کسی کے لئے بھی نہیں چلے گی۔'' دادی بھی ذرا اونچا ہی بولی۔

ایک ایسی بات جو کہی نہیں جانی چاہیے تھی، ایک ایسی بات جو سنی نہیں جانی چاہیے تھی، کہی بھی گئی اور سنی بھی گئی۔

مالٹے کے رس کا جگ بھرا ہی رکھا رہا، سارے بچے جو منت اور ڈانٹ سے بھی اپنا شور کم نہیں کرتے تھے سہم کر گونگے سے بن گئے۔

''جمال پتر!'' دادی کی آواز صدمے نے کھا لی، آواز ایسے نکلی جیسے بستر مرگ پر آخری سانسیں لے رہیں ہو۔

باہر کی صورت حال ایسی تھی تو حریم اور دانیہ بھی برآمدے سے ادھر ان کی طرف دیکھ رہیں تھیں، پہلے وہ دونوں اندر تھیں اب برآمدے تک آ چکی تھیں، لیکن باہر ان سب کی طرف نہیں آ رہیں تھیں دانیہ کو معلوم نہیں تھا کہ جمال نے کیا کہا ہے خاص کر اسے دفعان کرنے کی بات۔

''کیا سنے گے آپ، سن لیں گے سب، مجھے میری بیوی کے ساتھ نہیں رہنا میں اسے چھوڑ رہا ہوں۔''

دانیہ نے حقارت سے کہی گئی یہ بات

اپنے ہی لئے سنی تو ایک قدم ڈگمگا گئی اس کے ہاتھوں پر ابھی بھی مہندی کا رنگ مدھم مدھم موجود تھا اس نے گہرے سبز رنگ کا سوٹ پہنا تھا جس پر سنہرا ہاتھ کا کام جھلملا رہا تھا بڑوں کے خیال سے اس نے سبز پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اس سب کے باوجود بھی وہ نئی نویلی دلہن نہیں لگ رہی تھی اسے دیکھ کر ایسے ہی لگتا تھا جیسے راستہ گم کر بیٹھی ہو اور اب ویرانے میں رو رہی ہو۔

"میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔" وہ چلایا۔

راستہ گم کر چکی اور ویرانے میں رونے والی نے بے یقینی سے یہ جملہ سنا جیسے اجنبی زبان میں کوئی فتویٰ دے رہا ہو، الفاظ کی تو سمجھ نہیں آ رہی لیکن فتویٰ یقیناً منہ پر کالک سے متعلق تھا، سنگسار کئے سے متعلق۔

دانیہ برآمدے سے تیزی سے نکل کر ان سب کی طرف آئی۔

سب نے اسے دیکھا اور سوچا وہ کیوں آئی باہر اندر ہی رہتی کہیں، جمال تو جانے پاگل ہو گیا ہے، ایسی باتیں سنے گی تو باقی زندگی کیسے گزارے گی اس کے ساتھ، وہ کیوں آئی آخر۔

دانیہ نے اپنی ساس کی طرف دیکھا اور آنکھوں کو ایسے سمیٹا جیسے کہہ رہی ہو آپ کا بیٹا......اور......آپ کچھ کہتیں کیوں نہیں۔

"پتر جمال چل آ ادھر میرے ساتھ، چل ہم کہیں چل کر بات کرتے ہیں، چلو بھئی جاؤ یہاں سے سب۔" جانا چھوڑ کر کوئی وہاں سے ہلنے کو تیار نہیں تھا، تایا جی نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور ایک ہاتھ سے سب کو جانے کا اشارہ کیا۔

دانیہ قریب آ کھڑی ہوئی تھی وہ بہت شرمندہ ہوئے تھے، بچی کیسے اس بات سے اجڑ سی گئی تھی، دس دن میں کیسا بھی اختلاف ہو طلاق دینے جتنا بڑا اختلاف نہیں ہو سکتا۔

جنہیں جانے کا اشارہ کیا تھا ان میں ذرا سی ہی جنبش ہوئی تھی، جمال تو ایسے نظر آ رہا تھا جیسے سانپوں کے بل میں منہ دے کر اتنے ڈنگ ڈسوا لئے ہیں کہ اب خود ڈسنے لائق ہو چکا ہو۔

"میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔" جمال نے تایا جی کا لحاظ نہ کیا اور سب کو سنانے کے لئے اعلانیہ ہی کہا۔

"آؤ کہیں بیٹھ کر بات کریں۔" تایا جی بضد تھے، باقی سب تمنائی تھے کہ وہ تایا جی کے ساتھ چلا جائے، ایسے اس اپنی باتوں کے طبل نہ بجائے۔

"کیوں دیں گے مجھے طلاق۔" دانیہ نے دوبار لفظ طلاق سنا اسے غصہ بھی بہت آیا اور اس میں عزت بھی جاگی۔

"نسرین بہو کو اندر لے جاؤ۔" تایا جی نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تم میر ساتھ آؤ جمال۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھیے ورنہ بہت کچھ ہو جائے گا، یہ طلاق لے کر ابھی نکلے گی یہاں سے، میں ساری عمر اس گھر کی ہاشم کی شکل نہیں دیکھوں گا۔"

جو عورتیں جو بچے باقی ماندہ دوسرے لوگ تایا جی کے جانے کے کہنے سے، ان سے ڈر کر، چند قدم، ذرا سا آگے، برآمدے کی طرف بڑھے تھے، باقی سب کی طرف اپنی پشت کیے، وہ سب کے سب سمجھ والے، عقل والے، کم عقل، زناٹے سے ایسے پلٹے جیسے عین ان کی پشتوں پر زور دار ہنٹر پڑے ہو، طلاق کا قصہ، دانیہ کی بات، جمال کا غصہ، ایک طرف اور اب...... یہاں اس سب میں، ہاشم کا نام، ہاشم وہ بے چارے اتنا سہم گیا کہ اس کا جی چاہا کہ سرپٹ وہاں سے بھاگ جائیں اب نہ جانے آگے کیا ہو جائے گا کہہ دیا جائے، ہاشم لپک کر اس کی طرف جانا چاہتا تھا، چیخ کر پوچھنا چاہتا تھا۔

"میرا نام...... میرا نام کیوں...... تمہارے تذکرے میں میرا تذکرہ کیسے؟" لیکن اپنی جگہ سے ہل کر پوچھ نہ سکا۔

"ہاشم!" تایا جی ذرا سی اونچی سرگوشی کی جسے پوچھ رہے ہوں۔

"اپنے ہی ہاشم کی بات کر رہے ہو نا حویلی کے بڑے بیٹے اور اپنے بڑے بھائی کی...... یا...... یا...... دراصل تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو اور میں کچھ اور سن رہا ہوں۔"

"جی ہاں ہاشم۔" جمال نے عین ان کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اس نے ایک اور بات کی۔

"ہاشم اور دانیہ......"

"کالی جادو گرنی، ہرے بھرے درختوں...... باغات...... کھیت کھلیان کو ایک نظر بد سے...... جلا کر...... اجاڑ کر...... ویران کر دیتی ہیں، ٹھیک ایسا ہی کالا جادو "ہاشم اور دانیہ" کے ناموں کے آگے پیچھے نکلنے سے چلا اور وہ چل کر اجڑ کر ویران ہو گئے۔

زیادہ دیر نہیں لگی اور دسمبر کے دنوں میں وہ پسینے سے بھیگ گئے، دادی جی کو لگا کہ مرنے میں انہوں نے بہت دیر کر دی، بات کچھ ایسی تھی کہ بچے تک ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"کتے ہوش میں ہے تو۔" ہاشم جمال پر جھپٹا، اس کا گریبان گھسیٹا۔

انسان ہونے کی ساری یادداشت دانیہ کے دماغ سے نکل گئی، وہ کھڑی کی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

تایا جی...... چچا جی نے جلدی سے آگے بڑھ کر جمال اور ہاشم کو الگ الگ کیا، ہاشم بری طرح سے ہانپ رہا تھا گالیاں بھی دے رہا تھا، دادی...... تائی جی...... دوسری چند اونچی آواز سے رونے لگیں تھیں۔

"ہاشم کو اندر لے کر جاؤ۔" تایا جی چلائے، بہنیں رونا بھول کر ہاشم کی طرف لپکی، بچے انہیں ایسے لڑتے دیکھ کر رونے لگے، ماؤں نے ایک نظر بھی اپنے بچوں کی طرف نہ دیکھا کہ کیوں روئے ہیں، وہاں خارجی آوازوں کا گلا گھونٹا جا چکا تھا، وہاں ہاشم اور دانیہ کی آواز گونج رہی تھی۔

"نہیں جاؤں گا میں۔" اس نے اپنا ہاتھ جھٹکا۔

"اس ذلیل انسان نے کہا کیا ہے، تایا جی۔" ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، تایا جی بے چارے خود رو دینے کے قریب تھے۔

"سچ کہا ہے۔" جمال چلایا جیسا کہ اسے چلانا ہی تھا۔

"کیا سچ ہے، بتا کیا سچ ہے، کیا کہا ہانک رہا ہے معلوم بھی ہے، ایسی پاگلوں جیسی تیری حالت بہت پہلے بھی ہوئی تھی، پاگل ہو گیا تھا تو۔"

"اب تو......تو مجھے پاگل ہی کہے گا نا، تجھے اور دانیہ کو ساتھ جو دیکھ لیا۔" بات بگاڑ کی طرف ہی جا رہی تھی۔

اماں نے جھٹ آگے بڑھ کر ایک زور دار تھپڑ جمال کے گال پر رکھا اور وہ اس کا گریبان جھنجھوڑنے لگیں، دانیہ چکرا کر گری، جو ذرا ہوش میں تھیں وہ اس کی طرف لپکیں۔

''کہا تھا، میرا منہ نہ کھلواؤ، نکالو اس گند کو باہر۔'' اماں کو جھٹکے سے پرے کر کے وہ پھر چلایا۔

اتنی بڑی بات کے لئے تیار تو کوئی بھی نہیں ہوتا اور اتنی بڑی بات کے لئے تیار ہو کر بھی وہ تباہ ہی ہوئے، تباہیوں کا آغاز ایسے ہی ہوتا ہے، وہاں موجود ہر شخص، بچے تک اس الزام کے گواہ بن گئے۔

ایک طرف ہاشم کو گھسیٹ کر اندر لے جایا جا رہا تھا، ایک طرف دانیہ پر چند لڑکیاں جھکی تھیں جو زمین پر ہی ڈھیر ہو گئیں تھی دوپٹہ سر سے اتر کر زمین پر پھیل گیا تھا اور ادھر تایا، چچا سب جمال کو چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے، سنائی تو دے رہا تھا لیکن سجھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔

''جمال ہوش کر۔'' کئی ایک آوازیں ادھر ادھر سے مل کر آئیں۔

''ابھی بھی میں ہوش میں نہیں ہونگا، میں نے خود دو بار انہیں باغ میں دیکھا......''

''ذلیل انسان۔'' ہاشم دھاڑا۔

''خانہ خراب شرم کر۔''

''تجھے شرم نہ آئی، کل رات تایا جی میں فرقان سے ملنے گیا تھا، کمرے میں آیا تو یہ کمرے میں موجود نہیں تھی دو بار پہلے بھی دیکھ ہی چکا تھا اور پھر کل......'' وہاں موجود سارے بوڑھے، سارے جوان اور سارے ہی پانی پانی ہو گئے، دادی کی آنکھوں کے آگے تو اتنی دھند چھائی کہ انہیں نظر آنا ہی بند ہو گیا سہارے کے لئے کسی کو ٹٹولتیں وہ زمین پر ہی گر گئیں اور کوئی انہیں اٹھانے کو لپکا بھی نہ، وہ خود گرے کھڑے تھے۔

دانیہ آنکھیں کھولے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی، اس بات پر وہ زمین پر ہاتھ ٹکا کر اٹھی، دوپٹہ جو اس کے وجود کے سہارے پڑا تھا اب زمین کے سہارے پڑا رہ گیا۔

''جمال کچھ خدا کا خوف کریں، کیا کہہ رہیں ہیں۔'' اس نے ہاتھ نہیں جوڑے تھے لیکن انداز وہی تھا پاؤں نہیں پکڑے تھے لیکن جھکاؤ وہی تھا، وہ بے چاری ہمیشہ سے ہی بہت ڈرپوک تھی۔

''باغ کی طرف جاتے تم نے خدا کا خوف کیا تھا بے غیرت عورت۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔'' ہاشم چلایا۔

''کل رات میں اپنے کمرے میں تھا، تایا جی، ابا جی، یہ تو پاگل ہو گیا ہے، کیا ہو گیا ہے اسے، کیا کیا بک رہا ہے، اپنے سگے بھائی پر الزام لگا رہا ہے، مجھ پر وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ۔'' وہ بے چارہ رو دینے والا، بین کرنے والا، دوہتڑ مارنے والا مرد بن گیا، دہائی دینے والا فریادی اور......اور۔

''جھوٹ تو تو بک رہا ہے۔''

''اتنی بڑی تہمت۔''

''تیری کرتوت ہے یہ۔''

''حریم!'' ہاشم دادی کے قریب زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور گردن موڑ کر آواز دی، حریم بھی اسی مجمعے میں کھڑی تھی، سر پر دوپٹہ لے کر ایک ہاتھ میں اس کا پلو پکڑے۔

''بتا سب کو، کل میں کہاں تھا، ہر رات کہاں رہا، میں تو کمرے سے نکلا ہی نہیں کل رات، کھانا کھاتے ہی کمرے میں چلا گیا، سر میں درد تھا دو گولیاں کھا کر سو گیا۔''

سب حریم کی طرف دیکھنے لگے، ایک سے ایک منظر بدل رہا تھا اور ایک سے ایک بڑھ کر تھا، ایک سے ایک قیامت خیز تھا، وہاں موجود کوئی بھی شخص جمال کے لگائے اس الزام سے متفق ایسے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، ان سب کے عین پیچھے دور تک باغ پھیلا پڑا تھا، ان کے آگے سارا خاندان کھڑا تھا، تو ایسے اس طرح یہ باتیں ہوتیں ہیں، سب کو سانپ سونگھ گیا۔

زمین پھٹے تو گردنیں جھکا کر کبھی دیکھ ہی لیتے ہیں کہ پھٹی زمین میں ہے کیا، وہ سب تو وہ لوگ بھی نہ تھے اور ایسا کچھ ان میں سے کوئی دیکھ بھی لیتا تو سرِ عام یہ تماشہ کبھی نہ لگنے دیتا، ایسے تماشوں کو انجام اتنا کربناک ہوتا ہے کہ وہ صرف انجام نہیں رہتا۔

وہ بے چارے خدا کی پناہ بھی نہ مانگ سکے دل میں۔

''پوچھیے اس سے تایا جی۔'' ہاشم حریم کا ہاتھ پکڑ کر آگے لایا، نہ چاہتے ہوئے بھی پنچائیت لگ ہی گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی صفائیاں دینی ہی پڑی اور نہ چاہتے ہوئے بھی گواہ سامنے لانے ہی پڑے۔

''حریم بچی۔'' تایا جی کی آواز رندھ گئی، سوال پوچھنا ہی پڑا، منت کرنی ہی پڑی، اس حریم بچی میں بہت کچھ دفن تھا، اگر سیدھا کہے تو اتنا ہی کہ سب اب تم نہ بولنا ورنہ بہت تباہی آ جائے گی، اگر کچھ سچ رکھتی ہو، کسی بات کی امین ہو تو چپکی رہو، ایسے سرِ عام ہمیں جوتے نہ لگوانا، یہ نادان ہیں تم لحاظ کرنا، ایک پردہ پھاڑ بیٹھا ہے تم پردہ پوشی کیے رکھنا اور تم......تم......

سب کو یقین تھا کہ جمال کا ہی دماغ گھوم گیا ہے، جیسے لڑکپن میں ایک بار ہو گیا تھا، ہر ایک سے لڑتا تھا، روٹی بھی چھپا کر کھاتا تھا، پتہ ہی نہ چلتا کہ آخر سوتا کب ہے، وجود سے وحشت ٹپکتی تھی، ہر ایک کو کاٹ کھاتا تھا اور پھر......اپنے دوست کی منگیتر کو نکاح سے ایک دن پہلے چار لڑکوں کے ساتھ مل کر اغوا کر رہا تھا، لڑکی کی شادی اس کے گھر والے کہیں اور کر رہے تھے، بات بڑھی تو بہت لیکن لڑکی واپس بھیج دی گئی۔

اسے دو سال کراچی ایک رشتے دار کے یہاں رکھا، بعد میں ٹھیک نظر آنے لگا تھا، سب خواتین نے حریم کی طرف اسی طرح دیکھا جیسے تایا جی دیکھ رہے تھے، جیسے کہ وقت اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہ اعمال اسے دیکھ رہے تھے، جیسے کے جیسے کے خالی کمان ہاتھ میں لئے ابلیس اسے دیکھ رہا تھا۔

لیکن وہ کچھ بھی کہتی، وہاں موجود ایک جھوٹا ایک سچا بنتا دونوں انہی کے بیٹے تھے، انہیں پیارے تھے، کیسے بانٹ کر ایک کو دشمن، جھوٹا اور گناہ گار بنا لیتے اور ایک کو سچا، معصوم اور اپنا بنا لیتے، کیسے جھٹ پٹ وہ لوگ خدا کو تقسیم کر لیتے، ماؤں پر ایسے عذاب کیوں نازل ہوئے ہیں کہ ملزم بھی ہو تو اولاد، مجرم بھی ہو تو اولاد، صرف اولاد نہ کوئی جرم نہ گناہ۔

اب حریم جو کہے گی وہ ایک کو لے ہی ڈوبے گا، ایک تو جھوٹا بنے گا ہی، حریم کی نظریں جھکی ہوئیں تھیں۔

''حریم!'' ہاشم بولا، حریم منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

''میں کہتا ہوں جواب دو۔'' حریم اور تیز

تیز رونے لگی، ہاشم کی اماں نے وحشت زدہ ہو کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”حریم!“ وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہو گیا۔

”ان کا انتظار کرتے کرتے میں خود سو گئی، کل...... کل...... رات بھی۔“

ہاشم نے آگے بڑھ کر تین چار چانٹے اس کے منہ پر رکھے اور اس کا گلا دبوچ لیا، سب حریم کو اس کے ہاتھوں سے چھڑوانے لگے، احاطے میں ہاہا کار مچی، ہر بیل بوٹے نے یہ راوداد سنی۔

”ذلیل عورت، جھوٹ بولتی ہے۔“ ہاشم غصے سے پاگل ہو رہا تھا، اس کی گردن دبا رہا تھا وہ اسے مار ہی دینا چاہتا تھا۔

گمان تو وہ خیر اس سب کے بارے میں کیا کرتا لیکن جو ہو رہا تھا وہ پاگلوں کی طرح سر پر دھول مٹی ڈالنے کے لائق تھا اور وہ اسی لائق ہو جانے رہا تھا۔

”تم رات گئے تک میرے کمرے میں نہیں آئے تھے۔“ سب نے مل کر ہاشم کو اس سے الگ کیا ہی تھا کہ حریم پھنکاری۔

”ذلیل تو تم ہوئے نا۔“

”کھانا کھاتے ہی میں سو نہیں گیا تھا۔“ وہ حلق کے بل چلایا وہی دہائی دینے والا انداز۔

”بول بد ذات عورت تیرے ہی پہلو میں، ایک یہ بستر میں، صبح میری آنکھ کھلی اور میں نماز کے لئے گیا، ایک نمازی حرامی ہو گا کیا؟“ حریم ڈر کر اپنی نند کی آڑ میں کھڑی تھی، ہاشم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چڑیا سا دل رکھنے والی دانیہ اپنی آپا کو گھور رہی تھی، اس کی آپا یہ کیا کہہ رہی تھی اور کیسے کہہ رہی ہے، ایسے کہہ رہی ہے کہ جھوٹ سچ بن رہا ہے۔

”دیکھا تایا جی۔“ جمال کی دھمال کا وقت اب شروع ہوا تھا۔

”سن لے آپ سب۔“

”آپا جی یہ کیا کہہ رہی ہو۔“ دانیہ حریم کی طرف بڑھی، ایک سے ایک بات آگے بڑھ رہی تھی، وہاں سب چھوٹے بڑے اب تو انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پتلی تماشہ دیکھ رہے ہوں، ایسا تماشہ جسے دیکھنے کی انہیں سزا ملی ہو، جیسے انہیں پتھر کا بنا کر بیچ تماشے کے کھڑا کر دیا گیا ہو، تماشا ایسا کہ پتھر بنے لوگوں کی آنکھوں میں خون کے آنسو آنے لگے تھے۔

دسمبر کی دھوپ، گلابی، میٹھی، بھلی، جس پر جان دینے کو جی چاہتا ہے، جان نکالنے لگی۔

”حریم تو یہ بکواس کیوں کر رہی ہے آخر؟ ابا جی یہ عورت بھی جھوٹ بول رہی ہے۔“

”ایک تو سچا ہے بس۔“ جمال نے ایک تیر چھوڑا۔

”جمال! مجھے ایسے ذلیل نہ کر، دیکھ وہ ادھر تیری میری بھانجیاں بھانجے کھڑے ہیں، یہ ادھر ہمارے چھوٹے بہن بھائی کھڑے ہیں، میں مر جاؤں گا، رحم کر چھوڑ دے اپنا یہ پاگل پن۔“

اس کی بہنیں، تایا زاد، پھوپھی زاد، پھوپھی اماں ایسے اونچی آواز سے رونے لگیں جیسے کسی پیارے کے مرنے کی خبر ابھی ابھی ملی ہو، بچے ڈر کر ذرا دور بھاگ گئے۔

”یہ عورت تایا جی۔“ وہ بڑھ کر تایا جی

کے پاس آیا۔

”یہ صرف میرے نکاح میں ہی آئی ہے اب تک، اس نے تو ہاتھ تک نہیں پکڑنے دیا مجھے۔“ اور ہاشم نے یہ کہتے ہی اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”یہ اور یہ۔“ اس نے جمال اور حریم کی طرف اشارہ کیا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں، یہ تو دونوں کی ملی بھگت لگتی ہے۔“

”ہاں...... ہاں...... ایسا ہی ہے، ذرا سوچیے تایا جی، دانیہ تو صرف میری بھابھی ہے، ایک ہی بار دیکھا ہے اسے تایا جی۔“

”چل جھوٹے، میری الماری میں سے دانیہ کی تصویر نکال لی تھی تو نے۔“ جمال نے اگلی بات کی کیا خوب کی، ہاشم چکرا گیا، اس کے گلے میں آوازیں دم توڑ گئیں وہ ایسے جانور کی طرح ہو گیا جس پر تکبیر پڑھے بنا چھری چلا دی گی اور نہ حلال کیا گیا نہ حرام چھوڑا گیا اور وہ آدھ کٹی گردن کے ساتھ تڑپ رہا ہے نہ کوئی مار رہا ہے نہ وہ مر رہا ہے اور ایسے کہ آپ رات کو سوئیں اور منہ اندھیرے آپ کو جھنجھوڑا جائے کالا کپڑا منہ پر باندھ دیا جائے اور ایک فرلانگ چلا کر پھانسی گھاٹ پر کھڑا کر دیا جائے، یہی نہیں بلکہ کانوں میں جم غفیر کی آوازیں بھی پڑتی ہوں۔

”لٹکا دو، لٹکا دو اس مردود کو۔“

”جمال میرے بھائی۔“ ہاشم تہس نہس ہو ہی گیا۔

”تیری بیوی میری بھابھی ہے، کچھ سوچ کر تو کیا کہہ رہا ہے میرے بھائی ایسے نہ کر۔“

”محبوبہ بھی؟“ زمین پر بچھے اور پھر زمین بوس ہوئے ہاشم کے لئے پھر جمال نے یہی کہا۔

”بس کر دے حرامی انسان۔“ دانیہ نے پہلی ہی بار جانا کہ شرافت کیا ہے عزت کسے کہتے ہیں اور ساتھ ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ ان کی قسمت کیا ہے اور یہ کہ گھر ہو یا بازار اس قیمت پر سودے بازی نہیں کرتے، اس قیمت میں کوڑیاں شامل نہیں کرتے، اس کا انداز ایسا تھا کہ جمال اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”تو نے تو میرا گھونگھٹ بھی نہیں اٹھایا تھا، الزام مجھ پر لگا رہا ہے۔“

”انگلی کا ناخن تو تو نے اپنے دامن کو لگانے نہیں دیا۔“ سارا خاندان شرم سے ڈوب مرنے کے قریب ہو گیا۔

”خدایا۔“ دانیہ نے حقیقتاً کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

”آپا۔“ وہ حریم کی طرف بڑھی۔

”ہم تو بہنیں ہیں نا، تمہارا شوہر کمرے میں نہیں تھا تو کہیں اور ہو گا، یوں تو بات نہ کرو کہ انگلی مجھ پر اٹھے، تم تو جانتی ہو کہ میں تو کبھی بازار کے لئے بھی نہیں نکلی، اتنا بڑا گناہ میں کیسے کر سکتی ہوں۔“ حریم نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”میری بہن ہو کر میرے ہی شوہر کے ساتھ......“

”آپا!“ وہ رونے لگی۔

”ایسے نہ کہو، یہ سب جھوٹ ہے، یہ میرے ہاتھ دیکھو۔“ اس نے ہاتھ جوڑے۔

”تمہارا شوہر میر دیور ہے، نامحرم ہے میرے لئے، میں قرآن پر حلف لینے کو تیار ہوں، لیکن تم تو میری بات مانو، تایا ابا، میں قرآن پر حلف لونگی، ورنہ میں مر جاؤں گی۔“

اس نے ہاتھ جوڑے جوڑے ہی سب کی

طرف گھوم کر کہا۔

تایا جی ابا جی باقی سب کو بہت جھٹکے لگے یہ منظر دیکھ کر لیکن دریا تو پاٹ دیئے گئے تھے تنا، اور دونوں دریا الگ الگ ہی بہہ رہے تھے۔

تایا جی بری طرح سے لڑکھڑائے، خود کو سنبھالا لیکن گر ہی گئے اور گرتے ہی انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

“ہمارے ہونے پر رحم کرو۔” پہلی اور آخری بار وہ اپنے باپ کے مرنے پر روئے تھے، تین بیٹیوں کے بعد چار بیٹے وقفے وقفے سے بچپنے میں ہی مر گئے تھے، لیکن وہ صابر ہی رہے کبھی رو کر دکھی ہو کر نہ دکھایا، لیکن اس عذاب سے وہ رو پڑے۔

“تایا جی ایسے نہ کہے، میری جان قربان ہے آپ پر۔” جمال لپک کر ان کے نزدیک نیچے بیٹھا۔

“تایا جی میں پاک باز مرد ہوں، یہ عورت میری بھابھی ہے، یہ پاک باز عورت ہے، تایا جی دیکھیے، بدکار کیا ہمارے جیسے ہوتے ہیں۔”

“بدکار آنکھوں میں دھول جھونکنے والے ہی ہوئے ہیں۔”

“میں ایسا کیوں کرونگا جمال۔”

“وہ تو جانے میں نے تجھے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تجھے اور اسے۔”

“خدا جانتا ہے یہ صرف بہتان ہے، خدا کے عذاب سے ڈر جمال، ابھی بھی باز آجا۔”

“تو باز آیا، تو نے خدا کا خوف کیا۔”

“اس کے عذاب سے میں تیرے لئے خوفزدہ ہوں۔”

“اپنے لئے ڈر۔”

“میں ڈر رہا ہوں، ڈر ہی رہا ہوں جمال، تجھے ڈر نہیں لگ رہا، تو کیوں نہیں ڈر رہا، توبہ کر جمال توجہ کر، تیرا یہ بہتان ہم سب کو لے ڈوبے گا۔”

“تیرا گناہ تجھے لے ڈوبے گا۔”

“خدا جانتا ہے سب، میری گواہی خدا دے گا۔”

“تیری گواہی تیری بیوی نے دے دی۔”

“وہ بدذات ہے، بدذاتوں کی گواہیاں نہیں چلتیں، دراصل وہی بدکار ہے، ہاں ہاں، یہ تو ہے یہ وہ ہے دونوں کھیل رہے ہو، دونوں۔”

“اپنا الزام اب کسی پر بھی لگا۔”

“تو نے تہمت لگا کر ٹھیک نہیں کیا، میری بیوی میری گواہ نہیں، یہ وقت گواہ نہیں، خدا زمین پر نہیں آئے گا پر خدا گواہیوں کا وقت ضرور لائے گا۔”

“اس وقت بھی میں تیرا گریبان پکڑونگا۔”

“اس وقت کی لگامیں تیرے ہاتھ میں نہیں ہونگی۔” یہ کہتے اس کے ہاتھ سے اس وقت کی لگامیں پھسل گئیں۔

دادی کا سر زمین سے جا لگا، عورتیں ان کی طرف لپکی انہیں اٹھا کر چارپائی پر ڈالا پانی منہ سے لگایا، تایا جی ہمت کر کے اٹھے۔

جمال کے ابا کی طرف دیکھا انہوں نے سر جھکا لیا، کہ ایسی اولاد کے باپ ہونے پر انہیں منہ ہمیشہ کے لئے چھپا لینا چاہیے، وہ انکاری ہوئے کہ یہ دونوں بیٹے ان کے نہیں، دیکھتے ہی دیکھتے وہاں موجود ہر شخص ان دونوں سے نفرت کرنے لگا، انہیں ان سے گھن آئی ان کا جی چاہا کہ انہیں دھکے دے کر وہاں سے نکال دیں، اگر جمال سچا ہے تو اس زمین پر بدکاری ہوئی، ان کا خون بدکار نکلا، اگر ہاشم سچا ہے تو اس زمین پر تہمت لگائی گئی، ان کا خون ابلیس سا نکلا، یا ایک بدکار ہے یا ایک ابلیس ہے، اس ایک کے لئے انہوں نے دونوں سے نفرت کی، جیسے کہ کرنی ہی چاہیے۔

دونوں ہی توبہ پر آمادہ نظر نہیں آئے تھے اور پھر جو گناہ کرے اور شرمندہ نہ ہو اور توبہ کی طرف نہ آئے اس کے شر سے خدا ہی بچائے۔

بڑے جن کی تیسری آنکھ تھی، انہوں نے دور تک سب کچھ اجڑتے ہوئے دیکھا، حویلی کے اوپر سے احاطے کے درختوں سے کوئی ایک بھی پرندہ پرواز کرتا، آواز کرتا نہ گزرا، انہوں نے سونگھا کے مالٹے کے باغوں سے آنے والی خوشبو مردار ہوئی، پھلوں کے رس مردار ہوئے حویلی کے احاطے سے ایک طلسم پھونکا گیا، وہ طلسم شر کا تھا، اس شر کا دھانہ دوزخ کی طرف تھا، پھول پودے، بچے بوڑھے، اس طلسم کی زد میں آئے، ایمان اور پناہ کی پرواز وہیں رکی نیکی کا پرندہ جو پر پھیلائے خیر پر پرواز کرتا ہے اس کے پر جل کر رکھ ہوئے۔

“تم دونوں اب کیا چاہتے ہو؟” تایا جی فیصلہ کرنے والے نہیں تھے وہاں کوئی بھی نہیں تھا ان کی زندگیاں ایسی تھیں کہ کہا تو مان لیا، نہ مانا تو نہ کہا، سیدھے سبھاؤ سے سب ہوتا ہوتا رہا تھا، پھر فیصلے کیسے، لیکن سب رو دینے کو تیار کھڑے تھے کیا مرد کیا بچے تو تایا جی ہی یہ سوال پوچھنے کو آگے ہوئے، اس قصے کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے ہی ہمت کی۔

جمال منہ کھولتا اس سے پہلے ہاشم نے منہ کھولا اور ہاتھ بلند کیا۔

“میں اس عورت کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔”

“میں اس شیطان سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔” قرآن پر حلف لینے والی نے اپنے منہ سے اپنی عزت پر حلف لیا۔

“خدا بھی زمین پر آجائے تو بھی یہ مرد مجھ پر حرام ہی رہے گا، اس زمین کی تہہ سے جڑی ساری زمینیں اجڑی ہی رہیں گی، اس زمین پر کھڑے ہو کر اس شیطان نے تماشہ لگایا ہے اسی زمین کی خاک اس کے منہ میں جھونکی جائے گی۔”

“میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔” جمال نے بھڑک کر بلند آواز سے کہا، ہاشم نے اس سے بلند آواز میں حریم کو طلاق دی، لڑکیوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے، اپنی چیخیں دبائی اور ناکام رہیں۔

دسمبر کی دھوپ میں وہاں سوا نیزے کا سورج مغرب سے طلوع ہوا۔

روئی کے گالوں کی طرح ایمان اڑ گیا۔

ایک کونے سے زاول نکلا اور پر لگا کر دور تک اڑا۔

☆☆☆

دونوں چھوٹے چچا حریم اور دانیہ کو گھر کے باہر چھوڑ آئے، ہاشم اور جمال گھر سے نکل گئے۔

کچھ ہی دیر میں دونوں لڑکیوں کے گھر والے آگئے ان کی مائیں ان کے بھائی، ان کے باپ، منہ اندھیرے تک لڑتے رہے، حویلی کے پیارے سیدھے سادے لوگ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رو رو کر بے ہوش ہوئے رہے، نہ انہوں نے کچھ دیکھا تھا نہ ہی سنا تھا، جو قصہ ہوا

تھا انہیں سنا دیا تھا، ان کے پیروں کو ہاتھ لگا رہے تھے، ان کے سامنے گڑگڑا رہے تھے، جو کھیتی دس دن پہلے بوئی تھی اسے کل اجڑتے دیکھ لیا تھا وہ کوئی صفائی نہیں دے رہے تھے وہ کوئی الزام نہیں لگا رہے تھے، وہ خدا نہیں بن رہے تھے بس وہ خدا اک خوف کھائے ہوئے تھے، وہ شرمندہ تھے وہ گڑگڑا رہے تھے، سنت پر کار بند پھوپھی اماں نے رات گئے اپنے سینے پر کئی ہتھ مارے وہ دہلیز پر ہی بیٹھ گئیں اور رونے لگیں، اس رات اس گھر میں کوئی نہ سو سکا، سو تو وہ اب کبھی بھی نہیں سکیں گے۔

☆☆☆

دو دن بعد ہاشم گھر آیا، رات گئے، وہ تایا جی کے پاس گیا، اس نے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن تایا جی نے اس کے پیر پکڑ لئے۔

”صفائی یا گواہی ہمیں کچھ نہیں چاہیے، ہم پر رحم کرو، بھلے مانس ہیں، اب تو سانس بھی نہیں لیا جاتا، رحم کرو ہم پر، چلے جاؤ اور دوبارہ کبھی ہمیں اپنی شکلیں نہ دکھانا، اتنا رحم کرو بس۔“

آنکھوں پر بازو ٹکا کر ہاشم رونے لگا، بہت دیر روتا رہا پھر اتنا اونچا اس کا رونا ہوا گیا کہ کونے کونے میں اس کی آواز سنی جانے لگی، جو جو سن رہا تھا وہ وہ اپنی اپنی جگہ منہ چھپائے رو رہا تھا، اس کی اماں کو غش پڑنے لگے، اس کا ابا باغ کو بھاگ گیا، تایا جی رحم رحم کرتے رہے۔

منہ اندھیرے ہاشم وہاں سے بھاگ نکلا، جیسے کسی دیوانے پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور وہ آگے آگے لڑکھڑا کر خوف کھا کر بھاگتا ہے ایسے ہی حویلی کے آخری سرے پر بنے بڑے کمرے سے جس کے تین دروازے اور چار قد آدم کھڑکیاں تھیں وہ اس کھڑکی میں سے قلانچ بھر کر جس کے سرے پر تایا جی ٹکے کھڑے تھے بھاگ گیا اسے ایسے بھاگتے سب نے دیکھا اور جس طرح میت اٹھنے پر عورتیں کہرام برپا کر دیتی ہیں ایسے ہی ہاشم کے پھاٹک سے نکل جانے پر حویلی میں کہرام برپا ہوا، ایک زندہ جوان بیٹا زندہ درگو ہوا۔

ٹھیک ایک دن بعد جمال آیا اور اسے بھی جانے کے لئے کہہ دیا وہ بھی اپنا سامان باندھ کر چلا گیا، کہانی کا یہ آغاز یہاں ختم ہوا۔

☆☆☆

بات پھیلی اور دور تک گئی، انہیں بدنامی کی پرواہ نہیں تھی، خوف تھا، کوئی تو شیطان تھا اور شیطان ان کے گھر کا راستہ دیکھ گیا تھا، حویلی کے درودیوار گواہ بنے تھے، وہاں زوال اتر چکا تھا، تو جس کسی ایک کے اندر سے بھی خدا کا خوف جاتا رہے اور وہ شیطان سے پناہ مانگنے کی بجائے اسی کی پناہ میں آ جائے تو...... تو ایسے چیلے سے تو چرند پرند پناہ مانگتے ہیں، وہ تو بڑے بوڑھے سیانے تھے، رات رات بھر روتے رہتے، دن میں سب ساتھ نہ بیٹھتے، نظریں نہ ملاتے، ڈرے رہتے، سسکتے رہتے۔

چند ہی ہفتوں میں دادی شدید بیمار رہ کر چل بسی، پورے چالیس دن وہ چپ رہی تھیں، خاموشی کی ہی گفتگو و شنید میں مبتلا رہ کر چلی گئیں۔

مالٹے کے باغات جیسے تیسے فروخت کر دیئے، حویلی کو فروخت کے لئے لگا دیا، تایا جی کی بیٹیوں کا سسرال لیہ اور ملتان میں تھا وہ دونوں شہروں کو چھوڑ کر چکوال چلے گئے اور چکوال میں ہی ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا،

چھوٹا گیارہ سال کا بیٹا تھا اور ایک آٹھ سال کی بیٹی ان کے ساتھ تھے۔

ہاشم کے اماں ابا اپنی بڑی بیٹی کے سسرال شہر ملتان جا بسے منجھلے چچا جن کے اٹھارہ سے پانچ سال کے چھ بیٹے تھے وہ اپنی بیوی کے میکے پر شہر چلے گئے اور سب سے چھوٹے چچا جن کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں وہ خوشاب چلے گئے، وہ اب ساتھ نہیں رہ سکتے تھے جیسے کہ وہ جان گئے تھے کہ ان کے گھر کا راستہ شیطان دیکھ گیا ہے، ایک کو دلیر بنا گیا ہے ایک کو اندر سے خوف بھاگا...... اب وہ ساتھ کیسے رہ سکتے تھے، مالٹے کے باغوں میں جاڑے کی راتوں میں بھاگنے والے سب الگ الگ ہو گئے اور زندگی کی آخری سانسوں تک وہ الگ الگ ہی رہیں گے، اب بیٹوں کی شادی کیسے کی جائیں گی اب دیوروں کی موجودگی میں دلہنیں کیسے لائی جائیں گی، اب دو یا تین یا چار بھائی ساتھ ساتھ کیسے رہیں گے، اب ایک دوسرے کی دلہنوں کو کس نظر سے دیکھا جائے گا، ان میں بگاڑ کا بیج بویا جا چکا تھا، وہ طلسم مردار کے پھونکے ہوئے تھے اب وہ زندہ کیسے ہونگے......؟

☆☆☆

سرگودھے سے ہاشم دوسرے قریبی شہر کے ایک دربار میں جا بیٹھا دیکھنے والے دیکھتے کہ وہ وہاں رات دن روتا رہتا، چند ہفتے اسے ہی گزر گئے پھر وہ جیسے تیسے اپنے دوست کے پاس اسلام آباد گیا اور دو مہینے بعد سعودی عرب چلا گیا، وہاں اس کا ایک ہی کام تھا کہ وہ رات دن حرم میں بیٹھا رہتا اور طواف پر طواف کیے جاتا، اس طرح کے بے ہوش ہو کر گر جاتا، وہ خدا سے دعا نہیں کرتا تھا سوال کرتا تھا کہ ایسی غلیظ تہمت کے لئے بندوں میں اسے وہی بندہ ملا آزمانے کو، وہ طواف کیے جاتا، شکوے کیے جاتا روتا رہتا، وہ نماز بھی نہیں پڑھتا تھا، وہ خدا کے گھر کے گرد گھوم کر خدا کو زمین پر بلانا چاہتا تھا، ایک رات پہلی سی شدت سے ہی وہ طواف کر رہا تھا کہ گر کر بے ہوش ہو گیا، ہوش میں آیا اور گہری نیند میں چلا گیا، اس نے ایک خواب دیکھا، خواب تھا یا دوسری طرف کا پردہ چاک تھا، دیکھا کچھ نہیں جو بتاتا، سنا کچھ نہیں جو سناتا، وہ ایک عالم سے ہو کر گزرا، جب وہ جاگا تو اس نے اگلے دن عمرہ ادا کیا اور پھر وہ اپنے لئے کام ڈھونڈنے لگا۔

دوسری طرف جمال جرمنی چلا گیا، حریم کے ساتھ اس کا فون پر رابطہ تھا جو کچھ اس دن حویلی میں ہوا، وہ اس کے صرف بھڑک جانے سے ہوا، وہ...... وہ سب طے کئے نہیں بیٹھا تھا، مہندی کے بعد جتنی بھی اس کے حریم سے بات ہوئی اس سے اسے یہی معلوم ہوا کہ دونوں طرف قصہ ایک ہی ہے، اس نے اپنے بڑوں سے چھپ کر بہت سی لڑکیوں کو پسند کیا تھا اور باغ میں چھپ کر بہت کچھ چھپا کر کیا تھا، پھر ایک لڑکی نے اسے بد دعا دی کہ وہ کوڑھی ہو کر مرے گا تو وہ حقیقتاً ڈر گیا، لڑکی صوم و صلوۃ کی پابند تھی اور اس کے گورنمنٹ کالج کے راستے میں اس کا گھر تھا، لڑکی مدرسے جاتی تھی اور جمال نے ہی اسے رام کیا تھا، پھر اسے ایک دوسری لڑکی اچھی لگنے لگی، ہاشم ٹیکنیکل کالج میں پڑھتا تھا ورنہ اسے ضرور اس کی ایسی حرکتوں کی خبر ہو جاتی، ہاشم اس سے ڈھائی سال بڑا تھا صرف اور جمال زیادہ ہی چھوٹا اور بچہ بنتا تھا، لڑکی نے قرآنی تفسیر کی کتاب پر ہاتھ رکھ کر بد دعا دی تو وہ کئی

راتیں سو نہ سکا اور اتنا ڈر گیا کہ توبہ کر لی، پھر اپنے دوست کی منگیتر کو ورغلا کر ساتھ لے آئے، توبہ پھر ٹوٹی، بات چھپی رہی اور لڑکی کا نکاح ہو گیا، جب بات کھلی تو اسے گھر بیٹھی کو طلاق ملی اور وہ اتنی بدنام ہو گئی کہ اس نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی، یہاں توبہ پھر بنی، وہ کراچی میں تھا جب اسے یہ سب معلوم ہوا، اس کا دوست اس کے آگے روتا رہتا تھا کہ خاندانی چپقلش کی وجہ سے ان کی منگنی ٹوٹ گئی، کچھ دوست نے سوچا کچھ اس نے بھڑکایا، وہ کر گزرے۔

وہ جرمنی چلا گیا، اپنے آپ کو سنبھالے رہا، چھت سے جھولتی لڑکی وہاں بھی اس کے پاس آتی رہی، وہ پانچ وقت نماز پڑھتا پیشانی پر ہلکا سرمئی محراب بنا، اس نے حریم کو دیکھا، خوب دیکھا، وہیں توبہ پھر سے ٹوٹی، معافی مانگنے والے کو خدا ہر بار معاف کرتا ہے، معافی مانگنے والا ہر بار کے بعد احتیاط کیوں نہیں کرتا، وہ سینہ تان کر ابلیس کے تیر کمان کے آگے کیوں ڈٹ جاتا ہے، کمان سے وار نکلتے ہیں کیا خوب نکلتے ہیں۔

پہلے وہ صرف پسندیدگی اور محبت کے لفظ اور احساس سے واقف تھا پھر یہ الفاظ اسے بہت معمولی لگے، وہ کھڑے کھڑے اسے دیکھتے ہی اس کا غلام ہو گیا، عشق میں ایسے غوطہ زن ہوا کہ حریم اس کی آقا ٹھہری، وہ اس کے قدموں میں بچھ گیا، وہ سودائی ہو گیا۔

ولیمے کے بعد دو تین بار چھپ کر اس سے ملتے اس نے حریم کو بتا رہا تھا کہ وہ جرمنی جا کر دانیہ کو طلاق بھجوا دے گا پھر بہانے سے حریم بھی ہاشم سے طلاق لے لے، وہ جرمنی سے کسی اور ملک چلا جائے گا اور حریم سے شادی کر کے اسے اپنے پاس بلا لے گا، اس سے زیادہ آگے پیچھے اوپر نیچے والوں کا اس نے نہ سوچا اسے ضرورت تھی۔

ہاشم کے سو جانے پر حریم باہر باغ کی طرف آ جاتی تھی، وہ بھی آ جاتا تھا، باقی گھر والے تو ویسے ہی عشاء کے بعد سو جاتے تھے۔

دو ایک بار حریم نے اسے جیسے جتایا کہ اس کا بھائی ہاشم کیسے اس کے پیچھے رہتا ہے تو جمال کا خون کھولنے لگتا، اس دن سب دھوپ میں بیٹھے تھے اور وہ خود کو چھپا کر حریم کے کمرے میں اس سے مل کر آ رہا تھا اور اس نے بتایا کہ ہاشم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور......

تو جمال ہاشم کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اس کا منہ توڑ دینا چاہتا تھا اور اس نے توڑ دیا، اس نے سب کا سب کچھ توڑ دیا۔

☆☆☆

شروع میں دانیہ خوب چیخ چلا کر روتی رہی، پھر جب اس کے اور حریم کے ابو لڑ لڑ کر مرتے مرتے بچے تو وہ چپ ہو گئی، حویلی والوں کی طرح وہ بھی الگ الگ ہو گئے، دانیہ کے ابو نے سرگودھا شہر میں ہی کسی اور جگہ الگ گھر لے لیا، وہ بھی سب رات دن آنسو چھپاتے، دانیہ کسی کونے میں چھپی رہتی اور باپ کو بھی اپنی شکل نہ دکھاتی پاک دامن عورتوں پر مجمعے میں ایسے تہمت لگا دی جاتی ہے تو ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ کائنات کی کسی تہہ میں جا چھپے کہ انہیں خدا کو بھی اپنا منہ نہ دکھانا پڑے، تو دانیہ نے خود کو چھپا لیا، اسے اپنے باپ کی نظر پر بھی شک ہوتا کہ وہ بھی اسے وہی نہ سمجھتے ہو جو سمجھ کر اسے جمال نے سرِ عام لا کھڑا کیا تھا، پہلے اسے شک گزرتا کہ وہ کسی گناہ کی مرتکب ہوئی ہے جس کی یہ سزا ملی ہے اور پھر اسے یقین ہوا کہ ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔

نہ ان کے یہاں کوئی جاتا نہ وہ کہیں جاتے، دانیہ کو بٹھا کر سمجھانے کی کوشش کئی بار کی گئی پھر بھی وقفے وقفے سے گھر کا ہر فرد اسے چھت پر، کمرے میں، برآمدے میں، دور آنگن کے کونے میں سسکتے دیکھ اور سن چکا تھا، وہ چودہ جماعتیں پاس تھی پرائیوٹ ایم اے کی کتابیں لا کر اس نے رکھ دی تھیں، طے یہی ہوا تھا کہ سال دو سال وہ دونوں یہیں پاکستان میں رہیں گی پھر جمال اور ہاشم انہیں ساتھ لے جائیں گے فی الحال وہ انہیں ساتھ لے کر نہیں جا سکتے تھے، اس لئے مزید پڑھنے کے لئے وہ کتابیں لے آئی تھی تایا جی اور دادی اماں کا کہنا تھا کہ وہ جسے چاہے پڑھے، یونیورسٹی چلی جائے، جو جی میں آئے کرے لیکن اماں نے کہا کہ ایسے شادی کے بعد باہر نکلنا ٹھیک نہیں وہ پرائیوٹ ہی پڑھے، چھ ماہ بعد پارٹ ون کے امتحانات تھے، اماں اس کے پاس آتیں اسے سمجھاتیں کہ وہ پڑھ لے اور وہ انہیں دیکھ کر رہ جاتی جیسا کہ اب وہ صرف ہونقوں کی طرح دیکھتی ہی تھی، ایسا دیکھنا جس میں دراصل کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔

تین مہینے ان کی منگنی رہی تھی، حریم اس سے دو سال بڑی تھی رشتہ اسی کے لئے آیا تھا، پھر دانیہ کا بھی جمال کے لئے مانگ لیا گیا، دونوں کو تصویریں دکھائیں گئیں تھیں ان کی رائے لی گئی تھی، ان کی ہاں پر ہی انہیں ہاں کہا گیا تھا، بڑے ہاشم کے لئے حریم اور چھوٹے جمال کے لئے دانیہ۔

سب بہت خوش تھے کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں جا رہی ہیں، پھر باہر بھی ایک ساتھ ہی رہیں گی تو تنہا نہیں ہوں گی، جمال اس کا منگیتر تھا تو دانیہ اس کی تصویر کو دن رات کئی کئی بار دیکھتی تھی، وہ خود بھی خوبصورت تھی لیکن جمال اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا، وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا تو وہ اسے بہت پسند کرتی تھی، ایک دلہن بننے والی لڑکی کیا کیا سوچتی ہو گی یہ کوئی بھی جان سکتا ہے کہ رات دن وہ کیسے نگاہوں میں رکھ کر مسکراتی ہو گی۔

جمال کمرے میں آیا تھا اور آنکھوں پر بازو رکھ کر سوتا بنا اس نے اتنا لحاظ بھی نہ کیا کہ وہ بجی بنی لڑکی سے اتنا ہی کہہ دے کہ "روشنی گل کر دو اور سو جاؤ۔"

وہ حیران پریشان پھر غم زدہ واش روم میں جا کر روتی رہی۔

کتنی ہی دیر بعد وہ باہر نکلی تو جمال سارے بیڈ پر پھیل کر سو رہا تھا وہ صوفے پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھی رہی صبح تک، پھر ایسی کئی صبحیں آئیں۔

جس شخص نے اس کا گھونگھٹ نہیں اٹھایا تھا اس شخص پر نظر پڑتے ہی وہ کانپ کر رہ جاتی، وہ اتنی خوفزدہ ہو جاتی جیسے وہ اس کا گلا ہی دبا دے گا اور کاش گلا ہی دبا دیتا، لیکن شاید اسے صرف جان لینا پسند نہیں تھا۔

اسے کاغذی طلاق مل چکی تھی اور اسے فخر تھا کہ اس کا مطالبہ اس نے بلند بانگ کیا تھا...... اگر وہ کچھ دیر وہاں اور رہتی تو وہ جمال کی زبان کاٹ دیتی، لیکن بعدازاں اس نے اس شخص پر لعنت بھیجنا بھی گناہ سمجھا، جن کی گردنیں لعنت کے طوق سے اکڑی ہوں ان پر زبانی لعنتیں کہاں بھیجتی۔

دانیہ نے ایک آخری نظر بھی حریم کو نہ

دیکھا، اس نے اسے اپنی نظر کے قابل بھی نہ سمجھا، حریم نے گھر آ کر بھی انگلی اٹھا اٹھا کر اس پر تہمت لگائی، دانیہ...... دانیہ کرتی رہی۔

”یہ میرا انجام نہیں تیرا انجام ہے آپا، یہ میری تباہی نہیں تیری تباہی ہے، میں اپنی گواہ نہیں اور تو میرا خدا نہیں، چلو چلنے دو جب تک یہ زندگی چلتی ہے، یہ تہمت کا طوق میرے ہی گلے میں سہی، پھر دیکھتے ہیں، کس کے ہاتھ میں کیا ہے۔“

ان کے گھر میں بھی ویسی ہی پنچائیت لگ گئی تھی حریم رو رو کر دہائی دے رہی تھی کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا، دانیہ نے یہ چند جملے ہی کہے اور پھر وہ کچھ بھی نہ بولی، دونوں خاندان زندہ درگور ہونے کے لئے الگ الگ ہو گئے۔

دانیہ کو طلاق بھی ملی اور اس پر الزام بھی لگا اور اسی کی وجہ سے حریم کو طلاق ہوئی، زمانہ اور اس کی زبان...... اور بس۔

☆☆☆

اس واقعے کے ٹھیک تیرہ ماہ بعد ان کے گھر ایک ایسا شخص آیا جسے مار دینے کا جی بھی چاہا، ان کے گھر ہاشم آیا۔

”نکل جا یہاں سے۔“ دانیہ کے ابو نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کو دھکا دیا، ہاشم نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ایک بار آپ کو میری بات سننی ہی ہو گی، آپ کو اپنے پیاروں کی قسم، اپنی پیاری کی قسم۔“ زمان صاحب کے اعصاب تن گئے۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، میرے بیٹے آ جائیں گے تو......“

”میں نے تو آنے میں بہت دیر کر دی۔“

”تم......؟“

”میری ایک درخواست سن لیں۔“ ہاشم کے ہاتھ جڑے ہوئے ہی تھے۔

دانیہ کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے گھر کے پہلے اور بڑے کمرے میں کون آ کر بیٹھا ہے اور وہ کیا کہنے آیا ہے۔

”چاہیں تو اپنی بیٹی اور خالہ جی کو بھی بلا لیں۔“

بیٹی کے نام پر ان کے اعصاب خونخوار سے ہو گئے۔

”تم صرف مجھ سے بات کرو۔“ اتنا تو وہ جانتے تھے کہ سب کیا دھرا جمال کا تھا اسی لئے اسے اندر لا کر بیٹھا کر اس کی بات سن بھی رہے تھے۔

”میں آپ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔“ اپنی بیٹی کی شرافت پر ہزار ایمان رکھے زمان صاحب کا ایمان گنتی میں صفر کی طرف گرنے لگا انہوں نے ہاشم کی طرف دیکھا کہ۔

زمان صاحب نے ہکلا کر بولنے کی کوشش کی اور چپ ہی رہ گئے۔

”ان پر شک نہ کریں۔“

”دفعان ہو جاؤ تم۔“

”صرف ایک بار سوچیں، جس طرح آپ کی بیٹی بے گناہ ہے اسی طرح سے میں ہوں، خدا کے گھر سے آ رہا ہوں، گواہی تو کوئی نہیں لایا دعا ضرور مانگ کر آیا ہوں، خدا ہم دونوں پر اپنا رحم کرے۔“

”چلے جاؤ۔“

”میں پھر آؤں گا، آپ سوچ لیں، اپنی بیٹی سے میری شرافت کی بابت پوچھیں، وہ ضرور بتائے گی، میری طرح وہ بھی سب جانتی ہے۔“

وہ وہاں سے چلا آیا۔

زمان صاحب جو بھڑکے ہوئے تھے ٹھنڈے ہو گئے، اتنی بدنامی ان کی بیٹی کی ہوئی، سوچ میں ایسے غلطاں ہوئے کہ دنوں کھانا نہ کھا سکے راتوں کو سو نہ سکے، ایک دن کونے میں چھپی دانیہ کے پاس جا بیٹھے۔

”ہاشم آیا تھا، نکاح کے لئے درخواست کر کے گیا ہے، کہتا ہے بس اب وہی تمہیں خوش رکھ سکتا ہے، میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، سچائی تم جانتی ہو، باپ کی بات پر سوچنا، زمانے کو میں پہلے ہی آگ لگا چکا ہوں۔“

بات بیٹوں تک پہنچی تو وہ بھڑک اٹھے۔

”خاندان والے کیا کہیں گے، کہیں گے دیکھا حریم ٹھیک ہی کہتی تھی۔“

”یقیناً لوگ کہیں گے جیسے جمال نے کہا، سچ تو خدا ہی جانتا ہے نا، لوگوں اور خدا کو میں ایک پلڑے میں کیسے رکھ لوں۔“

”خدا کی پرواہ کون کرتا ہے ابو۔“

”کرنی تو چاہیے، جمال ہی کر لیتا، اس سے اب کون شادی کرے گا میرے بچوں، کوئی کرے بھی تو شاید وہ نہ کرے، ساری عمر صفائیاں ہی دیتی رہے گی، ڈرتی ہی رہے گی، ہاشم عمرہ کر کے آیا ہے، شاید۔“

”جمال حج کر کے آیا تھا۔“ بڑا بیٹا اور بھڑک اٹھا۔

”میں بہت لاچار ہوں، میں اپنی بچی کو دیوانہ بنا نہیں دیکھ سکتا، خلاؤں میں گھورتی ہے، ہواؤں سے باتیں کرتی ہے اسے مار ڈالوں گا اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا۔“ زمان صاحب رونے لگے، دانیہ کے واقعے کے بعد رو ہی دینے تھے بات بات پر اور یہ وہ رونا تھا جس پر حق ہوتا ہے جیسے جوان بیٹے کی موت پر باپ کا رونا، حق سے رونا۔

دس دن بعد ہاشم آیا تھا دانیہ نے کہا کہ وہ خود بات کرنا چاہتی ہے۔

”یہاں کیوں آئے ہیں آپ؟“

”حکم خدا۔“ ہاشم کا سر اور جھک گیا۔

”میرے لئے خدا نے حکم اتارا، عذاب اتارا تو دیا تھا اس نے۔“

”ایسے نہ کہو، وہ ہمارا رب ہے اس کے لئے ایسے بات نہ کرو۔“ ہاشم کہہ کر چپ بیٹھا رہا، دانیہ اپنے آنسوؤں پونچھتی رہیں قریب ہی اماں اور ابو بیٹھے تھے، سبھی چپ تھے۔

”یہ حکم میرے دل میں اترا، مجھے بندگی اور فرمانبرداری کا نیا خیال ملا، میں نہ جان سکا نہ سمجھ سکا کہ وہ سب کیوں ہوا، میں نے اپنے اندر اترنے والے ہر خیال کو خدا کا حکم جانا اور گردن جھکا دی اور پہلا حکم یہاں آنے کا تھا، وسوسے تو پیٹھ کے پیچھے سے آتے ہیں نا اور میں نے ان کی طرف پیٹھ ہی کیے رکھی، یہاں آنا وسوسہ نہیں تھا، کیا یہ کافی نہیں جان لینے کے لئے کہ خدا کیا چاہتا ہے۔“ دانیہ اور سسکنے لگی۔

”مجھے خدا سے بہت شکوے ہیں، میری عزت بھی واپس نہیں آئے گی، میں تار تار ہو گئی۔“

”عزت کا فیصلہ تو ہو گا، جس کا وعدہ ہے۔“

”میں اب کسی قابل نہیں رہی۔“

”قابل تو میں بھی نہیں، بس جسے خدا توفیق دے، مجھ پر وہ بہتان لگا تو میں نے خدا کا در پکڑ لیا، اس سے اتنے سوال کیے اتنے شکوے کیے اور خدا نے کہا شکوے اور سوالوں

کو لے کر آئے ہو، یہ شکوے اور سوال نہ ہوتے تو کبھی نہ آتے اس در پر، اس نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگالیا اور میں نے اتنی دیر کر دی اس کے سینے کے ساتھ لگنے میں، وہ سب تو مجھے سچ لگا، نہ میں ڈھول مٹی ہوا نہ ہی مجھے جوتے لگے، جگ ہنسائی نہیں ہوئی، مجھ پر فقرے نہیں کسے گئے، مجھے ذلیل نہیں کیا گیا، جو ہوا چار دیواری میں ہوا، برا ہوا، بدترین نہیں، میں کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ کتنا کم ہوا اور مجھے کس قدر زیادہ ملا، میرے دکھ، رنج والم کا راستہ خدا سے جا ملا، پھر وہ دکھ کیسا، کیسی ذلت، اگر انعام خدا ہے تو میں عالم الناس میں نیلام ہونے کے لئے تیار ہوں میں پہلے ایسے تیار نہ تھا، میں پہلے اس سے نہیں ملا تھا، پہلے میں ہاتھ پھیلاتا تھا اور دنیا مانگتا تھا میں اب اٹھاتا ہوں تو اسے مانگتا ہوں، میں اسے ہر طرف سے جالوں گا، میں اسے ہر طرف سے پانا چاہتا ہوں، ایک راستہ دانیہ ہے، یہ راستہ بھی خدا کی طرف جاتا ہے، میں خدا کے لئے اسے راضی رکھوں گا، اگر تکلیف دی تو معافی مانگوں گا، اس کے عجیب کی پردہ پوشی کروں گا، اپنے عیبوں پر توبہ کروں گا، آپ میرا اعتبار کریں، میں خدا کے لئے تمہیں قبول کرنے آیا ہوں، خدا کے لئے تمہیں خوش رکھوں گا، مجھ میں سو شرعی اور دنیاوی عیب ہیں، میں شرمندہ ہوں کہ میں جمال کا بھائی ہوں لیکن فخر کرنے دیں کہ میں ایک خدا کا بندہ ہوں، میری شرافت تم جانتی ہو اور تمہاری میں، ہم دونوں ایک دوسرے کے سچے اور کھرے گواہ ہیں، اگر ہماری زندگیوں میں کوئی اور آیا تو ہمیں اپنی شرافت کی روز روز قسمیں کھانی پڑیں گی، شکوک پھر بھی نہیں جائیں گے شک کے طمانچے ہمیں پھر بھی لگیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" دانیہ کہہ کر چلی گئی اسی شام دونوں کا نکاح ہو گیا، خاندان کے چند بڑوں کو زمان صاحب نے بلایا، وہ جائز کو ناجائز نہیں بنانا چاہتے تھے، اب دنیا جتنی بھی باتیں کرے، جب فیصلہ خدا کا مانا تھا تو عزت اور ذلت کا فیصلہ بھی اسی کے سپرد کیا تھا۔

☆☆☆

دونوں کے نکاح کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی، ہاشم کے بٹے ہوئے خاندان میں بھی ہاشم تایا جی کے پاس گیا تھا نکاح سے پہلے لیکن انہوں نے پھر سے ہاتھ ہی جوڑ دیئے، ایک بار پھر سے روکنے کے بعد وہ پلٹ آیا، اپنی اماں اور چچا کے گھر بھی گیا انہوں نے بٹھایا، کھلایا اور چلے جانے کے لئے کہا، جیسے ہی اس نے اپنی صفائی دینی چاہیے وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے، آواز گم کئے رونے لگے۔

"اگر تو قصوروار ہے تو خدا سے معافی مانگ، اگر جمال قصوروار ہے تو......تو جمال کو معاف کر دے، تم دونوں کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" اماں نے کہا۔

"بندہ مومن ذلیل و خوار ہو کر نہیں مرتا اور بندہ ابلیس بندہ خدا نہیں دکھتا۔" اتنی سی بات اور چچا نے چپ سادھ لی، دونوں کے نکاح سے دونوں کے خاندان میں آگ بھڑکا دی تھی، جو بہتان لگا تھا وہ سچ مانا جانے لگا، کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کی جاتی۔

ہاشم دانیہ کو اپنے ساتھ لے گیا، ہاشم پر سکون تھا البتہ دانیہ وحشت زدہ سی تھی، زندگی اپنے راستے خود ہی بنا رہی تھی۔

ان دونوں کے نکاح کے ٹھیک چار مہینے بعد جمال پاکستان حریم کے گھر آیا، اس کی سنتے ہی مختار احمد نے اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔

"میرا بھائی پاگل ہو گا میں نہیں ہوا، جس خون اور جس گھر سے میری بیٹی کو غلیظ گالیاں ملی ان کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں بنے گا۔"

دھکے کھا کر جمال پلٹ گیا۔

"میں بدنام ہو چکی ہوں۔" وہ چلائی نہیں پر چلانا ضرور چاہتی تھی اس کے باپ نے کیسے دھکے دے کر جمال کو نکال باہر کیا تھا۔

"میں نے تمہارا رشتہ دیکھ لیا ہے بہت نیک لڑکا ہے۔" مختار احمد کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ ایسے کیوں بھڑک رہی ہے۔

"مجھے طعنے نہیں چاہیے۔"

"نہیں ملیں گے طعنے۔" اس کے بات کرنے کے انداز سے مختار احمد الجھے تو بہت لیکن سوچا بیٹی پاگل ہو رہی ہے صدمے سے۔

گھر میں جلد سے جلد حریم کی شادی کر دینے کی فضا بن گئی، جمال پھر آیا اسے پھر دھکے ملے۔

جمال نے کہا۔

"بھاگ آؤ گھر سے۔"

وہ بھاگ آتی اور پھر پیچھے اور بدنامی چھوڑ آتی ابھی تو بات چھپی ہوئی تھی پھر اور کھل جاتی۔

"مجھے جمال سے شادی کرنی ہے۔"

اس نے صاف صاف اماں سے کہہ دیا سوچا بھاگنے سے پہلے بہادری دکھا دے، اماں نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ کہیں اوپر سے آ گری ہو۔

"حریم!"

"اماں مجھ پر بہت الزام لگے ہیں، ان الزامات کی سچائی صرف جمال ہی جانتا ہے اور وہ ہی مجھے خوش رکھ سکتا ہے۔"

باپ اب تک گئی انہوں نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"جمال کا نام تو کیوں لیتی ہے، کون ہے وہ تیرا؟" اتنے دن مختار احمد جانے کہاں سوتے رہے تھے، اب لگا کہ بہت بڑی بھول ہوئی۔

"وہ میرا کچھ نہیں لگتا۔"

"جرمنی سے وہ یہاں تیرا ہی رشتہ مانگنے کیوں آیا ہے۔" مختار احمد کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تو اس کے حق میں کیوں بول رہی ہے، کیوں نکاح کرنا چاہتی ہے اس سے، باپ کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے، دانیہ کی باتیں سچ تھیں حریم۔" حریم ڈھیٹ بنی چپ کھڑی گردن سہلاتی رہی، رات کے پچھلے پہر اماں نے اسے گھر سے نکلتے دیکھا۔

جمال ذرا دور کار میں بیٹھا تھا، اماں نے پیچھے سے اسے جالیا۔

"آخری بار میرے ساتھ گھر چلو صبح ہی تمہارا نکاح پڑھوا دوں گی۔"

صبح ہی اس کا نکاح پڑھوا دیا گیا، رخصتی کے وقت اسے مختار احمد کی طرف سے ایک زوردار چانٹا پڑا۔

"تیرا باپ ہونے پر خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے۔"

☆☆☆

وہ دونوں جرمنی آ گئے، جمال نے نیا فلیٹ لیا تھا کرائے پر دو کمروں اور الگ کچن

کا، حریم نے بہت دل لگا کر اسے سجایا، یہ سجنے بننے کے کورسز ہی اس نے کیئے ہوئے تھے، ایف اے کرنے کے بعد وہ شادی تک چھ چھ تین تین ماہ کے بہت سے کورسز کرتی رہی۔

اسے پڑھنے سے خاص دلچسپی نہیں تھی عملی کام وہ بہت شوق سے کرتی تھی، گھر میں اس کا دم گھٹتا تھا، صبح سے شام گھر سے باہر ہی رہتی، کٹنگ کا کورس کیا تھا تو شام کو ایک مقامی بوتیک میں جاتی تھی وہاں نت نئے ڈیزائن کے ڈریسز انہیں کاٹ کر دے کر آتی، کبھی فارغ نہیں رہتی تھی، کبھی تھکتی نہیں تھی اور دماغ ہر وقت حاضر رکھتی تھی، طبیعت میں خاموشی تھی، زیادہ بولنے والوں کے پاس ٹکتی نہیں تھی، بادل گرج رہے ہوتے بجلی چمک رہی ہوتی اور یہ منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھ رہی ہوتی۔

اسے اپنا خالہ زاد پسند تھا لیکن وہ باہر گیا تو وہیں شادی کر لی، دو سال بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر آیا، واپس جاتے ہی اس کی بیوی نے طلاق لے لی، آخری بار دونوں انہی کے گھر آئے تھے، خالہ نے حریم کے لئے اسی بیٹے کا رشتہ مانگا تو حریم سے پوچھ کر ابا اماں نے ہاں کر دی، چھ ماہ منگنی رکھ کر حریم نے انکار کر دیا، رو رو کر بے ہوش ہوتی رہی ابا اماں کو ایک ایک تفصیل سنائی کہ اس کی پہلی بیوی نے فون کیا تھا دلاور کے بارے میں کیا کیا انکشافات کیئے۔

منگنی ٹوٹی تو وہ انکشافات زبان زد عام ہوئے، دلاور چھوڑ دلاور کی اماں خاندان میں کسی سے رشتہ مانگنے کے قابل نہ رہیں۔

تو یہ حریم تھی، جو بہت خوبصورت تھی، اماں کہتیں کہ کوئی شہزادہ ڈھونڈے گی اس کے لئے اور شہزادہ ہی ڈھونڈا تھا ہاشم، خوبصورت تھا جمال کی طرح ہی، لیکن جمال جمال تھا اور ہاشم ہاشم۔

بس اس کی نظریں باندھ لیں تھیں جمال نے، وہ جو ایک ملکہ کی سی شان رکھتی تھی جھٹ پٹ تخت سے نیچے آ گئی اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ لگا کر ساری عمر بیٹھ کر اسے دیکھے، اگر یہ سب تصویر دیکھتے ہی اس پر طاری ہوا ہوتا تو اس گھر میں ایک ہی لڑکی کی بارات آتی، حریم کی اور وہ جمال لاتا، وہ سقراط بقراط کی طرح ذہین نہیں تھی دراصل وہ سقراط بقراط ہی تو نہیں تھی، وہ جھٹ پٹ لڑکی تھی، وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو کسی پرندے کو مردہ دیکھ کر ”اوہ“ کہتے ہیں اور کچھ تو اٹھا ہی لیتے ہیں کہ شاید چند قطرے پانی پلانے سے زندہ ہو جائے، وہ ان میں سے تھی جو ”مردہ پرندے“ کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی پاؤں مار دیتے ہیں کہ راستے میں آیا پڑا ہے گھن آتی ہے۔

”پاؤں مارنے کا بہانہ۔“

ایک بار وہ عین سڑک کے درمیان ایک بٹن ڈھونڈتی رہی تھی جو اس نے لاہور سے اپنے ماموں سے منگوایا تھا اور سلائی سینٹر سے واپسی پر وہ شاپر میں سے نکل گیا تھا، اس نے چھوٹا سا بٹن ڈھونڈ کر ہی دم لیا جو پورے سرگودھا شہر میں کسی بھی بڑی دوکان سے کسی بھی صورت نہیں مل سکتا تھا۔

تو وہ اتنے حوصلے والی، اتنی مستقبل مزاج لڑکی تھی گھبرائی نہیں تھی، نہ ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھولتے تھے، نہ ہی اس کی شکل پر بارہ بجتے تھے، وہ روتی تھی تو بس روتی ہی تھی ضروری نہیں کہ وہ روتے ہوئے دکھی بھی ہو، ہنستے ہوئے خوش بھی ہو، ہاں جو کچھ بھی ہو، وہ

حریم کے علاوہ کسی کو نہیں بتائے گی کہ کیا ہو رہا ہے کیا ہونے جا رہا ہے، اس کی دس بارہ پندرہ سہیلیاں تھیں جن کے گھر وہ آئے دن جاتی۔

دراصل اس کی کوئی بھی سہیلی نہیں تھی کیونکہ وہ کسی کے بھی کان میں نہ گھستی نہ ہی وہ کسی کے گلے سے لگ کر روتی، وہ ان کے ساتھ ہنستی، کھاتی، مزے کرتی، بس وہ اسی کام کے لئے تھیں، وہ سہیلیاں نہیں تھیں، وہ بھی کسی کی سہیلی نہیں تھی، چند ایک بیاہ کر گئیں تو وہ ان کے نام تک بھول گئی۔

تو......تو اس نے جمال کو دیکھا اور جمال اس کا ہوا، کیسے...... کب اور کیوں وہ کیوں سوچے، اس نے گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھا اور جمال کے لئے یہی کافی رہا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، نہ بھی ہوتا تو وہ کر لیتی، کرنا چاہتی تھی، اب جرمنی آئی تو جمال کو جھکائے بھی رکھتی خود جھکی بھی رہتی، دنیا انہی کے لئے جنت ہے، دنیا انہی سے جہنم ہے۔

ہفتے اور مہینے دل لگی اور دل وابستگی میں گزر گئے، گھومنا پھرنا اور باہر کے کھانے، جمال نے اس پر تحائف کی بارش کر دی تھی، ان دونوں نے کبھی ایک بار بھی نہ سوچا کہ وہ اپنے پیچھے کیا کر آئیں ہیں، کیا کچھ اجاڑ آئیں ہیں، ان کے قفس پر وہ قفل لگے تھے جو قفس والا خود بخوشی لگاتا ہے اور چابی، توبہ کی چابی ڈھونڈتا بھی نہیں اور ڈھونڈنا چاہتا بھی نہیں۔

تو یہ دو قفل والے اپنے آپ میں مگن تھے، بہت زیادہ خوش تھے جیسے کہ کبھی حویلی والے تھے اور پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے انہیں سالوں کے لئے الگ کر دیا۔

☆☆☆

دانیہ ایک سکول میں پڑھانے لگی تھی وہ ایک بیٹی حاجرہ کی ماں بن گئی تھی، پہلے وہ صرف ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے، جیسے کہ احسان کرتے والوں کا کیا جاتا ہے جیسے کہ مدد کرنے والوں کا کیا جاتا ہے، پھر وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگیں جیسے چھوٹے بچوں کو پسند کیا جاتا ہے ان کی معصومیت اور ان کی صفات کی وجہ سے، ان کی فرشتہ صفتی کی وجہ سے۔

وہ ایک دوسرے کے لئے اہم تر ہو گئے، محبوب ترین ہو گئے، غلطی سے بھی وہ لوگ گزرے وقت کا ذکر نہ کرتے، خیال آ جاتا تو خدا کی پناہ مانگتے نہ زیادہ سوچتے نہ ہی تذکرہ کرتے، چند سال گزرے تو تایا جی، تائی جی اسے عمرے کے دوران ملے اس نے ان کے پیر پکڑ لئے، ناچار تایا جی اس کے ساتھ اس کے گھر گئے دو دن رہے، حاجرہ اور حلیمہ سے کافی مانوس ہو گئے ہاشم کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ دو دن اس کے ساتھ رہ گئے تھے انہوں نے اسے بیٹے کی طرح پالا تھا اور ناز نخرے اٹھائے تھے اور وہ ایک بیٹے کی طرح ہی ان کی خدمت کرنا چاہتا تھا، اگر یہ نہیں ہو سکا تھا تو اس سے کم ہی سہی، وہ سب کا نام لے لے کر پوچھتا رہا، تایا جی اسے یہ نہیں بتا سکے کہ اس کا نام خاندان میں لینا حرام ہی سمجھو، سرگوشیوں میں بھی ان دونوں کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، وہ اب وہ نہیں رہے، وہ اب وہ نہیں بن سکتے، بڑھاپے میں اب وہ یہی دعا کرتے ہیں کہ انہیں ان کی والدہ جیسا بستر مرگ نہ ملے جس صدمے سے ان کی جان گئی وہ صدمہ انہیں نہ ملے، دعائیں تو وہ بہت کرتے تھے اور ساری دعائیں ڈرتے ہی کرتے تھے اور ڈر ڈر کر ہی زندہ تھے، وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے ہیں

وقت سے پہلے اپنا آپ مار بیٹھے ہیں، ان کے دل میں کوئی حسرت اور چاہ نہیں، وہ آنے والے ہر وقت سے ڈرتے ہیں، پہلے وہ ہر حال میں خوش تھے، اب وہ ہر خوشی میں خوفزدہ ہیں، اب وہ شکر ادا کرتے ہیں اور صابر ہیں، بس وہ کسی صورت بھی خوش نہیں ہیں۔

لیکن جرمنی میں موجود وہ دونوں پل پل ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے، وہ پل پل جی رہے تھے، جیسے جمال کوئی شہزادہ ہو اور دانیہ دنیا کی آخری ملکہ، تو وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے باقی اور کافی۔

☆☆☆

آفس کے کام سے جمال قریبی دوسرے شہر میں گیا تھا، دو دن بعد رات گئے ہفتے کی رات واپس آ رہا تھا اسے گھر آنے کی بہت جلدی تھی اور اس کی کار ہواؤں میں باتیں کر رہی تھیں، اس جلدی اور تیز رفتاری نے دوسری کار سے حادثہ کروا دیا جمال کی کار کی ٹکر سے دوسری کار الٹ گئی اور دو بچے اور ایک عورت موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے، جمال نے رک کر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی اور اڑے ہوئے بونٹ کے ساتھ اپنی کار بھگا لے گیا۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد اسے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا، وہ اس وقت بھی نشے میں تھا، اسے جیل بھیج دیا گیا، اخبارات میں خوب شور اٹھا، مرنے والے دو بچے اور عورت آفس میں کام کرنے والے اس کے کولیگ کے بیوی بچے تھے اس کا یہ کولیگ عربی تھا اور آفس میں کئی بار ان کی ناچاقی ہو چکی تھی، عجیب اتفاق تھا۔

اخبارات اور ٹی وی چینلو نے اتنا ہنگامہ کیا کہ حریم کو یقین ہو گیا کہ وہ چند دن میں ہی اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر ختم کر دیں گے، لیکن ڈیڑھ سال مقدمہ چلا اور جمال کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔

جب وقت جج نے یہ فیصلہ سنایا دونوں ہی کمرہ عدالت میں بے ہوش ہو کر گر گئے، دونوں کو ہی سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا، معاشی طور پر حریم کنگال ہو چکی تھی، مقدمے کے لئے اس نے رات دن کام کیا تھا، ایک ایک پیسہ جوڑا تھا بھوکی پیاسی رہی تھی رو رو کر برا حال کر لیا تھا اس نے اپنا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔

حاصل ہوئی تو وہ جدائی جسے اب وہ ختم نہیں کر سکتے تھے وہاں ہاشم اور دانیہ نہیں تھے کہ الزام لگایا، ان سے الگ ہوئے اور خود ایک ہو گئے، وہ میاں بیوی اب الگ الگ تھے، حریم کو دو کمروں کا وہ فلیٹ چھوڑنا پڑا جس کا کرایہ اب وہ ادا نہیں کر سکتی تھی وہ ایک کمرے کے ایک بوسیدہ فلیٹ میں آ گئی جمال کے ساتھ اس کی محبت اور بڑھ گئی تھی وہ اس کے سامنے روتا تھا تو وہ گھر آ کر روتی تھی، وہ ایک پل اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور اب وہ کئی مہینے اس کے بغیر رہ چکی تھی، دونوں کو موت آ جاتی لیکن یہ نہ ہوتا:

”تمہاری آنکھیں بہت چمکتی ہیں، کسی سے ملتی ہو جو اتنی بہار پر ہیں یہ۔“ اب وہ ایسی باتیں کرتا۔

”نہ ملنے آیا کروں؟“

”تم تو یہی چاہتی ہو۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”طلاق دے دونگا میں تمہیں۔“ چلا کر کہا۔

”دے دو، ابھی دے دو۔“ وہ بھی چلائی۔

”طلاق لو گی مجھ سے، مجھ سے۔“ ہسٹریائی۔

”تم ہی چاہتے ہو دینا۔“ سکون سے کہا۔

”تم چھوڑ کر بھاگنا چاہتی ہو مجھے، بھاگ جاؤ گی، چھوڑ جاؤ گی مجھے۔“ اب وہ رونے پر آ گیا۔

”اگر میں بھاگی تو تمہارے اس رویے کی وجہ سے بھاگوں گی، تم ایسی گھٹیا باتیں کیوں کرتے ہو۔“

”صرف ایک بار کہہ دو کہ تم کسی سے نہیں ملتی۔“

”ہزار بار کہہ چکی ہوں، نہیں...... نہیں...... پورے پاگل ہو چکے ہو تم، میں اب نہیں آؤں گی تم سے ملنے۔“

”مت آنا دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ پوری قوت سے چلایا۔

لیکن اگلی بار وہ اس سے ملنے پھر چلی جاتی، کیونکہ وہ اسے دیکھے بنا رہ نہیں سکتی تھی، اسے سنے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔

دن بدن وہ پاگل ہوتا جا رہا تھا، نشہ کرنے سے، بڈھا کھوسٹ دیکھنے لگا تھا۔

جب قید کاٹ کر وہ باہر آیا تو ایسے نظر آتا تھا جیسے صدیوں صحرا میں بھوک پیاس سہہ کر بھٹک کر، اجڑ کر، زمین پر آیا ہے، وہ جنگل کا وہ باسی تھا جو غار میں ایک رات سونے کے لئے گیا اور غار کا دھانہ بند ہو جانے سے اندر ہی چیخ چلا کر مردہ ہو گیا اور اب یہ مردہ سانس لیتا باہر آیا ہے۔

اور حریم وہ ایک ایسی عورت کی آدھ زندہ لاش ہے جسے اونچائی پر لے جا کر، گلے میں پھندہ ڈال کر صدیوں لٹکائے رکھا، نہ پھانسی دی نہ پھندا کھولا، اب اس کی گردن لٹک کر اتنی لمبی ہو چکی ہے کہ اس کے پیروں کے ساتھ چلتی ہے، مقدمے کے فیصلے کے وقت وہ گر کر بے ہوش ہو گئے تھے اب ملے تو وہ جوش و خروش بھی جاتا رہا۔

وہ پاکستان آ گئے اور ایک چھوٹے سے شہر کے ایک چھوٹے سے علاقے میں ایک دو کمروں کا گھر کرائے پر لے لیا۔

حریم کام کرتی تھی اور جمال نشہ کرتا تھا، یا وہ اسے گالیاں دیتا، یا بڑبڑاتا رہتا۔

شروع شروع میں محلے والے ان کے یہاں آتے جاتے پھر بات ایک نے سنی اور پھیل کر دور تک گئی،

نشے میں جمال بڑبڑا رہا تھا، اپنے ماں باپ کو گالیاں دے رہا تھا اور اور خدا کو۔

نشے میں جمال بڑبڑاتا اور چلاتا۔

اور ہاشم کا بیٹا بشر الاسد مقامی مسجد میں اذان دیتا، اس کی اذان سننے والوں کے دلوں پر وجد طاری کر دیتی اور اس کی پکار پر لبیک کہتے جوق در جوق اللہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگتے بے شک وہ خدا بڑا رحیم ہے رحمان ہے، وہ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، تنہا تو شیطان چھوڑتا ہے اپنے پیروکاروں کو وہ دنیا میں بھی رسوا اور آخرت میں بھی خالی ہاتھ رہتا ہے۔

☆☆☆

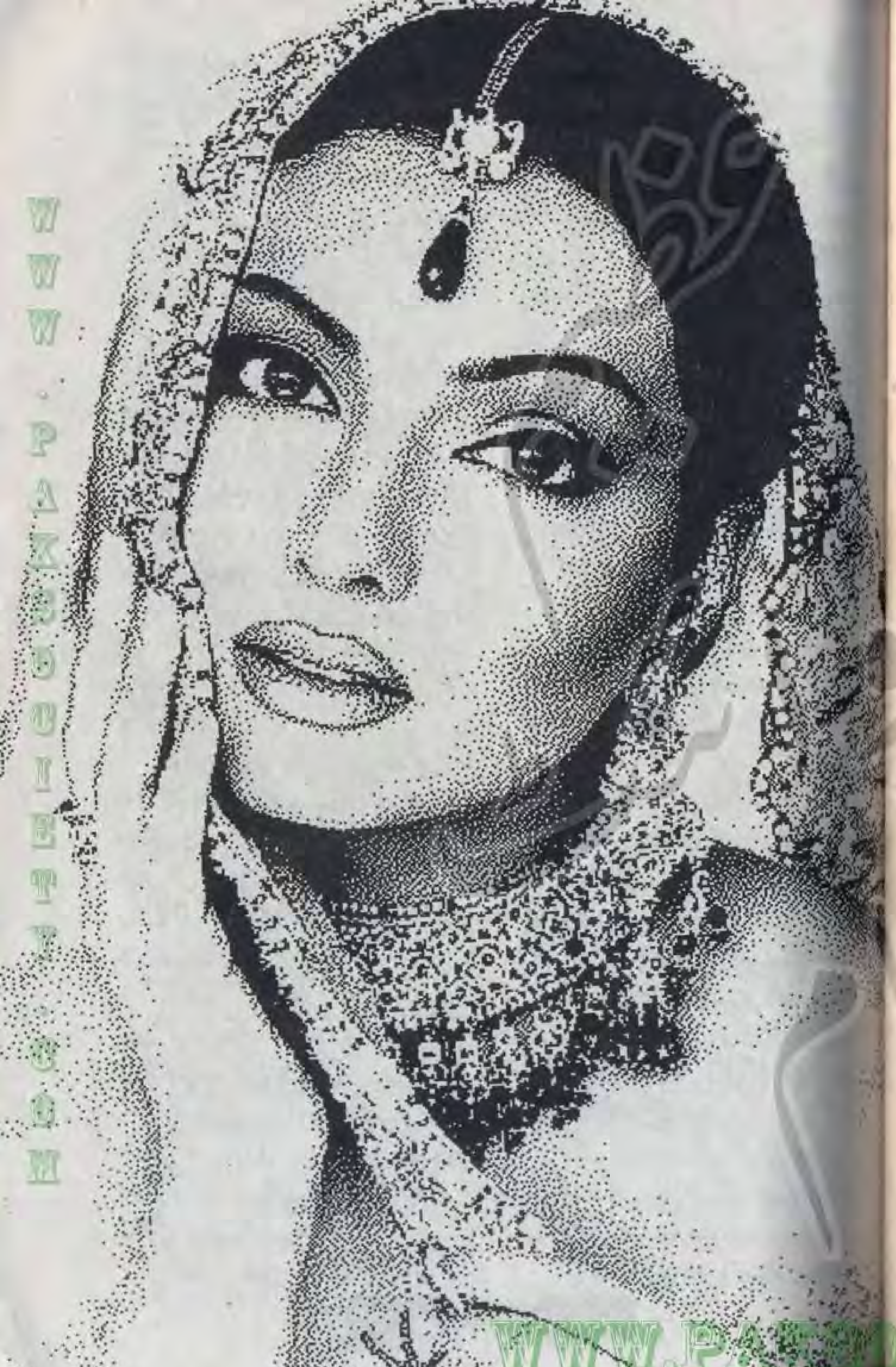

کاسۂ دل

سندس جبیں

گیارہویں قسط

اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دیکھا، ایمبولینس کا ہوٹر اب بند ہو چکا تھا، وہ تیزی سے واپس پلٹی، احتیاط سے پردہ برابر کیا عباس سو رہا تھا، جبھی وہ اسے ڈسٹرب کیے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی، لاؤنج خالی تھا، وہ جلدی سے وقار کے کمرے کی طرف بڑھی، بے تاب سی دستک دی پھر دوبارہ دی، کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا، آمنہ تھیں سوئی آنکھیں لئے رات کے لباس میں۔

''بھابھی! بھائی کہاں ہیں؟ باہر ایمبولینس آئی ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''کیا؟ ایمبولینس مگر کیوں؟'' آمنہ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں، وہ تیزی سے واپس مڑیں اور سوئے ہوئے وقار کا شانہ ہلانے لگیں۔

''وقار! اٹھیں وقار باہر ایمبولینس آئی ہے، یا اللہ خیر! ہمارا تو گھر سے کوئی بھی باہر نہیں تھا۔'' وہ بڑبڑائی تھیں، وقار کی نیند یکدم ٹوٹی تھی وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھے، پھر افراتفری میں جوتا پہن کر باہر لپکے تھے، سبین بھی ساتھ ہی تھی جبکہ آمنہ افتاداں وخیزاں لباس تبدیل کرنے کو لپک گئیں، وقار معاملہ معلوم کرنے کے لئے باہر بڑھے تھے، سبین واپس ہوئی اور امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، انہیں بتایا تو وہ بھی بے حد پریشان ہو گئیں، اسی وقت وقار واپس آ گئے، ان کا رنگ فق ہوا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی، سبین نے انہیں بے حد پریشانی کے عالم میں طارق چچا کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا تھا، بات اتنی بڑی تھی کہ چند لمحوں میں ہی پورے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔

ناولٹ

''شاہ نواز ایک کار ایکسیڈنٹ میں وفات پا گیا تھا۔'' نیو یارک سے ایاز اس کی میت لے کر پاکستان آیا تھا۔

پتا نہیں ''مغل ہاؤس'' کی خوشیوں کی معیاد اتنی مختصر کیوں ہوتی تھی؟ سبین نے عباس کو اپنے آنسو چھپانے کی خاطر ہتھیلی آنکھوں پر رکھتے دیکھ کر سوچا تھا، دکھ اتنا بڑا تھا کہ ہر آنکھ اشکبار تھی، شاہ بخت کا ردعمل سب سے زیادہ خوفناک تھا، وہ سویا ہوا تھا جب اسے جگایا گیا اور اس ہولناک حادثے کا بتایا گیا تو وہ ننگے پیر ہی باہر بھاگا تھا، پھر اس کی پھٹی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا، لاؤنج کے بیچوں بیچ میت کا بند تابوت، بڑے تایا کے سینے سے لگ کر روتے طارق چاچو (شاہ نواز اور شاہ بخت کے والد) دھاڑیں مار مار کر روتی نیلم چچی، رمشہ، علینہ، کومل، مہتاب تائی، نبیلہ چچی اور سب کو سنبھالنے کے چکر میں نڈھال سی اپنے آنسو پونچھتی آمنہ اور سبین۔

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا، ایک جامد ٹھہری ہوئی نگاہ اس بند تابوت پہ ڈالی اور پھر کسی روبوٹ کی طرح پیچھے ہٹتا ہوا سیڑھی پہ جا بیٹھا، عباس اس کے پاس آ کر اسے ساتھ لگا کے رونے لگا، مگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا، نظریں تابوت پہ جمائے۔

''بخت...... کچھ بولو...... ایسے چپ نہ رہو۔'' وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، وہی جامد چپ طاری تھی اس پہ۔

وقار فون پہ سب دوست احباب کو بہت افسردگی اور رنجیدگی سے اس حادثے کی اطلاع دے رہے تھے، ایاز سرخ آنکھیں لئے خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔

''بابا...... بھائی...... امی! کوئی اس کو ہلائے، یہ کچھ بول کیوں نہیں رہا۔''

وقار نے فون سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے، نیلم چچی بھی اس کی طرف آ گئیں، عباس نے ایک طرف ہٹ کر انہیں جگہ دی تھی، انہوں نے پاس بیٹھتے ہوئے شاہ بخت کو ساتھ لگا لیا اور رونے لگیں۔

''روتا کیوں نہیں تو، چلا گیا ہو، جس کا تجھے انتظار رہتا تھا اب نہیں آئے گا وہ، رو لے آج کھل کے۔'' وہ اس کا بازو ہلا رہی تھیں، مگر شاہ بخت کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا، لوگ اکٹھے ہونے لگے، افسوس، اظہار تعزیت، آنسو، تسلی دلاسے، سبھی کچھ چلتا رہا، دو گھنٹوں بعد اس کی میت کو دفنانے کا وقت آ گیا، جنازہ اٹھانا تھا۔

وقار، ایاز، عباس اور بخت چار کندھے پورے تھے، مگر بخت اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا، وقار نے اس کی منتیں کی چھوڑیں تھیں۔

''بخت! وہ تمہارا منتظر ہے اسے کندھا نہیں دو گے، حق ہے اس کا، اٹھ جاؤ میرے بچے، ہمت کرو اسے اب کسی کی ضرورت نہیں رہی مگر تمہارا فرض تو بنتا ہے نا، اس کا آخری حق اسے دے دو بخت، چلو میرے ساتھ اٹھو۔'' وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرتے نڈھال ہوئے جا رہے تھے، وہ اسی طرح بے حس و حرکت رہا، اس کا وجود گویا پتھر کے بے جان ٹکڑے میں ڈھل گیا تھا، ناکام ہونے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے وقار! اسے سکتہ ہو گیا ہے۔'' احمر مغل خوف و حیرت میں مبتلا صدمے سے بولے تھے۔

اس کی حساسیت و جذباتیت تو سب پہ عیاں تھی، شاہ بخت کی حالت میں جب کسی طرح بھی کوئی فرق نہ پڑا تو مجبوراً اسے ہاسپٹل لے جانا پڑا تھا، اس کے پرانے معالج ڈاکٹر سلطان بے حد متفکر ہو گئے تھے جب سارا معاملہ ان کے علم میں آیا تھا۔

''آپ کو اچھی طرح علم ہے وقار! شاہ بخت کی ذہنی حالت کیسی ہے؟ وہ خوفناک حد تک Sensitive ہے، پھر بھی آپ نے اتنی بڑی اطلاع یوں ایکدم سے اسے دے دی، آپ کو چاہیے تھا پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کر لیتے۔'' انہوں نے وقار کو ڈانٹا تھا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے ڈاکٹر مگر اس وقت سچویشن اس طرح کی تھی کہ کسی کو بھی اس چیز کا دھیان نہیں رہا۔'' وقار ایک طویل سانس لے کر بولے تھے۔

''بہرے حال میں ٹریٹ منٹ شروع کر رہا ہوں، ہوپ فار دا بیسٹ۔'' وہ آگے بڑھ گئے، آدھے گھنٹے بعد وہ انہیں اپنے آفس میں لے گئے۔

''فی الحال اسے ٹرینکولائزر کے زیر اثر رکھا گیا ہے، اس کی حالت نازک ہے ایسے میں ہم اسے اگر Adrenaline کا انجکشن دے کر رلانے کی کوشش کرتے یا اس کے اعصاب میں ہیجان پیدا کیا جاتا تو یہ اس کے لئے مزید نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا، نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ بھی تھا، چونکہ اس کی یہ حالت پچھلے کئی گھنٹوں سے تھی اس لئے مجھے خدشہ تھا کہ اگر نارمل سکتہ کے پیشنٹس والا ٹریٹ منٹ کیا گیا تو اس کے برین میں خدانخواستہ کوئی پرابلم کریٹ ہو سکتی تھی، اس صورت حال میں جبکہ وہ میگرین کا پیشنٹ بھی ہے، فی الحال اسے چند گھنٹوں تک Sedatives کے زیر اثر رکھا جائے گا اس کے بعد جب اسے ہوش آئے گا تب دیکھا جائے گا کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔'' وہ تفصیل بتا کر چپ ہو گئے، وقار کچھ کہے بغیر ٹیبل پہ کچھ کریدتے رہے۔

''آپ نے بتایا نہیں وقار! ہوا کیا تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ بتانے کے لئے ہے ہی نہیں ڈاکٹر، شاہ نواز گزشتہ کئی سالوں سے نیو یارک میں تھا، شاہ بخت کا بڑا بھائی تھا، بخت بچپن میں اس سے بہت اٹیچ رہا تھا، جب اس نے بی اے کے ایگزامز دیئے تو چھٹیوں میں نواز کے پاس چلا گیا، بس وہیں سے یہ ''سر درد کی سوغات'' لایا تھا، پھر پتا نہیں اس کو کیا ہوتا چلا گیا، گھر میں اگر کوئی نواز کی بات کرتا تو جھگڑ پڑتا، یوں جیسے اسے نواز کے نام سے چڑ ہو گئی ہو، خیر چند ماہ پہلے بخت پھر نیو یارک گیا تھا، اس مرتبہ وہ نواز سے ملا یا نہیں، میں نہیں جانتا، میں نے یہی سمجھا کہ لازماً وہ اس سے نہیں ملا ہو گا جبھی اس نے مجھ سے تذکرہ نہیں کیا تھا اور اب یوں اچانک شاہ نواز کی کار ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ، بہت دل دہلا دینے والا حادثہ ہے ہماری فیملی کے لئے، چاچو اور چچی کی حالت بہت بری ہے، احمر چاچو کو چند ماہ پہلے ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا، پتا ہی ہے آپ کو، عباس بھی بیمار ہے، پتا نہیں یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔'' وقار بے حد پریشان اور افسردہ تھے۔

''اللہ پاک آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آزمائشیں دور کرے آمین۔'' ڈاکٹر سلطان نے ان کا شانہ تھپتھپایا تھا، وقار سر ہلا کر اٹھ گئے۔

گھر فون کر کے انہوں نے سب کی تسلی

کروا دی تھی، کسی کو بھی آنے سے سختی سے منع کر دیا تھا، کہ عباس کی طبیعت پہلے ہی ناساز تھی، ایاز کسی گنتی میں تھا ہی نہیں، بابا دونوں چاچوؤں کو سنبھال رہے تھے جبکہ خواتین ہاسپٹل آ کر صرف مزید پریشان ہی ہو سکتی تھیں، اس وقت شام ڈھل رہی تھی جب شاہ بخت کی آنکھیں کھلیں۔

☆☆☆

مر جانا، چلے جانا نہیں ہوتا
چلے جانے والے کبھی نہ کبھی ضرور لوٹ آتے
ہیں
نا بھی آئیں، آس پھر بھی رہتی ہے
مر جانے والے کبھی نہیں لوٹتے
نا ہی کوئی امید، کوئی آس، کوئی چراغ
کوئی لو باقی رہتی ہے
بس رات رہ جاتی ہے
کالی، سیاہ رات
کال دکھ جیسی
دکھوں کے بھی رنگ ہوتے ہیں
موت کا دکھ کالا ہوتا ہے
سیاہ اور تاریک
مر جانے والے کبھی نہیں لوٹتے
اور پیچھے رہ جانے والوں کو روند جاتے ہیں
کالے اور سیاہ رنگ والے دکھ کے پتھروں
تلے

وقار کا مہربان چہرہ اس پہ جھکا تھا، شاہ بخت کی احساس سے عاری نگاہ ان کے چہرے سے ٹکرائی اور یکلخت زندہ ہو گئی، وہ آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا تا حال وہ سیلپنگ سوٹ میں تھا، یہ ایک سیاہ شرٹ اور ٹراؤزرز تھا جس پہ سلور پٹی تھی شرٹ کے ایک دو کو چھوڑ کر سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

”بھائی! وہ چلے گئے، مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا تھا، وقار نے اسے گلے لگا لیا۔

”ایسا کیوں کیا انہوں نے میرے ساتھ؟ میں نے ان کی ہر بات مانی پھر بھی وہ......وہ جو کہتے گئے میں کرتا گیا، میں اب کیا کروں؟ انہوں نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا آنے کا، انہوں نے اپنا وعدہ کیوں توڑ دیا؟“ وہ بے حد خوفزدہ تھا، یوں جیسے اپنے آنسوؤں کو روک رہا ہو۔

”اب میں کیسے انہیں ان کا وعدہ یاد دلاؤں گا؟ وہ ایسے کیوں چلے گئے، مجھ سے بات کیے بغیر، وہ تو کہتے تھے وہ پاکستان آئیں گے، میرے ساتھ رہیں گے، سوئمنگ کریں گے، رگبی کھلیں گے اور خوب گھومیں گے، وہ تو......انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت سارے دن میرے ساتھ رہیں گے، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے، انہوں نے شرط رکھی تھی، میں نے مان لی۔“ وہ اب گھٹ گھٹ کر آہستہ سے رو رہا تھا، وقار بھی رو رہے تھے۔

”کیسی شرط؟“ وہ اس کی پشت سہلاتے چونک سے گئے۔

”انہوں نے کہا تھا، بخت! مجھے کچھ رقم چاہیے کسی سے ادھار لیا ہے وہ چکانا ہے، میں نے فوراً کہا میں آپ کو اپنے اکاؤنٹ میں سے نکلوا دیتا ہوں، انہوں نے انکار کر دیا، کہنے لگے اس سے گھر کے افراد شک میں پڑ جائیں گے کہ اتنی بڑی رقم تم نے کہاں خرچ کی، تم بس میرا کہا مان لو، میں کیا کرتا، میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا میں نے حامی بھر لی اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے شوٹ کروانا چاہ رہے ہیں، مجھے نیویارک میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ میری کمرشل ویلیو سے آگاہ ہو چکے ہیں، مگر میرا کسی کے ساتھ کام کرنے کا موڈ نہیں تھا، مگر نواز بھائی نے مجھے مجبور کر دیا، میں نے انہیں بے حد سمجھایا کہ میں نے ہمیشہ سولو شوٹ کیے ہیں مجھے کپل شوٹ کا کوئی تجربہ نہیں، مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی، یوں میں نے ان کے دباؤ میں آ کر فینسی مالکم کے ساتھ کپل شوٹ کیا، میں نے سب سے جھوٹ بولا، آپ سے بھی، آپ مجھ سے پوچھتے رہے، کہ میں نے یہ سب کس وجہ سے کیا، کس کے کہنے پہ کیا؟ مگر میں نے آپ کی ساری ڈانٹ کھا لی، آپ نے سخت سے سخت الفاظ استعمال کیے میرے لئے مگر میں نے منہ نہیں کھولا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی نظروں میں ان کی عزت و وقعت کم ہو جائے، میں قطعاً یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا، جبھی میں نے آپ کو سچ نہیں بتایا اور دیکھیں انہوں نے مجھ سے اپنی ساری باتیں منوا لیں مگر میری ایک بات کبھی نہیں مانی، مجھے استعمال کیا انہوں نے اور ہمیشہ کی طرح جھوٹی آس پہ ٹرخا کے خود کہاں چلے گئے ہیں؟ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔“ اب اس کا رونا مزید کربناک ہو گیا۔

وقار سن ذہن کے ساتھ سب سن رہے تھے، البتہ دل میں یکا یک شاہ نواز کے خلاف نفرت کا طوفان سا ابل پڑا تھا آخر وہ ہی ذمہ دار تھا شاہ بخت کو ورغلانے کا، اسے مس یوز کرنے والا، اس لمحے انہیں اس کی موت کا ذرا بھی دکھ نہیں ہو رہا تھا، اس قدر خود غرض شخص اسی سزا کا مستحق تھا، مگر ابھی کچھ مزید ایسا تھا جو ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔

☆☆☆

ستارہ کو ڈاکٹر شاہ کے کلینک پہ کام کرتے دو ہفتے ہو چکے تھے، کام زیادہ مشکل نہ تھا، اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے، ڈاکٹر کی غالباً اس وقت کوئی اپائنٹ منٹ نہیں تھی، جبھی اس نے ستارہ کو چائے بھجوانے کا کہا، اس سے پہلے کہ ستارہ چائے کا آرڈر دیتی، اسے کسی کے آنے کی اطلاع ملی، وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”آپ بھیج دیجئے گیسٹ کو۔“ اس نے انٹر کام اٹھا کر کہا، اسی وقت اسے قدموں کی چاپ سنائی دی، اس نے سر اٹھائے بغیر آنے والے کو بیٹھنے کا کہا۔

”ہیلو مس!“ کسی قدر بھاری اور مکمل غیر ملکی لہجہ۔

”یور نیم۔“ اس نے انٹر کام اٹھاتے ہوئے پوچھا، انگلیاں ہنوز نمبر ڈائل کرنے میں مصروف تھیں۔

”معصب شاہ۔“

”سر کوئی معصب شاہ آئے ہیں۔“ اس نے رابطہ ملنے پہ کہا۔

”جی اوکے سر۔“ اس نے ریسور رکھ کر کہا۔

”آپ جا سکتے ہیں۔“ اس نے کہتے ہوئے پہلی بار سر اٹھایا تھا اور اگلی بات کرنا بھول گئی، آنکھیں چندھیا سی گئیں، اتنی دھما کے دار ٹھکا دینے والی اور جھٹکا دار پرسنالٹی تھی مقابل کی خالصتاً غیر ملکی نقوش، خوبصورت سنہرے بال اور گہری سبز آنکھیں، اس نے تیزی سے سر جھٹک کر خود پہ قابو پایا تھا۔

وہ نا سمجھنے والے انداز میں اس کو دیکھتا رہا، ستارہ کو لگا شاید وہ اردو سے نابلد تھا۔

"Dr, shaw is waiting for hou, you may go" اس بار وہ شستہ انگریزی میں بولی تھی۔

مقابل کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی، ستارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"شکریہ محترمہ۔" وہ اردو میں کہہ کر اٹھا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"ایں، یہ مجھے بے وقوف بنا کر گیا ہے۔" اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

ڈسے ہوئے لوگ تریاق نہیں بنتے، چوٹ کھایا ہوا شخص کسی کو کچھ نہیں دے سکتا سوائے نفرت اور اذیت کے اور انا اور مردانگی پہ ہوا حملہ مرد کسی قیمت پہ معاف نہیں کرتا اور حبا اتنے سنگین جرائم میں ملوث تھی؟

پتا نہیں پہلے اسے ان سب باتوں کی سمجھ کیوں نہیں آئی تھی اور پتا نہیں اسے پہلے کسی بھی بات کی سمجھ کیوں نہیں آئی تھی، اسید کہتا ہے:۔

"جو لوگ اندر سے بدصورت ہوتے ہیں، خدا ان کی شکلیں بھی بدصورت اور بھیانک بناتا ہے۔"

وہ ٹھیک کہتا ہے حبا تیمور کیا تھی، بدصورتی کا مجسمہ، ایک جھوٹی مکار اور سازشی ذہنیت رکھنے والی لڑکی، جس کا ظاہر بھی اس کے سیاہ اور مکروہ دل کی طرح گھناؤنا بدصورت اور بھیانک ہے۔

اب اس نے تسلیم کر لیا ہے، پہلے وہ جھگڑتی تھی، زور زور سے بولتی تھی اسے یاد دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ اسے کہا کرتا تھا، چہرے مہرے، حسب نسب اور مالی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔

"اللہ صرف دل دیکھتا ہے، تقویٰ دیکھتا ہے۔"

مگر اب وہ جھگڑتی نہیں تھی، وہ بھلا کس بنا پہ جھگڑا کرتی، اسید اتنا سچا تھا، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا، جبکہ اس نے تو ساری زندگی جھوٹ ہی بولا تھا۔

اسید کہتا ہے:۔

"اللہ حسین ہے اور حسن پسند کرتا ہے۔"

جبکہ وہ تو بدصورتی کی اعلیٰ ترین مثال ہے، گندگی اور غلاظت کا ڈھیر ہے، جس سے صرف تعفن ہی اٹھتا ہے، جس طرح دھتورے میں سو سال شہد ٹپکاتے رہو، وہ میٹھا نہیں ہوتا اسی طرح وہ بھی کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔

وہ کہتا ہے۔

"تم ناپاک ہو، غلاظت کا ڈھیر ہو۔"

جب وہ نماز پڑھتی ہے تو وہ بڑی حقارت سے اسے دیکھتا ہے اور ہنستا ہے۔

"تم اتنا دھوکہ کیسے کر لیتی ہو حبا تیمور! انسانوں سے بھی دھوکہ، اللہ سے بھی دھوکہ، یہ مکاری یہ ریاکاری تمہیں دوزخ تک لے جائے گی اور تمہیں پتا ہے اللہ کو مکاری پسند نہیں، وہ تمہیں پسند نہیں کرتا میری طرح، کیونکہ وہ بھی تمہاری حقیقت جانتا ہے اور جب سب لوگ جان جائیں گے تو وہ بھی تم سے نفرت کریں گے اور تمہارے منہ پہ تھوک دیں گے، جس طرح کے میں۔" وہ اس پر تھوک دیتا ہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے مگر اب اسے تذلیل نہیں محسوس ہوتی، وہ اتنا خوبصورت، اتنا وجیہہ اور شاندار ہے، وہ غلط نہیں کہہ سکتا، وہ بالکل ٹھیک کرتا ہے اس کے ساتھ، وہ کہتا ہے، "محبت صرف خوبصورت لوگوں سے کی جاتی ہے۔" وہ صحیح کہتا ہے، بھلا

بدصورت لوگ کہاں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان سے نرمی برتی جائے، ان سے محبت کی جائے، نہیں وہ کچھ ڈیزرو نہیں کرتے، حبا تیمور کچھ ڈیزرو نہیں کرتی، ہاں...... پہلے وہ جھگڑتی تھی، روتی تھی، کہتی تھی۔

“اسید! مجھے جو دل چاہے کہو، مگر میری محبت پہ شک نہ کرو، میں نے تمہیں بہت چاہا ہے۔” وہ دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور وہ بہت استہزائیہ ہنستا ہے کہتا ہے۔

“بھلا تم جیسے لوگ کیا جانیں محبت، تم صرف وجود کے پیچھے پاگل ہو صرف خوبصورتی کے لئے، قصور تمہارا نہیں ہر ذی نفس ایسا ہی ہوتا ہے خود میں موجود کمی دوسروں سے پوری کرنا چاہتا ہے۔”

مگر اب وہ بھی تسلیم کر چکی ہے کہ اس نے صرف خوبصورتی اور وجود کی چاہ کی تھی، وہ غلط تھی، وہ مان گئی۔

اور جب اقرار جرم ہو ہی چکا تو سزا بھی دے دی گئی، قید تنہائی اور وہ بھی اس کال کوٹھری میں، جہاں بارہ تیرہ گھنٹوں بعد اسے اس کوٹھری کے داروغہ کی شکل دیکھنے کو ملتی تھی، دوسری سزا جسمانی تھی، آخر وہ حق رکھتا تھا، اسے مارتا پیٹتا یا اپنا حق وصول کرتا اس کے لئے سب جائز تھا، وہ اتنی گناہ گار تھی، اتنی بد کردار تھی کہ سر اٹھانے کی بھی حقدار نہ تھی، وہ جو چاہتا اس کے ساتھ کرتا بلکہ جو بھی کرتا کم تھا۔

اور ایسا ہی تھا، وہ جی بھر کر اسے ٹارچر کرتا تھا، اسے بے رحمی سے نوچتا، اسے گالیاں دیتا تھا، اس پر ہنستا تھا اس کا مذاق اڑاتا تھا اور جب وہ روتی تھی، کرب سے چلاتی تھی تو وہ بہت محظوظ ہوتا تھا، حبا کی چیخیں اسے بڑی تسکین دیتی تھی اور یہ سب کرتے ہوئے وہ کہیں سے بھی حبا کا اسید نہیں لگتا تھا وہ تو کوئی بے روح درندہ بنتا جا رہا تھا، جو احساسات سے قطعاً ماورا تھا اور ایک دن جب وہ سردی کی شدت میں ناکافی گرم لباس کی وجہ سے فرش پہ بیٹھی کپکپا رہی تھی اسے اپنی آخری اسپیچ یاد آئی تھی۔

“Domestioc violence in pakistan”۔ حالانکہ اب اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا، اسے یہاں آئے دو ماہ ہونے والے تھے، اسے بس یہ یاد تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے اب ماما اور پاپا کے چہرے بھی بھولنے لگے گئے تھے وہ تصور میں ماما یا پاپا کا چہرہ لاتی تو وہ دھندلا تصور ہوتا تھا، مگر آج پتا نہیں کیسے اسے یاد آ گئی وہ اپنی تقریر۔

اس نے کہا تھا۔

“جس عورت کو اس کے شوہر نے جی بھر کے ہراساں کیا ہو، اپنی اذیت پسندی کا نشانہ بنایا ہو وہ کبھی اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی بلکہ وہ تو شاید کسی کے سامنے بھی نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہتی۔” اس نے ٹھیک کہا، وہ اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھی، کر ہی نہیں سکتی تھی، اس نے کہا تھا۔

“تشدد، مار پیٹ اور ایذا رسانی ایسے ہتھیار ہیں جو کسی بھی ذی نفس کو جسمانی نقصان تو پہنچاتے ہی ہیں مگر اس کے وقار تشخص اور انا کو بھی کچل ڈالتے ہیں۔”

وہ بھی اپنا نام اپنی پہچان بھول گئی تھی، کہ اسے تو بس وہ گالیاں یاد تھیں جن سے وہ اسے مخاطب کرتا تھا، اسے لگنے لگا تھا کسی دن وہ بھی مراد پور کی فاخرہ کی طرح اپنے ٹوٹے بازو اور خیر آباد کی نوراں کی طرح اپنے مونڈے

ہوئے سر کے ساتھ کسی ٹی وی چینل پہ تماشا بنی بیٹھی ہو گی اور لوگ اس پہ ہنس رہے ہوں گے۔

اسید نے ٹھیک ہی کہا تھا اس بار سارے خسارے حبا کے حصے میں آئے تھے، ایک آگ تھی جو ہر گزرتے دن اس کے وجود کو جلائے جا رہی تھی۔

انسانیت کا لباس حبا نے خود اس کے تن سے کھینچا تھا اور جواباً جو لباس اس نے چنا تھا وہ حیوانیت کا لباس تھا اور اس حیوان نے اپنی ساری وحشت، درندگی، بربریت اس کے اندر انڈیل دی تھی، وہ حقیقتاً ایک کوڑیالہ ناگ بن گیا تھا جو ہر روز اسے ڈستا تھا اور اس کا تن نیلا پڑتا جاتا تھا اس زہر سے، اس قبر میں ہر شب اسے عذاب دیا جاتا تھا، اسید نے ٹھیک کہا تھا اس کے جرم بہت زیادہ تھے اور حوصلوں کی دیوار تو چند دن بعد ہی ڈھے گئی تھی اور وہ اس کے ملبے تلے پڑی سسکتی رہتی تھی اور ملبہ روز گزرتا رہتا تھا اور وجود کی راکھ جمع ہوتی چلی جاتی۔

میں نے اپنی جن آنکھوں میں تجھے بسایا تھا
وہ تو مدت ہوئی جل کر راکھ ہو چکی ہیں
جانے کیسی بری نظر لگی
کسی بے رحم کی بددعا کی طرح
تم اندازہ تو لگا سکتے ہو؟
کہ اذیت ناک راکھ سے
جھانکتے پھرنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے

☆☆☆

وہ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیسے ہیں معصب بھائی آپ؟“ اس نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور انہیں بیٹھنے کا کہہ کر خود بھی اپنی میز کے پیچھے سے نکل آیا۔

”میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔“ دونوں صوفوں پہ بیٹھ گئے۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ کے پاس کہاں سے وقت نکل آیا؟“

”بس نکل آیا، سوچا تمہارا کلینک دیکھتا چلوں، ویسے تم نے یہ اسسٹنٹ کب رکھی؟“ معصب اس سے پوچھ رہا تھا۔

”حال ہی میں رکھی ہیں، بہت اچھی خاتون ہیں۔“ اس کے لہجے میں احترام تھا، معصب مسکرایا وہ جانتا تھا کہ وہ ہر شخص و رشتے کا بلاتخصیص احترام کرنے کا عادی تھا، وہ اسے ابھی وقوع پذیر ہونے والا واقعہ بتانے لگا۔

”کیا آپ انہیں بے وقوف بنا کے آ رہے ہیں، غلط بات، وہ تو بڑی بے ضرر سی ہیں، میں آپ کو ان سے ملواتا ہوں۔“ اس نے انٹر کام اٹھا کر ستارہ کو اندر آنے کا کہا، کچھ لمحوں بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی، وہ اس وقت ایک گرم سرمئی شلوار قمیض میں ملبوس تھی، لمبے بال جوڑے کی شکل میں سمیٹے ہوئے تھے، چہرہ کسی بھی قسم کی آرائش سے مبرا تھا، حتیٰ کہ کانوں میں بھی کسی طرح کے ائیر رنگز وغیرہ نہیں تھے، یہی حال کلائیوں کا تھا، وہ بھی سنگھار سے خالی تھیں۔

”آیئے مس ستارہ ان سے ملیئے یہ معصب شاہ ہیں میرے ماموں زاد بھائی، حال ہی میں لاہور شفٹ ہوئے ہیں اور بھائی یہ مس ستارہ ماہم ہیں۔“ ڈاکٹر شاہ نے دونوں کا تعارف کروایا تھا۔

”معصب بھائی کے بارے میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ یہ صرف شکل و صورت سے فارنر لگتے ہیں اور اگر یہ دوبارہ آپ کو بے

وقوف میرا مطلب ہے آپ غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں، یہ چھ زبانیں بول سکتے ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔“ وہ ہنستا ہوا بتا رہا تھا۔

”اٹس او کے میں جاؤں۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی، اس نے سر ہلا کر اجازت دی، وہ فوراً باہر نکل گئی۔

”اچھی خاتون ہیں۔“ معصب نے با آواز بلند تبصرہ کیا جو کہ اچھی خاتون نے دروازے سے نکلتے وقت بخوبی سن لیا تھا اور زیر لب بدتمیز بولی تھی۔

”ہاں جی اب آپ بتائیں کیسے آنا ہوا؟ ہوٹل کا کام کہاں تک پہنچا اور ماموں کیسے ہیں؟“

”پاپا ٹھیک ہیں، ہوٹل کا کام بس تھوڑا ہی رہ گیا، شاید دو ہفتوں تک مکمل ہو جائے اور باقی رہا میرے آنے کا مقصد؟ تو وہ کچھ اس طرح ہے کہ جو فرم میرے ہوٹل میں کارپینٹرنگ کا کام کر رہی ہے ”مغل انڈسٹریز“ ان کی فیملی میں کوئی ڈیتھ ہو گئی ہے، میں جانا چاہ رہا ہوں ان کی طرف، یہ رہا گھر کا ایڈریس۔“ اس نے ایک کارڈ نکال کر رکھا۔

”افسوس کے لئے جانا تو بنتا ہے، دکھائیں ذرا کارڈ۔“ اس نے کارڈ تھاما۔

”مغل ہاؤس گلبرگ فیز۔“ اس نے بلند آواز میں پڑھا۔

”تو پرابلم کیا ہے؟“

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے چلتا ہوں، اپنی گاڑی میں چلیں گے؟“

”ہاں تمہاری کوئی اپائنٹ منٹ تو نہیں؟“

”نہیں۔“

”او کے چلو۔“ وہ دونوں کھڑے ہو گئے، کچھ دیر بعد ان کی گاڑی سڑک پہ رواں دواں تھی۔

”ویسے بھائی آپ کبھی ان کے فیملی ممبرز سے ملے ہیں؟ یا آپ کی ساری ڈیلنگز کسی مینجر کے تھرو ہوئی تھیں؟“ اس نے احتیاط سے موڑ بدلا۔

”ہاں ملا ہوں، بڑا پیارا سا ینگ سا لڑکا تھا، نام بھی بڑا منفرد تھا۔“ وہ رک کر سوچنے لگا۔

”پیارا نام تھا تا جبھی یاد نہیں رہا۔“ وہ ہنسا، معصب نے خفیف سا ہو کر اسے گھورا۔

”مجھے یاد نہیں رہا، ہنسو تو مت۔“

”او کے۔“ وہ فوراً سیریس ہو گیا، کچھ دیر بعد ان کی گاڑی مغل ہاؤس کے گیٹ پہ تھی۔

☆☆☆

اسی رات اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا، وہ دونوں گھر لوٹے تو لاؤنج میں سب ہی گھر والے براجمان تھے شاہ بخت نڈھال اور تھکا ہوا سا صوفہ پہ بیٹھا تو نیلم ان کے پاس آ گئیں، شاہ بخت ان کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

”وہ اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟ امی اب میں کیا کروں گا؟“ ماحول شدید تناؤ کا شکار ہونے لگا، رکے آنسو رواں ہو گئے عباس نے اسے چچی جان سے الگ کر کے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”بس کرو بخت! دیکھو ہم سب تمہارے پاس ہیں۔“ وہ اسے تسلی دینے لگا، کومل بھی پاس بیٹھی تھی، رمشہ بھی کھڑی تھی۔

”خوش قسمت تو تم ہو، عباس دیکھو عباس

تمہارے پاس تو بھائی ہے نا، بہن بھی ہے، کومل کے پاس بھی سب کچھ ہے، میرے پاس کیا ہے، میں تو اکیلا ہوں۔" وہ بڑا وحشت زدہ ہو رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے بخت بھائی! آپ کے پاس بھی سب کچھ ہے، وقار بھائی، عباس بھائی، میں، رمشہ، علینہ، ہم سب بھی تو آپ کے بہن بھائی ہیں نا۔" کومل اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دے رہی تھی ایاز کا کہیں نام نہ تھا۔

کچھ دیر مزید تناؤ کا یہی عالم رہا، وہ اب نڈھال ہو رہا تھا، تھکان اور نقاہت اس کے ہر عضو سے عیاں تھی، وہ صوفہ پہ نیم دراز ہو گیا۔

"میں ادھر سو جاؤں، بہت تھکن ہو رہی ہے۔" وہ صوفے پہ لیٹ گیا، لہجہ غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ادھر بے آرام مت ہو، بخت اٹھو کمرے میں چلو۔" وقار نے نرمی سے اٹھایا، وہ روبوٹ کی مانند اٹھ بیٹھا۔

"سبین دودھ گرم کر کے بھجوا دیجئے گا۔" عباس اسے لے کر اوپر چلا گیا، اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ سیدھا لیٹ گیا۔

"ایسے مت سوؤ، نیند نہیں آئے گی تمہیں، اس لباس سے دوائیوں کی سمیل آ رہی ہے پہلے لباس تبدیل کر لو۔" عباس نرمی سے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھا کر بولا، چند لمحے وہ بے زاری سے بیٹھا رہا۔

"دل نہیں چاہ رہا میرا۔"

"نہاؤ مت، بس لباس تبدیل کر لو۔" عباس نے کہا وہ سر ہلا کر بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ اسی وقت علینہ اندر داخل ہوئی، ٹرے میں دودھ کا گلاس رکھے۔

"عباس بھائی نیچے آپ کے دوست آئے ہیں۔" اس نے کہا اور گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں، علینہ تم اسے یہ گلاس ختم کروا کے واپس آنا او کے۔" وہ باہر نکل گیا، علینہ اپنی دھن میں تکیے ٹھیک کرنے میں مصروف تھی، جبکہ وہ ایک اور نائٹ سوٹ نکال کر باتھ روم جانا چاہتا تھا، جب اس کی نظر پہلی بار علینہ پر پڑی، اس نے نائٹ سوٹ ایک طرف پھینک دیا اور اس کی طرف چلا آیا۔

"سب میرے پاس آئے، مجھے دلاسہ دیا، تم کیوں نہیں آئیں علینہ؟" وہ بہت افسردگی سے بولا تھا۔

"آپ کو پتا ہے میں ان گھر والوں کی گنتی میں شامل نہیں ہوں۔"

"مگر میری گنتی میں تو تم سب سے پہلے نمبر پہ ہو۔" اس کے لہجے میں کچھ اتنا عجیب تھا کہ علینہ نے یکلخت سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔" وہ آہستگی سے بولی اور واپس مڑی۔

"کس بات پر؟"

"آپ پر۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔

"مطلب صاف ظاہر ہے میں آپ کے پاس ایسے انسان کی تعزیت کے لئے آؤں جسے نام کے سوا میں جانتی تک نہیں، جسے کئی سالوں سے اس کے ماں باپ نے نہیں دیکھا تھا، یہ کچھ فضول نہیں لگتا؟ اور آپ کی شکایت بالکل غلط ہے، کیا آپ کو کبھی یہ لگا کہ وقار یا عباس آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ معاف کیجئے گا مجھے نہیں لگتا شاہ نواز کبھی بھی آپ کے لئے اتنا کچھ کر پاتے جو وقار بھائی نے کیا، آپ نے نوٹ کیا، آخر آپ اس گھر کی متنازعہ ہستی کیوں بنتے جا رہے ہیں، یہ صرف اور صرف وقار بھائی کی بے جا طرف داری کا نتیجہ ہے جس نے باقی سب کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ آپ کو ضرورت سے زیادہ چھوٹ ملی ہوئی ہے، مگر اپنی بے حسی اور خوغرضی کا عالم دیکھئے آپ کہ ایسے شخص کو رو رہے ہیں جس کا اس گھر میں کبھی نام ہی نہیں لیا گیا ہو سکتا ہے آپ اپنے بچپن میں ان سے بہت اٹیچ رہے ہوں مگر آخر وقار بھائی بھی تو اتنے سالوں سے آپ کو اپنے پروں تلے چھپائے سارے گھر کی مخالفت مول لیے ہوئے ہیں، ان کا کیا؟ آپ احسان فراموش بھی ہیں جبھی تو آپ نے اتنی آسانی سے خود کو ان سے الگ کر لیا یہ کہہ کر کہ آپ کا کوئی بہن بھائی نہیں، بہت افسوس ناک بات ہے اور تکلیف دہ بھی، مگر مجھے انسانیت کے ناطے پھر بھی شاہ نواز کی موت کا افسوس ہے کیونکہ چاچو اور چچی بہت دکھی اور افسردہ ہیں اور بہر حال وہ آپ کے بڑے بھائی بھی تھے، سو مجھے واقعی ان کی اس اچانک ڈیتھ کا دکھ ہے، خدا ان پر رحم کرے۔" وہ بولی نہیں تھی، پھٹ گئی تھی، طنز و استہزائیہ میں لپٹا لہجہ شاہ بخت کو انگاروں میں دھکیل گیا، وہ واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

"ایک منٹ ایسے نہیں جا سکتی ہو تم، وضاحتوں کی ضرورت ہے۔" وہ بھڑک کر اس کے سامنے آ گیا، شرٹ کے بٹن سارے کھلے ہوئے تھے علینہ نے فوراً نظر پھیری تھی۔

"میں آپ کی وضاحتیں کیوں دوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اگر وقار بھائی مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں تو اس سے تمہیں کیا پرابلم ہے؟ تم کیوں جیلس ہو رہی ہو؟" وہ طنز کرنے لگا۔

"جیلس؟ مائی فٹ۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"اور تم اتنے سکون سے کیسے شاہ نواز بھائی کو غیر متعلق شخص قرار دے سکتی ہو، وہ میرا بھائی تھا علینہ احمر مغل، قرض دار نہیں تھا کسی کا۔" وہ بھڑک اٹھا تھا۔

علینہ نے ایک طرف سے ہو کر باہر نکلنا چاہا، شاہ بخت نے بازو کھڑا کر کے راستہ مسدود کر دیا۔

"میرا راستہ چھوڑیں۔" اسے ساری زندگی کا غصہ انہی لمحوں میں آیا تھا، حد تھی نا ایسے مشکل حالات میں بھی اس شخص کو اپنی پڑی تھی۔

"میری باتوں کا جواب دیئے بغیر نہیں جا سکتیں تم یہاں سے۔" وہ چیلنج کرتے ہوئے بولا، علینہ نے سرخ چہرے کے ساتھ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس کے بازو کے نیچے سے نکلنا چاہا مگر وہ پوری طرح تیار تھا ایک دم سے اس کا بازو تھاما اور پیچھے کی طرف دھکا دیا، علینہ کا پیر رپٹا اور وہ لڑکھڑا کر بیڈ پہ گری اور کراہ پڑی، بیڈ کے قریب کھڑا شاہ بخت Curve شیپ میں اس پہ جھک آیا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پہ جما دیئے، وہ بلبلا اٹھی تھی۔

"تمہیں مجھ سے اتنی پرخاش کیوں ہے؟" اس کی دھیمی آواز سرسرا رہی تھی۔

"آج بتا ہی دو علینہ، آج ساری سچائی کھول دو، تم مجھے نظر انداز کرتی ہو ہمیشہ سے،

میں جانتا ہوں، لیکن یہ نفرت کیوں؟ کس بات کا بدلہ لے رہی ہو؟ بولو، ایسا کون سا نقصان پہنچایا ہے میں نے تمہیں؟ آج بتا دو، سارے ازالے کر دوں گا۔" وہ پھنکارا، علینہ کا رنگ سفید پڑ گیا، اس نے پوری قوت سے شاہ بخت کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹانے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں اس نے علینہ پر گرفت مزید مضبوط کر دی تھی۔

"مجھے یہاں سے جانے دو شاہ بخت! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" وہ چلائی تھی۔

"آپ سے تم کا سفر بہت جلدی نہیں طے کر لیا تم نے، خیر مجھے تم سے احترام کروانے کا کوئی شوق نہیں، چلو چھوڑو، مجھے آج صرف حقیقت جاننا ہے، کم آن ہری اپ، جتنی جلدی سچ بولو گی، اتنی جلدی یہاں سے جانے دوں گا۔" اس کا لہجہ سفاک تھا، علینہ سہم گئی، چند لمحے اسے گھورتی رہی۔

"سچ جاننے کا بہت شوق ہے تمہیں، تو سنو، سچ یہ ہے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں، کیونکہ تم ایک خود غرض اور خود پسند انسان ہو، سنا تم نے۔" وہ بلند آواز میں بولی تھی، شاہ بخت کی آنکھیں جل اٹھیں۔

"اور اگر یہ خود غرض انسان تمہیں ساری زندگی کے لئے جھیلنا پڑ جائے تو؟" وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں، مگر وہ شاید علینہ کے آزاد ہاتھوں کو بھول گیا، علینہ نے یکلخت بے قابو ہو کر اسے زناٹے دار طمانچہ مارا تھا۔

"شٹ اپ۔" وہ تنفر سے بولی اور اٹھنے کی کوشش کی، وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا مگر اس کا رنگ بدل گیا تھا۔

"اب تو تم بس انتظار کرو کہ میں کیا کرتا ہوں؟ مجھے چھیڑ کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ میں کس حد تک جا سکتا ہوں۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی اور غیر معمولی ملائمت، وہ اسے چھوڑ کر سیدھا ہو گیا آنکھیں ایک عجیب احساس سے سلگ رہی تھیں، علینہ تیزی سے اٹھی اور چلائی تھی۔

"آئی ہیٹ یو شاہ بخت۔" وہ روتے ہوئے وہاں سے بھاگتی ہوئی نکل گئی، وہ ایک بار پھر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

لاؤنج میں ایک اذیت ناک خاموشی تھی، آنے والے مہمان سیدھے یہیں آئے تھے، ابتدائی سلام دعا کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

"میں معصب شاہ ہوں اور یہ میرے کزن حیدر عباس شاہ ہیں، میں سٹار لائٹ ہوٹل کا مالک ہوں، آپ کی فرم سے ووڈ ورک کا پروجیکٹ چل رہا ہے میرا۔" احمر مغل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا، معصب ان سے حادثے کی تفصیلات پوچھنے لگا، وہ از حد رنجیدہ تھے، ساری بات جان کر معصب گہرے تاسف و دکھ کی لپیٹ میں آ گیا تھا کچھ ایسا ہی حال حیدر کا بھی تھا۔

"بہت افسوس ہوا انکل، بہت ناگہانی موت تھی اور سب سے بڑھ کر افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ وہ آپ کے پاس بھی نہیں تھے بہت دکھ ہوا۔" معصب از حد افسردگی سے بولا تھا۔

"بس بیٹا، رب کی رضا میں راضی ہیں ہم۔" احمر مغل نے مدھم لہجے میں کہا تھا، اس وقت ایک ملازمہ چائے کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے لے آئی۔

"ارے انکل! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا، آپ پہلی بار آئے ہیں۔" زیتون تائی نے نرمی سے کہا، اسی وقت علینہ اندر داخل ہوئی، آنے والے مہمانوں کی ان کی طرف پشت تھی، اسے وقار کو بلانے بھیجا گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر سلام کیا۔

"تایا ابو! بھائی تو سو رہے ہیں آپ کو پتا ہے پوری رات جاگتے رہے ہیں، آپ کہیں تو عباس بھائی کو بلا دوں؟" اس نے کہا، معصب نے دیکھا وہ اسمارٹ اور خوبصورت سی لڑکی تھی، لائٹ براؤن گرم شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔

"وہ بھی کب ٹھیک ہے، آپ ادھر آؤ ان سے ملو۔" احمر مغل نے اسے پاس بلا لیا، وہ ان کے قریب آ کر بیٹھی اور سیدھے ہو کر سامنے دیکھا اور بس دیکھتی رہ گئی، آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں، وہ وہاں تھا، حیدر عباس وہاں تھا وہ بہت بدل گیا تھا مضبوط کسرتی وجود بہترین ٹو پیس میں بے حد جچ رہا تھا۔"

"یہ میری بیٹی علینہ ہے، گریجویشن کر رہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"مجھے تو لگا تھا یہ اولیولیز کی اسٹوڈنٹ ہوں گی۔" معصب نے بے ساختہ کہا۔

احمر مغل ہلکا سا مسکرا دیئے، جبکہ علینہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"حیدر بیٹا! آپ کیا کرتے ہو؟"

"انکل! حیدر سائیکاٹرسٹ ہے، اس کا اپنا "کلینک" ہے۔" حیدر کی بجائے معصب نے جواب دیا۔

"پاپا! میں جاؤں؟" وہ ایکدم سے کھڑی ہو گئی، اپنا لہجہ خود کو ہی اجنبی لگا تھا۔

"ہاں اور شاہ بخت کو بھیج دیجئے۔" ان کے کہنے پہ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئیں، آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے شاہ بخت کے کمرے کا دروازہ ناک کیا تھا، اندر سے یس کی آواز آئی تھی، اس نے وہیں کھڑے کھڑے دروازہ کھول دیا۔

"تایا ابو آپ کو بلا رہے ہیں، آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" اس نے پتا نہیں کہاں دیکھ کر کہا تھا اور کسی روبوٹ کی طرح واپس مڑ گئی، اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"تم کیوں واپس آئے ہو حیدر! تمہیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ اپنی نم آنکھیں میچتے ہوئی بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

فضا میں ٹھنڈک کا رچاؤ تھا، گزشتہ دو دنوں میں سردی یکدم ہی بڑھی تھی، عباس اس وقت ٹیرس پہ بیٹھا تھا، جبکہ سبین نماز پڑھ رہی تھی، اس نے دعا کے بعد جائے نماز اٹھایا اور ایک طرف رکھ کر ٹیرس پہ آ گئی۔

"عباس! آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے اس سردی کی وجہ سے مزید اپ سیٹ ہو جائیں گے، اٹھیں اندر چلیں۔" اس نے کہا، عباس خاموش بیٹھا رہا۔

"اٹھ جائیں نا پلیز۔" اس نے عباس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

اور یہی منظر لان میں کب سے بیٹھے ایاز کی نظروں میں آ گیا تھا، اسے اب تک سبین کی مغل ہاؤس میں قیام کی وجہ تسمیہ سمجھ نہیں آئی

تھی، گھر کے سب لوگ اسے نظر انداز کر رہے تھے، اگر وہ خود سے ناشتے یا کھانے کے وقت ٹیبل پہ آ جاتا تو ٹھیک ورنہ ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دیا جاتا، ایاز سے یہ تذلیل آمیز رویہ برداشت نہیں ہو رہا تھا، عباس تو اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا، اسے وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی، آخر سبین سے Separation اس کا خالصتاً ذاتی معاملہ تھا سب لوگ پتا نہیں کیوں یہ بات سمجھنے پہ آمادہ نہیں تھے، جتنی بار وہ سوچتا اسے جھنجھلاہٹ سی ہوتی تھی۔

’’حیران مت ہوا ایاز۔‘‘ یہ رمشہ کی آواز تھی جو اس کے ساتھ کھڑی تھی، پتا نہیں وہ وہاں کب آئی تھی۔

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ الجھ گیا۔

’’عباس اور سبین کو دیکھ کر الجھ گئے ہو نا؟ حیران مت ہو، عباس نے سبین سے شادی کر لی ہے۔‘‘ وہ بہت اطمینان سے بولی۔

’’کیا؟‘‘ وہ حیرت سے چلا اٹھا، رمشہ مطمئن انداز میں مسکراتی تھی۔

’’ہاں اور الحمدللہ دونوں بہت خوش ہیں۔‘‘ وہ جتا رہی تھی، ایاز ضبط کا دامن تھامے رہ گیا، پھر ایک جھٹکے سے واپس مڑ گیا۔

’’خود غرض۔‘‘ رمشہ زیر لب بڑبڑا کر آگے بڑھ گئی۔

دور ٹیرس پہ بیٹھا عباس اب کھڑا ہو گیا تھا، چند منٹ وہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کر لان میں دیکھتا رہا، پھر واپس کمرے کی طرف مڑ گیا۔

’’کھانا کھائیں گے؟‘‘ سبین نے اسے بیڈ پہ بیٹھتے دیکھ کر پوچھا، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’آپ تھکے ہوئے ہیں عباس تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں۔‘‘ وہ فکر مند تھی۔

’’تھکی ہوئی تو آپ بھی ہیں۔‘‘ اس نے عجیب سے انداز میں کہا، سبین خاموش رہی۔

’’آپ مجھ سے ناراض ہیں؟‘‘ عباس نے اچانک پوچھا۔

’’نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘ اس نے سنبھل کر کہا، عباس چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

’’میں آپ کو کبھی دکھ نہیں دینا چاہتا سبین، آپ مجھے بہت عزیز ہیں، اگر کبھی نادانستگی میں ایسا ہو جائے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔‘‘ وہ بہت افسردہ تھا۔

’’ایسا کچھ نہیں ہے عباس، آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔‘‘ اس نے بے ساختہ ٹوکا۔

اس کے جواب پہ عباس نے کچھ کہے بغیر سر اس کی گود میں ڈال دیا۔

’’میں سونا چاہتا ہوں، پلیز مجھے سلا دیں۔‘‘ اس کی آواز میں مدھم گزارش تھی، سبین کے ہاتھ بے ساختہ اس کے بالوں میں چلنے لگے۔

اگلی صبح وہ جاگا تو سبین وہاں نہیں تھیں اس کا سر تکیے پہ رکھا تھا، اس نے اطراف میں نظر دوڑائی سبین جائے نماز پہ بیٹھی تھیں، ہاتھ دعا کے لئے اٹھے تھے، اس نے آنکھیں پھر موند لیں، اس نے محسوس کیا وہ اس کے برابر آن بیٹھی تھی پھر سبین نے کچھ پڑھا اور اس کے ماتھے پہ پھونک ماری اور اس پھونک کی تاثیر عباس کی پیشانی سے ہوتی ہوئی اس کے دل تک پہنچی اور روح میں پھیل گئی، اس نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں، وہ نماز کے سٹائل میں دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی اور اس کا تر و تازہ چہرہ بڑا صاف شفاف اور پاکیزہ لگ رہا تھا، وہ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر چونکی نہیں تھی بس اپنی انگلی کی پور سے اس کی آنکھوں کے پپوٹے چھوئے، عباس کو محسوس ہوا ان میں سوجن تھی، اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں، سبین آہستہ آہستہ انگلی اس کی آنکھوں پہ پھیرتی رہی، پھر وہ رک گئی، عباس نے آنکھیں کھولیں تو وہ گلاس میں پانی ڈال رہی تھی، اس نے دوپٹہ ڈھیلا کیا اور پانی پینے لگی وہ خاموشی سے اس کی گردن میں ہونے والی ہلچل دیکھتا رہا، ابھری ہوئی رگیں اور بہتا پانی، وہ چند لمحے پلکیں نہیں جھپکا سکا، یہ منظر اس کی یادداشت میں جیسے ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا اور یہ اس کی زندگی کے یادگار مناظر میں سے ایک تھا۔

سبین نے گلاس ایک طرف رکھا تو اسے اپنی طرف متوجہ پایا اور پھر عباس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کے لبوں پہ اٹکے پانی کے چند قطروں کو اپنی انگلی کی پور پر چن لیا اور پھر اس بھیگی انگلی کو بڑی عقیدت سے باری باری اپنی دونوں آنکھوں پہ پھیر لیا، سبین کے ہاتھ پیر سنسنا اٹھے وہ ایک سیکنڈ میں اس کا مدعا جان گئی تھی اور اس پل جیسے اس کی جان پہ بن آئی تھی، اس نے عباس کو دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔

’’میری آنکھوں میں شدید درد ہو رہا ہے، ایسے لگ رہا ہے کتنی راتوں سے نہیں سو پایا۔‘‘ وہ اسی طرح سیدھا لیٹا بولا تھا جبکہ آنکھیں بدستور بند تھیں۔

سبین بے اختیار اس پہ جھک گئی اور پھر بھیگے لبوں کا جانفزا لمس عباس نے اپنی آنکھوں پہ محسوس کیا، اس کی روح میں اس مسیحائی کی تاثیر نے اجالا کر دیا تھا، اس نے سبین کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

باہر دھندلا اجالا پھیلا تھا اور دھند کے مرغولے سے ہر طرف چھائے ہوئے تھے، مگر ان کے درمیان موجود دھند کا موسم چھٹ چکا تھا، کچھ دیر بعد وہ نیچے آئی کچن میں آ کر اپنی مطلوبہ چیزیں نکالیں اور پاستا بنانے لگی، ساتھ والے چولہے پہ چائے رکھی غیر معمولی تیز رفتاری سے اپنا کام ختم کرنے کے بعد اس نے پاستا پلیٹ میں نکالا چائے کپوں میں ڈالی اور ٹرے میں سیٹ کر کے اوپر کی طرف بڑھ گئی، باہر کی ٹھنڈک اور خنکی کے مقابلے میں اندر کا موسم بہت حدت بخش تھا، عباس ہنوز بستر میں تھا، سبین نے ٹرے بیڈ پہ رکھ دیا۔

’’اب اٹھ بھی جائیں، میں ناشتہ بھی بنا لائی ہوں اور آپ نے اب تک بستر نہیں چھوڑا۔‘‘ وہ خفگی سے بولی۔

’’دل ہی نہیں چاہ رہا۔‘‘ وہ سستی سے اٹھ گیا، سبین نے مستعدی سے آگے بڑھ کر اسے گرم شلوار قمیض تھمایا، کچھ دیر بعد وہ تبدیل شدہ لباس میں دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر آیا تھا، بیڈ پہ بیٹھ کر اس نے سبین کا آنچل تھاما اور چہرہ صاف کرنے لگا، سبین کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

’’صبح صبح آپ کو اتنی زحمت ہوئی، کچھ دیر بعد ناشتہ بن ہی جاتا۔‘‘ عباس نے کہا۔

’’ابھی صرف ساڑھے چھ ہوئے ہیں عباس، ناشتہ تو دس بجے بنے گا اور آپ نے تو رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا، جبھی میں نے پاستا بنایا ہے کہ کچھ ہلکا پھلکا سا ہو، کچھ آپ کی طبیعت بھی بہتر نہیں ہے، یہ تو ہو گئی وضاحت، سو اب شروع کریں۔‘‘ وہ مسکرائی، عباس سر ہلا کے پلیٹ پہ جھک آیا، پاستا شاندار تھا۔

’’آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔‘‘ اس نے توصیفی انداز میں سر دھنا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ شوخی سے بولی، انداز سے گہرا اطمینان جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

میری طرف مت دیکھو
مجھے میری بریدہ ٹانگوں
شکستہ بازوؤں اور گھائل دل نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے
ڈسے ہوئے لوگ تریاق نہیں بن سکتے
تمہاری مجبوریاں اپنی جگہ
میری مجبوریاں بھی تو اپنی ہی جگہ ہیں
پچھلی بار آسمان جس جگہ سے ٹوٹ کر مجھ پر گرا تھا
اب اس سے ساتھ والی جگہ سے پھر لٹک آیا ہے
تم چاہو تو مجھ پہ ہنس سکتے ہو
آسمان کے دوسرے ٹکڑے کے گرنے سے پہلے
ہو سکتا ہے بعد میں تمہیں بھی موقع نہ مل سکے

اور اگر اس کمرے میں الارم والی گھڑی نہ ہوتی تو وہ شاید کبھی نہ جان پاتی کہ کب دن رات سے ملا اور کب رات نے دن کا منہ دیکھا، آج بھی ایک معمول کی صبح تھی اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں مکمل تاریکی تھی، خیر اب تو وہ اس تاریکی کی عادی ہو چکی تھی، اس نے جلدی جلدی منہ دھویا اور اسید کے کپڑے نکال کر رکھے پھر لائٹ جلا دی، صد شکر کہ وہ کمبل میں منہ دیئے سو رہا تھا ورنہ یقیناً نیا فصیحتہ کھڑا ہو جاتا لائٹ کے جلنے پہ۔

وہ بھی کیا کرتی یہاں بجلی کا شارٹ فال خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا، وہ ہر روز رات کو پریس کرنے کے بارے میں سوچتی مگر بجلی ندارد، اس نے زمین پر ایک موٹی سی چادر بچھائی اور استری کا سوئچ پلگ میں لگا دیا، تیز تیز ہاتھ چلا کر اس نے پینٹ شرٹ پریس کی، موزے نکال کر رکھے، گرم جیکٹ اور پالش شدہ شوز بھی رکھے اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی، اسے اسید کو کبھی نہیں جگانا پڑا تھا وہ ہمیشہ خود اٹھ جاتا تھا اس لئے وہ بے فکر ہو کر ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئی، اس نے تازہ آٹا گوندھا اور پھر ایک طرف رکھ کر چائے کا پانی رکھنے لگی، خشک دودھ کی چائے بنانے کے بعد اس نے توا چڑھایا اور پراٹھا بنانے لگی، اس دوران اسید اٹھ چکا تھا، اس کے بعد اس نے انڈہ فرائی کیا اور ٹرے میں ناشتہ رکھا، ایک پراٹھا تلا ہوا انڈہ اور چائے کا کپ، اس نے ٹرے لا کر بیڈ پہ رکھ دیا، اسید نہا کر اس وقت بیسن کے آگے کھڑا بال بنا رہا تھا، اس کے بعد وہ بیڈ پہ آ کر بیٹھ گیا اور ناشتہ کرنے لگا، حبا خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔

"یہ سر پہ کیوں سوار ہو؟ نوالے گنیو گی کیا؟" وہ جھلا کر بولا، حبا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر کچھ کہے بغیر دوبارہ کچن کارنر والی سائیڈ پہ چلی گئی۔

کچھ دیر بعد اسید کا سیل فون بج اٹھا، یہ اس نے چند دن پہلے ہی لیا تھا کیونکہ سیل کے بغیر اسے کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔

فون پہ بات کرنے کے دوران ہی وہ افراتفری میں اٹھ کھڑا ہوا، فون بند کر کے جیب میں ڈالا، جلدی جلدی اپنے لیکچر پیپرز سمیٹے اور کتابیں اٹھائیں، یقیناً اسے جلدی آنے کا کہا گیا تھا۔

حبا نے ہاتھ میں پکڑی راشن کی لسٹ دیکھی اور تیزی سے اس کے سامنے آ گئی۔

"کیا تکلیف ہے اب تمہیں؟ کیوں کالی بلی کی طرح راستہ کاٹنے آ جاتی ہو؟" اس نے پتھر پھوڑے۔

"وہ میں یہ……" اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

"شٹ اپ، ٹائم نہیں میرے پاس تمہاری فضول بکواس کے لئے۔" اس نے تلخی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

حبا پھیکے چہرے کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی، اس نے روح شکن سناٹے میں اسید کے سیڑھیاں اترنے، دروازہ کھل کر بند ہونے اور پھر اس میں چابی گھومنے کی آواز سنی، وہ دروازہ باہر سے لاک کر کے جایا کرتا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ کو دیکھا، دو دن سے راشن ختم ہو رہا تھا اور آج تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، وہ بے جان ٹانگوں کے ساتھ زمین پہ بیٹھ گئی، سوال یہ تھا کہ آج کیا پکے گا، اپنی تو اسے چنداں فکر نہ تھی مگر مسئلہ تو اسید کا تھا وہ صبح کا ناشتہ کر کے جو جاتا تو رات واپسی پہ ہی کھانا کھاتا تھا اور اگر اس کے لئے کھانا تیار نہ ہوا تو؟ اور اس تو کے آگے کی جگہ خالی تھی، اس نے دل ہی دل میں رات کے لئے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا، حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی وہ دو دن سے اسے راشن لسٹ دینے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اسے پتا تھا کہ غلطی اس کی ہی ثابت کی جائے گی، قصوروار اسے ہی ٹھہرایا جائے گا۔

اس نے اسید کے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی، انڈہ ختم ہو گیا تھا مگر آدھا بچا چائے کا مگ اور پراٹھا موجود تھا، اس نے نوالہ توڑا اور چائے میں ڈبو کر کھانے لگی۔

یکدم ماضی کی ایک خوشگوار یاد اس کے سامنے آ گئی، اس نے سر جھٹک کر اس یاد سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر بے سود اور پتا نہیں کیوں نوالہ حلق میں پھنس گیا تھا اس نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھرا تو آنکھوں میں پانی آ گیا۔

یہ چند سال پہلے کی بات تھی۔

حبا اور اسید دونوں اسٹڈی میں بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام تقریباً ختم کر کے اٹھنے ہی والے تھے جب مرینہ ٹرے میں دودھ اور کافی لے کر آ گئیں، حبا نے برا سا منہ بنا کے دودھ پینا شروع کر دیا، اسید کی بھاپ اڑاتی کافی کو اس نے خاصی حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا، اسید نے ایک گھونٹ لے کر کپ واپس ٹیبل پہ رکھا کہ اس کا فون بجنے لگا تھا، وہ فون پہ بات کرنے لگا، حبا نے فوراً دودھ کا گلاس واپس رکھا اور اسید کا کافی کا مگ اٹھا لیا، تیز تیز گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے اسید کو دیکھا، وہ متوجہ نہ تھا، اس نے آدھا مگ پی کر واپس رکھا اور پھر سے گلاس اٹھا لیا، اسید فون سے فارغ ہوا تو آدھا کپ کافی دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں، اس نے مشکوک نظروں سے حبا کو دیکھا جو بڑی معصومیت سے سر جھکائے دودھ پینے میں مصروف تھی۔

"حبا!" اس نے پکارا، انداز تنبیہی تھا۔

"ہوں۔" اس نے سر اٹھایا پھر خود پہ قابو نہ پا کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میرا دل چاہ رہا تھا کافی پینے کو۔" وہ چنچل انداز میں بولی تھی۔

"اب تو یہ میرے پینے والی نہیں رہی۔" وہ تاسف سے بولا۔

"کیوں؟" حبا کے انداز میں گہرا استعجاب تھا۔

"تم نے جھوٹی جو کر دی ہے۔" اس نے

جتایا، حبا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"سوری میں تمہارے لئے دوبارہ بنا لاتی ہوں۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، اسید اس کا چہرہ دیکھ کر ہنس پڑا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا حبا! اتنا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے حبا کو بازو سے پکڑ کر واپس بٹھایا۔

"یہ انتہائی فضول بات ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"یہ مذاق تھا، اتنا گھٹیا مذاق، میرا دل بند ہو جاتا تو، آخر کیوں نہیں پی سکتے تم میری جھوٹی کافی، میں کیا مسلمان نہیں ہوں۔" وہ بنا رکے بولتی گئی۔

"ارے اتنا سویئرری ایکشن، کول ڈاؤن بے بی۔" اسید نے اس کا سر سہلایا، وہ کچھ کہے بغیر اسے گھورتی رہی، اسید کو ہنسی آنے لگی۔

"سوری کروں تم سے؟" اب کے بار وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ تیز لہجے میں بولی، اسے شرمندہ دیکھنا کب مقصود تھا اسے۔

"تو پھر؟" اس نے استفسار کیا۔

"تو پھر یہ کہ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم دودھ پیو گے اور میں کافی۔" اس نے دھونس سے کہا، اسید اس کی ذہانت پہ کھلکھلایا تھا۔

"کیا بات ہے آپکی حبا بی بی! سزائیں دینے میں ملکہ حاصل ہے آپ کو۔" اس نے دودھ کا گلاس اٹھا لیا تھا۔

"ہاں تو اور کیا، میرا دل چاہتا ہے تمہیں بڑی سخت سی سزا دوں۔" وہ جذباتیت سے بولی۔

"وہ کس جرم میں؟" وہ بلبلایا تھا۔

"اچھا لگنے کے جرم میں۔" وہ اطمینان سے کافی کے گھونٹ لے رہی تھی۔

"مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں، جتنے اچھے تم ہو، اتنا اچھا ہونا نہیں چاہیے اور اصولاً اتنا اچھا ہونے پہ ٹیکس لگنا چاہیے اور چونکہ تم ٹیکس نہیں دیتے تبھی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔" وہ مسکراہٹ دبا کے بولی تھی، اسید کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"ہوں تو کیا سزا دو گی تم مجھے؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دل تو چاہتا ہے تمہیں جادو کے زور پہ اپنے بس میں کر لوں اور تم سے وہ سب کرواؤں جو میں چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اطلاعاً عرض ہے میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا، حبا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"پتا ہے مجھے، اسی لئے میرا دل چاہتا ہے تمہیں سونے کے پنجرے میں قید کر لوں۔" اس کے انداز میں شدت تھی۔

"وہ کیوں؟" وہ اب خوب لطف لے رہا تھا۔

"تاکہ کوئی تمہیں مجھ سے جدا نہ کر سکے۔" اس نے آہستگی سے کہا، پھر سر اس کے شانے پہ رکھ دیا، اسید نے نرمی سے اس کا کندھا تھپکا۔

"فضول باتیں مت سوچا کرو، ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے تسلی دی۔

"پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے، شاید میں عدم تحفظ کا شکار ہوں تمہیں لے کر۔"

"مجھے لے کر، وہ کیوں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"پتا نہیں اسید کیا بات ہے، پتا نہیں مجھے تمہیں بتانا چاہیے بھی یا نہیں۔" وہ سخت الجھن میں تھی۔

"ایسی کون سی بات ہے؟" اس نے حبا کا چہرہ اپنے شانے پر سے اٹھایا۔

"مجھے Night mares آتے ہیں، پچھلے کچھ عرصے سے۔" وہ بہت مضطرب ہو گئی۔

"Night mares؟" وہ حیران سا تھا۔

"ہاں اور بہت عجیب، میں دیکھتی ہوں بہت خوبصورت جگہ ہے، سرسبز پہاڑی علاقہ اور ہم دونوں سب سے اونچی چٹان پہ کھڑے ہیں اور نیچے بہت دل فریب، نیلا دریا بہہ رہا ہے میں تمہیں اس دریا کی طرف متوجہ کروانا چاہتی ہوں میں تمہارا بازو پکڑ کر تمہیں وہاں لاتی ہوں مگر پھر یکلخت سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے، وہ دریا نیلا نہیں ہوتا، وہ سرخ ہوتا ہے یا شاید زرد آگ جیسا، میں اسے دیکھ کر ڈر کر پیچھے ہٹتی ہوں، تو اردگرد کا منظر بھی تبدیل ہوتا ہے، وہاں سبزے کا نام و نشان نہیں ہوتا، صرف بنجر، کالی اور ویران چٹانیں اور پھر یکلخت کوئی مجھے دھکا دے دیتا ہے میں نیچے، بہت نیچے آگ و خون کے اس دریا میں گرنے لگتی ہوں، میں بہت چلاتی ہوں، تمہیں مدد کے لئے بلاتی ہوں مگر تم وہیں کھڑے مجھے دیکھتے رہتے ہو، مجھے بچانے کی کوشش نہیں کرتے اور اسی دوران میری آنکھ کھل جاتی ہے۔" حبا تیز تیز بول رہی تھی اس کے ماتھے پہ پسینہ چمک رہا تھا اس نے الٹے ہاتھ سے ماتھا صاف کیا تھا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اسٹریس لینا چھوڑ دو حبا، یہ صرف بے معنی خواب ہے ایسا کچھ نہیں ہے وہم ہے تمہارا۔" اس نے تسلی دی۔

"لیکن اسید!" حبا نے کچھ کہنا چاہا۔

"اوں ہوں تمہیں لگتا ہے میں تمہیں کسی مشکل میں اکیلا چھوڑ سکتا ہوں، تو پھر فضول خدشات پالنے کا مطلب، چلو اٹھو ٹینشن فری ہو کر سوؤ۔" اسید نے نرمی سے اس کا گال تھپکا اور اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا، حبا چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی، پھر سر ہلا دیا تھا۔

"تم واقعی بہت خاص ہو اسید، میں ایسے ہی تو تمہارے لئے پاگل نہیں؟" اس نے سوچا تھا، وہ ایک طویل سانس لے کر واپس حال میں لوٹ آئی۔

اس نے سامنے پڑی ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھرا جو اب بدذائقہ ہو چکی تھی، یہ لت بھی اسے اسید سے ہی لگی تھی۔

"میرا خواب سچ تھا وہ Night mare نہیں تھا ایک سائن تھا میری اس بدتر زندگی کے بارے میں اور میں بے وقوف جان ہی نہ پائی۔" اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے سوچا تھا، اس کے اندر گہری اذیت سرائیت کرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

علینہ کے پریکٹیکلو تھے، وہ اپنی پریکٹیکل نوٹ بک کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی ویسے تو وہ نوٹ بک مکمل کر چکی تھی اور یہ چیک بھی ہو چکی تھی مگر دوسری لڑکیوں کے دیکھنے دکھانے میں اس کی کچھ ڈائیگرامز اور گرافس رف ہو رہے تھے، اس نے سوچا کہ انہیں دوبارہ سے ری نیو کر لے، وہ پنسل، سکیل اور نوٹ بک لے کر بڑی دیر سے بیک یارڈ کی سیڑھیوں پہ

بیٹھی ہوئی تھی، کافی زیادہ کام مکمل ہو چکا تھا، اس نے بور ہو کر ایک طرف چیزیں رکھیں اور دائیں ہاتھ سے اپنا شانہ دبایا، کافی دیر ایک پوز میں بیٹھنے سے درد محسوس ہو رہا تھا۔

"تھک گئی ہو؟" علینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ ایاز تھا، اس کے ہاتھ میں مگ تھا۔

"ہوں تھوڑا سا۔" وہ بولی، ایاز اس کے برابر آن بیٹھا۔

"پریکٹیکل کب ہے تمہارا؟" ایاز نے پوچھا، وہ کچھ حیران ہوئی، وہ کیسے جانتا تھا۔

"اس فرائی ڈے کو۔"

"ہوں تیاری کیسی ہے، خاص طور پر وائیوا کی؟" ایاز نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں؟"

"مجھے لگتا ہے وائیوا میں کنفیوز ہو جاؤں گی۔" وہ افسردہ ہو گئی۔

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے، ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟" ایاز نے استفسار کیا۔

"پتا نہیں شاید مجھ میں کونفیڈنس نہیں ہے۔" وہ مضطرب سی ہو گئی تھی۔

"کونفیڈنس اس لئے نہیں ہے کہ تم سب سے الگ تھلگ رہتی ہو، سب کے درمیان بیٹھا کرو، گھلا ملا کرو۔" ایاز کا لہجہ نرم تھا۔

"مجھ عادت نہیں ہے۔" اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"کیوں علینہ؟ ایسا کیوں ہے؟ مجھے بتاؤ میں تو تمہارا بھائی ہوں، مجھ سے شیئر کرو، وہ جو تم اپنے اندر دبا لیتی ہو۔"

"آپ تو چلے جائیں گے۔" اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔

"تو کیا ہوا، ہم رابطے میں رہیں گے، میں تمہیں کال کر لیا کروں گا تمہارے پاس اپنا سیل فون تو ہوگا؟" اس نے استفسار کیا، علینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں ہے، اوہ نو، تم گریجویشن کر رہی ہو اور تمہارے پاس اپنا نمبر نہیں ہے، حیرت انگیز۔" وہ سخت حیران ہوا تھا۔

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" وہ سادگی سے بولی۔

"بہت حیران کن بات ہے، خیر میں تمہیں جانے سے پہلے سیل لے کر دے دوں گا۔" ایاز نے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" علینہ نے فوراً منع کر دیا، ایاز خاموش رہ گیا۔

"چائے پیئو گی۔" اس نے مگ علینہ کی طرف بڑھایا، اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا، کوئی وضاحت نہ مانگی تھی۔

"تھینکس۔" علینہ نے مگ تھام لیا۔

"ایک بات پوچھوں؟" ایاز سامنے دیکھ رہا تھا۔

"جی پوچھیں۔" اس نے اپنے ہینڈسم سے بھائی کو دیکھا۔

"کیا تم بھی مجھے غلط سمجھتی ہو؟" علینہ اس کے سوال پہ ہکا بکا سی رہ گئی، وہ اس کے سوال کا مطلب جان گئی تھی، وہ یقیناً سبین کے بارے میں اس کی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔

"میرے علم میں تو پوری بات ہی نہیں، میں کیا رائے دے سکتی ہوں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"چلو فرض کرو، تمہیں شادی کرنے کو کہا جائے جبکہ تم راضی نہیں ہو؟ تو کیا تم مان جاؤ گی؟"

"نہیں۔" وہ کچھ دیر بعد سوچ کر بولی۔

"اور اگر تم پر دباؤ ڈالا جائے بلکہ پورا گھر تم پہ چڑھ دوڑے پھر؟"

"تو میں شاید اپنی بات پہ قائم نہ رہ سکوں۔" وہ کچھ جھجک کر بولی۔

"یعنی ہتھیار ڈال دو گی؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے میں سب کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔" وہ اس بار دوٹوک بولی تھی۔

"ایگزیکٹلی، یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں، یہی میری سچویشن تھی، مجھ پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ میرے پاس یہ شادی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، مجھے مجبور کر دیا گیا تھا علینہ، جبکہ میری مرضی شامل نہیں تھی۔" وہ وضاحت دے رہا تھا، علینہ خاموشی سے چائے کا مگ تھامے سامنے دیکھتی رہی۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ، بھائی اور بھابھی خوش ہیں۔" اس نے ایاز کو لاجواب کر دیا۔

"ہاں اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم اپنا کام مکمل کرو، میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چلا گیا۔

علینہ وہیں بیٹھی رہی، کسی سوچ میں گم، کس قدر عجیب بات تھی، ایاز خود کو حق بجانب سمجھتا تھا، علینہ نے سوچا یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی مغل ہاؤس میں ہر شخص خود کو حق پہ سمجھتا تھا، ایاز جس نے بڑے اطمینان سے سبین کو تماشا بنا دیا تھا اور خود کو ڈی فنڈ بھی کر گیا تھا، عباس جو ایاز کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا، شاہ بخت جو اپنے Utopia سے باہر آنے کو تیار ہی نہ تھا، ایک رمشہ تھی جو کبھی بخت کی سب سے اچھی دوست ہوا کرتی تھی، اب اسے یوں نظر انداز کرتی تھی جیسے دیکھا ہی نہ ہو، حیرت سی حیرت تھی۔

(باقی آئندہ)

اچھی کتابیں
پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلیئے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشاء جی کے .... ☆
اس بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردا .... ☆

ڈاکٹر مولوی عبد الحق
قواعد اردو .... ☆
انتخاب کلام میر .... ☆

ڈاکٹر سید عبدللہ
طیف نثر .... ☆
طیف غزل .... ☆
طیف اقبال .... ☆

لاهور اکیڈمی
چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37321690, 3710797

لاج

ثمینہ بٹ

''دیکھ پتر! اب اس پنڈ کی لاج تیرے ہاتھ میں ہی ہے، تو چاہے تو اپنے پرکھوں کی، اپنے بہشتی باپ دادا کی پگ کو رلنے سے بچا سکتی ہے، سوچ لے پتر، اچھی طرح سوچ لے، آخری فیصلہ بہر حال تیرا ہی مانا جائے گا۔'' اور وہ بھلا کیا سوچتی، چپ چاپ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھے جا رہی تھی، جواب جانے کون سا کھیل رچانے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

ناولٹ

چوہدری نور دین اپنے چھ بچوں اور بیوی کے ساتھ رعیہ خاص سے چند کوس آگے رہائش پذیر تھے، ان کے علاقے کو سونا نگر کہا جاتا تھا اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا جاتا تھا، چاروں طرف پھیلے سونا اگلتے کھیت اور سونے جیسی لہلہاتی فصلیں اور ان ہی سونا اگلتی زمین کے چند مربعوں کے مالک وہ بھی تھے، نیک پرہیزگار گھر والی اور فرمانبردار، نیک اور صالح اولاد، پھر بھلا اور کیا چاہیے ہوتا ہے زندگی سے۔

وہ سب بھی اپنی زندگی میں بہت خوش اور اپنے رب کے بہت شکر گزار بندے تھے، جس نے انہیں اپنی رحمتوں سے خوب نواز رکھا تھا، چوہدری نور دین نے اپنے بڑے دونوں بچوں سردار اور بیٹی زہرہ کی شادیاں اپنے چچا زاد بھائی کے بچوں پروین اور کمال الدین سے کی تھیں، کہنے کو تو یہ رشتہ وٹے سٹے کا ہی مرہون منت تھا، مگر ابھی تک اس کے برے اثرات نہ تو نظر آئے تھے اور نہ ہی ایسا کوئی چانس تھا، کیونکہ دونوں جوڑے اپنی اپنی شادی

شدہ زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھے، اگر زہرہ نے کمال کے گھر کو جنت بنا رکھا تھا، تو پروین نے بھی ان کے گھر کو جنت نظیر بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، بس ایک ہی قلق تھا کہ شادی کے چار سال بعد بھی پروین کی گود سونی تھی، جبکہ زہرہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی، مگر وہ رب کی رضا میں راضی رہنے والے لوگ تھے، اسے بھی رب کی رضا مان کر خوشدلی سے قبول کر چکے تھے اور ویسے بھی پروین کے لئے اس کی سب سے چھوٹی نند صفیہ اور دیور معراج بچوں کی طرح ہی عزیز تھے کہ اس کی شادی کے وقت وہ دونوں بالترتیب آٹھ اور دس سال کے ہی تو تھے، سو اس نے ان دونوں کو ہی اپنی محبت اور توجہ کا مرکز بنا رکھا تھا۔

☆☆☆

پھوپھی نصیبن، چوہدری نور جیین کی چچا زاد بہن تھی، نام تو رکھنے والوں نے بڑے چاؤ سے "نصیبن" رکھا تھا، ان کا، مگر نصیب اس کے ہمیشہ ہارے ہی رہے تھے، پھوپھا بے چارے تو کب کے جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے اور پیچھے رہ گئے وہ تینوں (پھوپھی نصیبن، ان کا بیٹا جاوید اور بیٹی نمو) اور زمانے کے دھکے، جیسے تیسے کر کے جاوید نے کام کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی تھی اور پرائیویٹ ہی سہی چودہ جماعتیں اور وہ بھی اے گریڈ میں پاس کر ہی ڈالی تھیں اور رہی نمو تو بھائی کے دیکھا دیکھی اور اس کی مدد سے وہ بھی میٹرک کر چکی تھی، پھوپھی نصیبن کے نصیب اللہ نے جانے کہاں بیٹھ کر لکھے تھے کہ سکھ کا سانس آ کر ہی نہیں دے رہا تھا، پہلے نکھٹو اور نشئی شوہر کی مار اور گالیاں کھاتے، محنت مزدوری کرتے بچوں کو پالتی رہی اور پھر اس کے مر جانے کے بعد، زمانے کی بھوکی نگاہوں سے بمشکل خود کو بچاتے ہوئے بیوگی کی سفید چادر تانے ہوئے، کان، آنکھ بند کیے مشکل وقت گزارتی رہی تھی اور اس کے اس برے اور مشکل دور میں اس کے رشتے کے بھائی نور دین اور بھرجائی رحمت بی بی نے اس کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا، جتنا بن پڑتا اس کی خبر گیری اور مدد کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

اور اب بھی جیسے ہی اس کے بچے جوان ہوئے، بھاء نور دین نے بغیر کسی ہچکچاہٹ، بنا کسی لین دین کے دو کپڑوں میں ان کی بیٹی کا ہاتھ اپنے دوسرے بیٹے سرتاج کے لئے مانگ لیا تھا اور ساتھ ہی خاندان برادری کے رسم و رواج کے مطابق اپنی سگھڑ، سلیقہ شعار اور خوبصورت بیٹی زبیدہ کا رشتہ بھی جاوید کو دے دیا تھا، اب بھلا پھوپھی نصیبن کو اور کیا چاہئے تھا۔

قبول کرتے ہوئے منگنیاں بھی کر دی گئیں۔

ادھر زبیدہ اور جاوید کی منگنی ہوئی، ادھر جاوید کا کویت کا ویزہ لگ گیا، جس کے لئے وہ کافی عرصے سے کوششیں کر رہا تھا، مارے خوشی کے پھوپھی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے وہ بار بار زبیدہ کی بلائیں لیتی اور جاوید کے ویزے اور نوکری کو زبیدہ کے بخت کی تیزی مانتی رب کی شکر گزار ہوتی، ان کے تو خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اس کا سیدھا سادہ سا بیٹا بھی کبھی کویت جائے گا اور پھر وہاں سے خوب خوب ریال اور درہم بھیجے گا، جن کی وجہ سے ان کا اور ان کی بیٹی کا نصیب دیکھتے ہی دیکھتے سنور جائے گا۔

☆☆☆

اور پھر واقعی جیسا پھوپھی نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا، ان کے دن دیکھتے ہی دیکھتے پھر گئے، جاوید کے بھیجے گئے کویتی ریال اور درہم ان کا اسٹیٹس بلند کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے تھے، زبیدہ اور اس کے گھر والے جاوید کی ترقی اور کامیابیوں سے بے حد خوش تھے، ان کی شادیاں جاوید کے واپس آنے کے بعد ہونا طے پائی تھیں اور اس درمیانی عرصے میں وہ لوگ تیاریاں بھی شروع کر چکے تھے۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا چلا جاتا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ اس کی گردش کے زیر اثر کون، کب، کہاں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر پہنچ جاتا ہے اور وقت کی یہ ہی گردش کس کو کہاں لے جائے اور کس کا کیا حال بنائے یہ کوئی نہیں جان سکا، اور کوئی جان بھی کیسے سکتا ہے، یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں اور قدرت کے کھیل، قدرت والا ہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔

گزرتے وقت نے جہاں پھوپھی نصیبن اور نمو کے حالات بہتر سے بہترین کر ڈالے تھے، وہیں یہ لوگ گردش حالات کا شکار ہو کر تیزی سے نیچے آنا شروع ہو چکے تھے، ان کی سونا اگلتی زمینوں کو جانے کس کی نظر لگی تھی کہ فصلیں روز بروز کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھیں، بارش تو کبھی سیلاب کبھی سوکھا ان سب آسمانی اور زمینی مشکلات سے گزرنے کے باوجود وہ لوگ پرامید تھے کہ حالات ابھی بھی قابو سے باہر نہیں ہوئے، مگر وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے، بدلتے وقت اور بدلتے حالات سب سے پہلے نزدیکی رشتہ داروں اور قریبی

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے
ابن انشاء
اردو کی آخری کتاب .... ☆
خمار گندم .... ☆
دنیا گول ہے .... ☆
آوارہ گرد کی ڈائری .... ☆
ابن بطوطہ کے تعاقب میں .... ☆
چلتے ہو تو چین کو چلئے .... ☆
نگری نگری پھرا مسافر .... ☆
خط انشا جی کے .... ☆
بستی کے اک کوچے میں .... ☆
چاند نگر .... ☆
دل وحشی .... ☆
آپ سے کیا پردہ .... ☆
ڈاکٹر مولوی عبدالحق
قواعد اردو .... ☆
انتخاب کلام میر .... ☆
ڈاکٹر سید عبداللہ
طیف نثر .... ☆
طیف غزل .... ☆
طیف اقبال .... ☆
لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
فون نمبرز 7321690-7310797

رشتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، مگر وہ تو اسی زعم میں بیٹھے تھے کہ اگلی فصل کے اچھا ہوتے ہی وہ پھر سے اسی پوزیشن میں آ جائیں گے، مگر آنے والے وقت کو بھلا پہلے سے کون دیکھ سکا ہے جو وہ دیکھ پاتے۔

☆☆☆

”بھائی نوردین! میں بڑی مجبور ہو کر آئی ہوں تیرے پاس، ویکھ ناں، میں بھی جوان دھی کی ماں ہوں، تیرا درد سمجھ سکتی ہوں، تو برا نہ مان ویرا، باؤ جوید (جاوید) اس سال بھی نہیں آ رہا واپس اور ابھی آگے بھی اس کا دو چار سال تک ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، پہلے ہی منگنی کو چار سال ہونے کو آئے ہیں، اب تم خود سوچو کہ تم لوگ کب تک زبیدہ کو اس کے نام پر بٹھائے رکھو گے، میری مانو تو کوئی اور بر دیکھ کر اس کا بیاہ کر دو اور رہ گئی میری نمو، تو وہ سرتاج کے ساتھ ویاہ کے لئے راضی نہیں ہے، میں نے بہت منایا پر وہ نہیں مانی، نمو تو خیر سے دس جماعت پاس اور تمہارا تاجا، چٹا ان پڑھ، ایسے بے جوڑ رشتے بھی کبھی نبھتے ہیں۔“ پھوپھی نصیبن کی تو جون ہی بدلی ہوئی تھی، حالات کیا بدلے، ان کے تو خیالات میں انقلاب آ چکا ہے۔

ابا جی تو بے چارے منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اپنی ”بے چاری بیوہ بہن نصیبن“ کا عکس اس مالدار، قیمتی کش پش جوڑے، جوتے اور زیورات سے لدی، باؤ جاوید کی ماں، میں ڈھونڈنے کی کوشش ہی کرتے رہ گئے تھے، بات کہاں سے کرتے اور جواب کیسے دیتے۔

”مگر پھوپھی! یہ تو زیادتی ہے، کل تک ہم امیر تھے اور تم لوگ ماڑے (غریب) نمو رانی کا پڑھا لکھا ہونا نظر نہیں آتا تھا جو خوشی خوشی شگنوں کے ساتھ یہ رشتے پکے کئے تھے اور آج تمہارے حالات سدھر گئے اور ہمارے حالات میں تھوڑا بگڑ گے تو تمہیں سب خرابیاں اور برائیاں نظر آنے لگیں وہیں ہم میں، اس طرح تو کہیں نہیں ہوتا پھوپھی، اس طرح تو کبھی نہ ہوا پہلے برادری میں۔“ سردار کا غصے کے مارے برا حال تھا، وہ کب سے چپ چاپ بیٹھا پھوپھی کی لن ترانیاں سن رہا تھا، مگر اب اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

”تری گل نہیں ہو رہی جو تو بیچ میں بول رہا ہے، اپنی ٹر ٹر بند کر اور اپنا گھر سنبھال جا کر، آیا بڑا ہمدرد بھرا (بھائی) کا، آٹھ سال ہو گئے ویاہ کو ابھی تک بے اولاد کا بے اولاد ہی پھر رہا ہے جب تیرے کوئی بال بچے نہیں ہوا تو تیرے بھائی کے کیسے ہو سکتا ہے، میں کس طرح اپنی اکلوتی چن ورگی کڑی ایسے لوگوں میں دے دوں، جن کا نام نسل چلنے کی کوئی امید ہی نہیں ہو۔“ کہاں کی بات پھوپھی نے کہاں جا ٹکائی تھی، سردار کے کسی اعتراض کا درست جواب نہ سوجھا تو اسے اور پروین کو ہی کٹہرے میں لا کھڑا کیا، ان کی ایسی بے سروپا اور بے ہودہ باتیں سن کر اماں کا پارہ بھی چڑھ گیا۔

”نی گل سن نی نصیبن! تو کون ہوتی ہے میرے پتر اور میری بہو کو باتیں سنانے والی، اپنے درہموں کا رعب کسی اور کو دینا جا کر، ہم تمہارے رعب میں آنے والے نہیں ہیں اور بچہ ہونا نہ ہونا رب کے کام ہیں، کسی بندے کا اس میں کیا اختیار اور پھر جب ہمیں اپنی بہو سے کوئی شکایت نہیں، اپنے رب سے کوئی گلہ، کسی طرح کی ناامیدی نہیں تو تمہیں کیوں درد ہو رہا ہے، ہمارے وارثوں کے لئے، اللہ سلامت رکھے ان کے باپ کو اور اللہ سلامت رکھے ان تینوں بھائیوں کو جب اس کی مرضی ہو گی دے دے گا وارث بھی، تم صرف اپنی اور اپنے بچوں کی بات کرو، جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو، ول ڈال کر گل کرنے کی کوئی لوڑ نہیں، سمجھیں۔“ پھوپھی کی کٹیلی اور طنزیہ باتیں سن کر پروین بے اختیار رونے لگی تھی اور ان کے آنسو دیکھ کر اماں کا ضبط اور حوصلہ جواب دے گئے، لہٰذا انہوں نے دوٹوک انداز میں انہیں کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں کر رہی ہوں دوٹوک ہی گل، میں جو کہنے آئی تھی، وہ تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں، یہ رکھو اپنی انگوٹھیاں اور کپڑے ہمیں یہ رشتے نہیں چلانا آگے، میں نے نمو کی شادی طے کر دی ہے شہر میں اور مجھے وٹہ سٹہ بھی نہیں کرنا، فضول جاہلوں والی رسمیں، تم جاہل لوگ ہی نبھاؤ، ہمیں معاف ہی رکھو۔“

اماں کے سامنے چارپائی پر نمو اور جاوید کی منگنی کی انگوٹھیاں اور سرخ گوٹے سے سجا دوپٹہ جو منگنی پر نمو کو اوڑھایا گیا تھا، پھینک کر پھوپھی نصیبن بکتی، جھکتی باہر نکل گئیں اور اپنے پیچھے ایک غم کا پہاڑ اس خاندان پر ڈھا گئیں۔

اتنی بے عزتی، اتنی رسوائی، اتنی جگ ہنسائی، ابا بے چارے جو جھکے سر اور کندھوں کے ساتھ بیٹھے زمین کو گھورے جا رہے تھے لمحوں میں ان صدمات کا بوجھ نہ سہار سکے اور اسی زمین پر لڑھک گئے، اس اچانک پڑنے والی افتاد نے گھر بھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا، مگر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا، لاکھ سردار، معراج نے آوازیں دیں، اماں کے بین، زہرہ، پروین، زبیدہ کے واسطے کوئی چیز انہیں واپس نہ لا سکی اور وہ اپنے دردمند دل پر اپنی ہی بہن کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے اس چرکے کی تاب نہ لاتے ہوئے منوں مٹی تلے جا سوئے، یہ دیکھے بغیر کہ اب ان کے بچوں کے اجڑے نصیب کیسے سنوریں گے اور آگے بھی انہیں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ ہر طرف سے کان لپیٹے بلاوہ آنے پر فوراً اپنے مالک حقیقی کے حضور جا کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

وقت کیسا ہی ہو گزر ہی جاتا ہے، غم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، آخر کار ہلکا پڑ ہی جاتا ہے، یہ زندگی ہے اور زندگی زندہ لوگوں سے ہی زندگی کا خراج وصول کرتی ہے، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، ان کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے، پھر چاہے ہنستے ہنستے کریں یا رو پیٹ کر یہ تو بندے کے اپنے اوپر منحصر ہے اور ان کا وقت بھی گزرتا چلا جا رہا تھا، باپ کی وفات کے بعد چند ماہ تو انہیں سنبھلنے میں ہی لگ گئے تھے۔

سرتاج تو پھر مرد تھا، جوان تھا، پھوپھی نصیبن کی تلخ زبان اور نمو کی بے رخی اور بے وفائی اسے توڑے دے رہی تھی، تو زبیدہ تو پھر نازک سی لڑکی تھی، اس کا تو صدمات سے برا حال ہو چکا تھا، چار سالہ پرانی منگ چھوٹی، بچپن کی محبت نے دامن چھڑایا، جان چھڑکنے والا شفیق اور مہربان باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور گبھرو جوان بھائیوں کی جو بے عزتی ہوئی وہ الگ۔

اس غریب کو تو جانے سانس بھی کیسے آ رہا تھا، مگر زبان سے اف تک نہ کرتی تھی۔

اب پھوپھی نصیبن کی حیثیت واقعی بڑی

مضبوط ہو چکی تھی، خاندان برادری اس کا کیا بائیکاٹ کرتی وہ خود ہی سب کو رد کر کے ہمیشہ کے لئے گاؤں ہی چھوڑ کر شہر جا بسی وہ اور اپنی طرف سے گاؤں سے رابطہ ہمیشہ کے لئے توڑ چکی تھی۔

☆☆☆

"سرتاج! یار یہ کیا حال بنا رکھا ہے تو نے، کیسے روگ لگا لیا ہے یار تو نے اپنی جان کے ساتھ، چھوڑ دفع کر، جو تجھے بھول گئی تو بھی اس پر لعنت بھیج اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کر یار، زندگی صرف نمو پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔" سردار اور کمال تو اسے ہمیشہ سمجھاتے ہی رہتے تھے، مگر آج اپنے دوست حمیدے ڈرائیور کے منہ سے یہ ہی باتیں سن کر سرتاج چونک گیا۔

"کیا واقعی میں اپنے منہ پر غم کا اشتہار لگائے پھر رہا ہوں؟ کیا واقعی مجھے دیکھ کر لگتا ہے کہ میں ہارا ہوا ہوں؟ کیا واقعی میرے ماتھے پر ٹھکرایا ہوا کا عنوان کندہ ہے؟ کیا واقعی؟" اپنے چہرے کو ایک عرصے کے بعد آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ خود سے سوال پر سوال کیے جا رہا تھا اور ہر سوال کا ایک ہی جواب اسے مل رہا تھا۔

"ہاں ہاں ہاں۔"

"نہیں میں یہ نہیں ہونے دونگا، کسی قیمت پر نہیں، میں ایک بے وفا اور خود غرض لڑکی اور ایک مفاد پرست مطلبی عورت کی خواہش پوری نہیں کرونگا، کیا کہا تھا پھوپھی نصیبن نے، ان پڑھ، گنوار اور لاوارث، اب بتا دونگا میں اسے کہ اس نے سرتاج دین کو سمجھا ہی نہیں، سرتاج کی محبت اور چاہت کو جانا ہی نہیں، میں اب بتاؤں گا، ان ماں بیٹی کو کہ سرتاج دین ہے کون؟" ایک عرصے کے بعد وہ واپس اپنی جوان میں آیا تھا، اب اسے ایک جنون ایک دھن سی سوار ہو گئی تھی کہ وہ کچھ ایسا کرے کہ پھوپھی کو اپنی غلطی اپنی کوتاہی کا شدت سے اندازہ ہو، وہ کم از کم زبیدہ کے لئے پھر سے دست سوال دراز کرے، مگر اس بار وہ انہیں دھکے مار مار کر گھر سے نکال باہر کرے، اس کے اندر پلنے والے انتقامی جذبے اسے چین ہی نہیں لینے دیتے تھے اور پھر ان جذبوں کو ہوا دینے والے اس کے دوست حمیدے ڈرائیور اور منورا جانے کیا کیا منصوبے بناتے رہتے تینوں مل کر، کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور پھر ایک روز سرتاج نے گھر میں ایک اور دھماکہ کر ڈالا، وہ سب کی مخالفت کے باوجود، انہیں حیران پریشان چھوڑ کر شہر چلا گیا، اس کے دوستوں نے اسے جانے کیا کیا خواب دکھائے تھے کہ وہ اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنے کے لئے پردیسی ہو گیا۔

☆☆☆

"اماں! یہ رئیس ہے، حمیدے کا رشتہ دار، میرا محسن اور دوست، اس نے شہر میں میرا بڑا ساتھ دیا، مجھے گھر جیسا سکھ اور پیار ملا ہے اس کے گھر میں۔"

پورے ڈیڑھ سال کے بعد سرتاج گاؤں لوٹا تھا، مگر اکیلا نہیں اس کے ساتھ دو عورتیں اور دو مرد بھی تھے اور اب اپنی اماں اور بھائی کے سامنے ان کی شان میں ربط اللسان تھا۔

"بسم اللہ، بسم اللہ جی آیاں نوں، پتر یہ اگر تیرے محسن ہیں تو ہم بھی ان کے احسان مند ہی ہیں کہ دور پردیس میں انہوں نے ہمارے بچے کا خیال رکھا، آپ کا بہت شکریہ۔"

"بہن جی! آپ نے میرے تاجے کا اتنا خیال رکھا۔" اماں نے تشکر بھرے انداز میں اپنی ہم عمر خاتون سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"نہیں بہن جی! احسان کیسا، یہ تو جی کو جی ہے، سرتاج تو بڑا بیبا اور تابعدار بچہ ہے جب اس نے ہمیں "نہ" نہیں کی اور ہماری ہر بات مانی تو پھر ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، آپ ایسی غیروں والی باتیں نہ کریں، اب ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں، آخر کو ایک ہونے جا رہے ہیں۔" ان خاتون نے عجیب گول مول سی بات کی تھی، اماں تو اپنی سادہ دلی اور سادگی کی وجہ سے سمجھ نہ پائیں، مگر باقی سب لوگ ٹھنک سے گئے، مگر سرتاج نے ان کی الجھن دور کرنے کی بجائے بات بدل گیا۔

پھر جتنے دن بھی وہ لوگ وہاں رہے زبیدہ کو شدید الجھن رہی کیونکہ ان خواتین کا اسے اٹھتے بیٹھتے لاڈ پیار جتانا، باتوں باتوں میں الٹے سیدھے سوال پوچھنا، مگر اس کے ہاتھ کوئی سرا لگ نہیں رہا تھا، مگر پھر جلد ہی راز فاش ہو گیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر چوہدری نور دین مرحوم کے گھر کے در و دیوار ہل گئے تھے، ایک بار پھر اماں دل تھامے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھیں، یہ کیا کر ڈالا سرتاج نے، انہیں تو یقین ہی نہیں آیا تھا، وہ تو حیرت کی شدت سے گم صم ہی ہو گئے تھے اور سرتاج...... سرتاج یوں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا جیسے سارے مسائل کو جڑ سے ختم کر چکا ہو۔

"سرتاج! یہ...... یہ خالہ کیا کہہ رہی ہیں اور...... اور یہ کس شرط اور کس رشتے کی بات کر رہی ہیں، تمہارا کیا رشتہ ہے ان کے ساتھ؟ کھل کر بتاؤ سب، سچ سچ۔" سردار حیرت کے غلبے سے بمشکل نکلا تھا اور اب کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے جواب طلب کر رہا تھا۔

"لالہ! غیر نہیں ہیں لوگ، اپنے ہیں، ہمارے اپنے، آپ کو بتایا تو ہے کہ رئیس میرا دوست اور بابا سسر اور یہ ان کی امی ہیں، یعنی کہ میری نانی ساس اور اب زبیدہ کی ہونے والی ساس، یہ میری ساس ہیں عذرا بانی اور یہ میرے سسر عباس ہیں، میں نے سدرہ سے شادی کر لی ہے، سدرہ وہاں شہر میں میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی تھی، ہماری ملاقات ہوئی اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے، پھوپھی نصیبن کو بڑا غرور تھا ناں اپنی نمو کے دس جماعت پاس ہونے پر اور کس حقارت سے وہ کہہ رہی تھی مجھے ان پڑھ، جاہل، انگوٹھا چھاپ، اب کوئی بتائے اسے جا کر اس ان پڑھ جاہل تاجے کی بیوی پوری چودہ جماعتیں پاس ہے، پوری چودہ جماعتیں لالہ...... اور وہ باؤ جوید، کویت جا کر کیسے بھول گیا سب کچھ، پیچھے مڑ کر دیکھنا پسند نہیں کیا اس بھگوڑے نے، ہماری معصوم بہن کی زندگی داؤ پر لگا دی، دیکھیں آپ...... دیکھیں زبیدہ کو، کیسے ویران اور اجڑی اجڑی سی لگنے لگی ہے، مگر اب نہیں، اب اور نہیں، میں اب اپنی بہن کو اور زیادہ اس کم ظرف انسان کے نام پر بیٹھنے نہیں دونگا، اسی لئے...... اسی لئے میں نے اس کا بڑا بھائی ہونے کے ناطے اس کا رشتہ اپنے ماموں سسر رئیس کے ساتھ طے کر دیا اور اب یہ لوگ شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں، آپ کوئی مناسب تاریخ دیکھ کر باقی کے معاملات طے کر لیں، جہیز وغیرہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں، جو ہے بس کافی ہے۔" ان کی تمام تر

حیرتوں کو نظر انداز کیے سرتاج اتنے اطمینان سے بول رہا تھا کہ سب کو اس کے اطمینان پر حیرت ہو رہی تھی۔

"مگر سرتاج! تو ہم سے مشورہ تو کرتا، ہمیں اعتماد میں تو لیتا ہم تیرے دشمن تو نہیں تھے ناں، اگر تجھے وہ لڑکی اتنی ہی پسند آ گئی تھی تو ہمیں کہا ہوتا، ہم خود تیرا رشتہ لے کر جاتے ان کے ہاں اور عزت سے بیاہ کر لاتے اپنی بہو کو، مگر تو نے تو خود ہی اپنا بڑا بن کر سارے فیصلے کر ڈالے، اب بتا ہم کیسے اعتبار کر لیں تیری باتوں کا، ہمیں کیا پتا کہ تیرے ان سگوں کی ذات برادری کیا ہے اور یہ لڑکا، جس کو تو نے اپنی بہن کا رشتہ دے ڈالا کرتا کیا ہے؟ گھر بار کیسا ہے ان کا اور کون لوگ ہیں یہ، ہم کیا جانیں اور ہمیں تو تیری شادی والی بات بھی جھوٹی کہانی ہی لگتی ہے، اگر تو نے بیاہ کر لیا ہے تو کہاں ہے تیری گھر والی، آئی کیوں نہیں ساتھ تیرے، بول...... بتا؟" اماں اور سردار باری باری غصے اور صدمے کے ملے جلے تاثرات لیے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"اماں! میں نے کہا ناں، میں بھی اسی گھر کا بیٹا ہوں، زبیدہ کا بڑا بھائی، دشمن نہیں ہوں آپ لوگوں کا، اور ذات برادری میں کیا رکھا ہے، پہلے ہی اس برادری اور اس ذات نے ہمیں کیا دیا ہے، کوئی چاہے کچھ بھی کہے، مگر میں نے جو مناسب سمجھا وہ ہی کیا اور رہ گئی سدرہ کے ساتھ نہ آنے کی وجہ تو وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ اتنا لمبا سفر کر سکتی، اماں آپ دادی اور لالہ آپ تایا بننے والے ہو چند دنوں تک۔" اتنی بڑی خوشخبری اور اتنے کام کی بات، اس نے بالکل آخر میں بتائی تھی اور وہ بھی اتنے عام سے انداز میں کہ پہلے تو ان سب کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی۔

"کیا......؟ کیا تو سچ کہہ رہا ہے، کھا میری قسم، تو جھوٹ تو نہیں بول رہا ناں؟" اماں تو بالکل ہی بے چین ہو گئی تھیں سردار اور پروین بھی اسے بے یقین ہو کر اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"ہاں بہن! سرتاج بیٹا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، آپ خیر سے دادی بننے والی ہیں، اسی لئے تو ہم لوگ آپ کے سامنے جھولی پھیلائے آن کھڑے ہوئے ہیں، تاکہ آپ ہماری امانت ہماری جھولی میں ڈال دیں اور اپنی بہو اور اپنی نسل کے وارث کو اپنے گھر لے آئیں، بس ہمیں اور کچھ نہیں چاہئے، سوائے اپنی بہو کے۔" رئیس کی ماں نے آگے بڑھ کر اماں کے ہاتھ تھام لیے اور کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ پتے کی طرح لرزتا ڈولتا ان کا دل جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

اور یہ خوشی تو ایسی تھی کہ اس نے ان کو سب کچھ بھلا دیا تھا، یہ تو اس گھر کا برسوں پرانا خواب تھا اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پروین کی گود سونی ہی تھی، جبکہ زہرہ کے بچے بھی جوانی کی دہلیز پر آ کھڑے ہوئے تھے اور اب یہ مژدہ جان فزا تھا یوں پھر باقی کے معاملات خود بخود طے ہوتے چلے گئے۔

جلد ہی زبیدہ اور رئیس کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی اور سانولے سلونے تاڑ جیسے لمبے اور سوکھے کمزور سے رئیس پر بھی ہر اعتراض اپنی موت آپ مر چلا تھا، کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، نظر آ رہا تھا تو صرف اور صرف آنے والا وقت اور وہ "وارث" جو ابھی

آیا بھی نہیں تھا مگر جس کے آنے کی خوشگوار آہٹیں انہیں چہار اطراف گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سب سے چھوٹی، گھر بھر کی لاڈلی صفیہ، جو تیزی سے بدلتے حالات پر پہلے ہی پریشان تھی، اچانک اٹھ کھڑے ہونے والے اس شوشے سے اور بھی پریشان ہو چکی تھی، اس پر چھوٹی آپا (زبیدہ) کا ہر وقت کا چھپ چھپ کر رونا، بھابھو اور بڑی آپا کو انہیں اپنے اپنے انداز میں تسلیاں دینا اور پھر وہ رئیس لالہ جو اسے پہلی نظر میں ہی پسند نہیں آیا تھا، عجیب روکھا پھیکا سا انداز تھا اس کا، ایسے رعب سے گردن اکڑائے رکھتا تھا جیسے سچ مچ کہیں کا رئیس اعظم ہو، جب تک ان کے گھر رہا، گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا رہا تھا، لاکھ سوال پوچھنے پر ایک مختصر سا ہاں یا نہیں، بس اس کے علاوہ مجال ہے جو کوئی فالتو لفظ اس کی زبان سے نکلا ہو اور اب اس کے ساتھ اس کی اتنی پیاری آپا کی شادی، جبکہ اس نے تو اب تک جب بھی ان کی شادی کا تصور کیا تھا، بھاء جاوید چھم سے اس کی آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوتا، چھوٹی آپا کے سنگ کھڑا ہنستا ہوا اسے اور معراج لالہ کو چھیڑتا ہوا، بھابھو اور بڑی آپا سے باتیں بھگارتا ہوا، اماں اور ابا مرحوم کے ساتھ ساتھ لالہ سے ادب و احترام سے نگاہیں جھکا کر ملتا ہوا اس کی یادداشتوں میں بچپن میں دیکھے ایسے کئی مناظر ابھی تک محفوظ تھے، جنہیں وہ ابھی تک نہیں بھول پائی تھی تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ چھوٹی آپا بھی کچھ بھول پائی ہوں گی۔

اسے رہ رہ کر شک ہونے لگا تھا کہ آپا اس شادی سے خوش نہیں ہے، اس کا معصوم دل کسی "انجانی انہونی" کے خوف لرزتا رہتا تھا اور شاید اپنے اسی شک اور خوف کو دور کرنے کے لئے وہ بھابھو اور بڑی آپا سے الٹے سیدھے سوال کیے چلے جاتی تھی اور وہ تھیں کہ اس کے ہر سوال کے جواب میں ٹھنڈی آہ بھر کے اسے اور پھر چھوٹی آپا کو دیکھ کر سر جھکا لیتیں۔

"چھوٹی آپا! آپ کو ابھی بھی بھاء جاوید یاد آتے ہیں ناں؟ آپ انہیں بھول نہیں پائیں ناں؟ آپ کو رئیس لالہ پسند نہیں آئے ناں...... آپ......؟"

"بس چپ کر جا صفو! کیوں میرے زخموں کو چھیڑتی ہے؟ کیوں میری راہیں کھوٹی کرتی ہے پگلی، خبردار...... خبردار اب اپنی زبان پر کوئی اور سوال نہ لانا، خبردار اب جاوید کا نام تمہارے منہ سے نہ نکلے ورنہ...... ورنہ غضب ہو جائے گا، اگر بڑے یا چھوٹے لالہ نے سن لیا تو، بس خاموش ہو جا۔" چھوٹی آپا نے بے تابی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اسے آغوش میں بھر کے بے ساختہ رو پڑی تھیں۔

"کاش! کاش پھوپھی نصیبن نے ہم پر ایسے ظلم نہ ڈھایا ہوتا، کاش جاوید کویت گیا ہی نہیں ہوتا، بھلے وہ یہیں رہ کر محنت مزدوری کر لیتا، بھلے وہ مجھے غربت میں ہی بیاہ لے جاتا، مگر اس طرح جدائی کا دکھ تو نہ دیتا، کاش......"

زہرہ آپا اور پروین بھابھو بھی ان کے ساتھ ہی سسک اٹھیں تھیں، مگر اب ہو کیا سکتا تھا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا، اب بھلا لکیر پیٹنے سے ملا بھی تو کیا۔

☆☆☆

مگر کب کیا ہو جائے اور وقت کی بساط پر قسمت کب کون سا مہرہ چل جائے، کسی کو کیا خبر، کہ انسان جو خود کو سب سے زیادہ باخبر اور ہوشیار سمجھتا ہے، اس کی اوقات صرف ایک مہرہ، وقت اور تقدیر کے ہاتھوں چلنے والا بے بس، لاچار مہرہ، وقت نے پھر پلٹا کھایا، تقدیر نے ایک اور وار کیا اور وہ سب ایک بار پھر انگشت بدنداں رہ گئے۔

زبیدہ کے ہاتھوں پر شگنوں کی مہندی لگ چکی تھی، اسے مایوں کا پیلا جوڑا پہنایا جا چکا تھا، وہ اپنے دل میں اٹھنے والے جوار بھاٹوں سے نگاہیں چرائے، اپنے بھائی کے فیصلے پر سر جھکا چکی تھی اور اس کی اس گم صم حالت کو دیکھتے ہوئے جانے کیوں بار بار صفیہ کے دل میں عجیب عجیب سے وسوسے پیدا ہوئے جا رہے تھے، اس نے تو جانے چپکے چپکے کتنی دعائیں مانگ ڈالی تھیں۔

کسی انہونی کے ہو جانے کی کسی رکاوٹ کے ڈل جانے کی، بارات کے ہی نہ آنے کی، مگر اسے معلوم نہ تھا، اس معصوم کو شاید بالکل علم نہ تھا کہ اگر انہونی ہو جائے، چلتے کاموں میں رکاوٹ آ جائے، معجزہ بھی ہو جائے تو، تو بھی بارات آ کر ہی رہتی ہے۔

وہ جس معجزہ کے ہو جانے کی دعائیں مانگ رہی ہے، وہ معجزہ اس کے لئے کیا قیامت لائے گا، اسے تو قطعاً خبر نہ تھی، ورنہ وہ لب سی لیتی، آنکھیں بند کر لیتی، بہن کے دل سے نکلتی سسکیاں ان سنی کر دیتی، مگر کسی انہونی، کسی کرامت، کسی معجزے کی دعا بھول کر بھی نہ کرتی کہ جانے کون سی گھڑی قبولیت کی ہو اور جانے کون سی دعا کسی انداز میں قبول ہو۔

☆☆☆

"مامی! میں یہ غضب ہر گز نہ ہونے دونگا، آپ میری امانت میں خیانت کر کیسے سکتے ہیں، میں آپ کو ایسا ہر گز نہیں کرنے دونگا اور سردار لالہ، اتنا سب کچھ ہو گیا اور آپ لوگوں نے مجھے خبر تک نہ ہونے دی، کیوں...... آخر کیوں؟ میں دیار غیر ہی تو گیا تھا، مر تو نہیں گیا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھے مرا ہوا ہی سمجھ لیا، کتنے خط لکھے میں نے، چوہدری صاحب کے ڈیرے پر کتنے فون کیے، مگر نہ کسی خط کا جواب ملا اور نہ ہی کسی نے فون پر بات کرنے کی کوشش کی، کیوں...... آخر کیوں؟"

جاوید ان بھائیوں کے سامنے سراپا سوال بنا کھڑا تھا، یہ کیسا امتحان لے رہی تھی زندگی ان سے اور ابھی جانے کتنے اور امتحان باقی تھے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے اور کتنا خراج وصول کرنا تھا زندگی کو ابھی ان سے کہ بات بنتے بنتے بگڑ جاتی تھی، ابھی زبیدہ کی بارات آنے میں وقت تھا، وہ صرف چوہدری نور دین مرحوم کی ہی بیٹی نہ تھی، بلکہ حسب روایت گاؤں بھر کی بیٹی تھی اور سارے ہی گاؤں والے بارات کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے کہ بارات سے پہلے ہی ایک اور بارات چلی آئی۔

رئیس کی بارات تو جانے کب تک پہنچی مگر باؤ جاوید اپنے دوستوں اور نصیبن کے ساتھ دولہا بنا پہنچ چکا تھا، ایک بار پھر زمانہ اپنے ہاتھوں میں سنگ لئے اور زبانوں میں زہر بھرے انہیں خون آشام نگاہوں سے گھور رہا تھا، ان گزرے سالوں نے باؤ جاوید کی مالی حیثیت بہت مستحکم کر دی تھی، گاؤں والوں پر تو اس کی ذاتی لمبی چوڑی موٹر کار کا رعب ہی

اتنا پڑ چکا تھا کہ وہ اسے ڈرتے ڈرتے بس دور دور سے ہی دیکھے جا رہے تھے، اس کی کسی بات پر نقطہ اعتراض کیا اٹھاتے۔

"مامی! زبیدہ میری منگ ہے اور بچپن کی محبت بھی میں بھلا اپنی منگ کیسے چھوڑ سکتا ہوں، شکر ہے مولیٰ کا کہ مجھے بروقت خبر مل گئی کہ آپ لوگ زبردستی میری منگ کو کسی اور کے ساتھ سنگ وداع کرنے جا رہے ہیں اور میں فوراً اپنی غیرت کی حفاظت کے لئے پہنچ گیا ہوں، آپ...... آپ......!"

"اوئے بس کر اوئے، بڑا آیا منگ اور غیرت والا، اس وقت کہاں تھا تو جب تیری ماں اور بہن نے ہماری بے عزتی کی تھی، جب یہ...... یہ پھوپھی نصیبن اپنے نصیبوں کی ساری سیاہی ہمارے منہ پر مل کر خود دامن جھاڑ کر چلتی بنی تھی، اس وقت کہاں تھی تیری غیرت، جب تیری بہن نے اپنی منگ کو ٹھوکر مار، شہر کے باؤ کے ساتھ دیاہ کر لیا تھا، اوئے! آج بڑی بڑی باتیں بھگار رہا ہے، اس وقت کہاں تھا تو جب تیری ماں کی زبان سے نکلے زہر نے ہمارے باپ کے دل اور وجود کو نیلو نیل کر دیا تھا، بول، کہاں تھا اس وقت تو...... اب آ گیا ہے بڑا پارسا بن کر، جھوٹ بولتا ہے تو...... کوئی خط شط نہیں ملے ہمیں تیرے ان پانچ سالوں میں اور نہ ہی فون شون ملا ہے، یہ ڈرامے کہیں اور جا کے کر، اب ہماری عزت کا اور تماشہ بنانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا، یاد رکھیں اور شکر تو اس بات کا ادا کر کے سرتاج یہاں نہیں ہے، ورنہ وہ تیری بوٹیاں ضرور چیل کوؤں کو کھلا دیتا، مگر تجھے اور تیری ماں کو یہاں سے زندہ واپس نہ جانے دیتا، شکر کر اور چل نکل یہاں سے۔" سردار کا ضبط جواب دے گیا تھا اور اس کی دھاڑ نے ایک بار تو سب کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

مگر باؤ جاوید بھی اپنے مقدمے کو جیتنے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا اور ویسے بھی اس کے پاس دولت کی پاور تھی، دولت جو سپر پاور ہے، جس سے اس زمانے میں سب کچھ خریدا اور بیچا جا سکتا ہے، جس کے بل بوتے پر حکمرانی کا تاج اور کامیابی کا ہما اپنے سر پر سجایا جا سکتا ہے، وہ ہی طاقت، وہ ہی سپر پاور جاوید اور پھوپھی نصیبن کے پاس تھی لہٰذا انہیں خود پر کامل بھروسہ تھا۔

"دیکھو لالہ! میں مانتا ہوں کہ میری ہی غلطی ہے، مجھے اماں اور نمو کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا، مجھے تو انہوں نے یہ ہی بتایا تھا کہ ماموں نے رشتہ ختم کر دیا ہے، کیونکہ ماما بہشتی کو میرا کویت جانا پسند نہیں تھا اور انہیں کسی نے میرے خلاف ورغلا دیا تھا کہ میں نے وہاں شادی کر لی ہے، اسی لئے انہوں نے اماں کی بے عزتی کر کے رشتہ ختم کر دیا، سچ کہتا ہوں مامی، مجھے پہلے یقین نہیں آیا تھا، مگر پھر اماں اور نمو کے آنسو مجھے لگا کہ شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں، پھر میں نے تو آپ کو کئی خط لکھے، مگر آپ نے کوئی جواب ہی نہ دیا بلکہ چند بار میں نے چوہدری کے ڈیرے پر فون کیا تو ان کے منشی نے کہہ دیا کہ آپ لوگ میرا نام سننا پسند نہیں کرتے، مجھے گالیاں دیتے ہیں اور میری ماں بہن کو برا بھلا کہتے ہیں، تو میں بھی غصے میں آ کر خاموش ہو گیا اور شاید مجھ پر حقیقت کبھی نہ کھلتی، اگر چوہدری نصیر مجھے وہاں نہ ملا ہوتا، ابھی پچھلے ہفتے ہی تو وہ مجھے ملا تھا کویت میں اور اس کی زبانی مجھے سارے حالات کا علم ہوا تو میں نے فوراً واپس آنے

کی، گھر میں بتائے بغیر آ گیا، مجھے معاف کر دیں مامی، لالہ مجھے معاف کر دیں اور خدا کے لئے اپنے فیصلے تبدیل کر لیں، میں زبیدہ کو اماں کے پاس نہیں رکھوں گا، اسے کویت لے جاؤں گا اپنے ساتھ، اب اماں اور نمو، میرے اور میرے بچوں کے چہرے دیکھنے کو ترسیں گی، دولت پیاری تھی نہ انہیں، یہ دولت کے ساتھ ہی رشتہ نبھائیں گی، یہ ہی ان کی سزا ہے۔" وہ ہاتھ باندھے اماں کے قدموں میں جھکا بیٹھا تھا اور اس کے آخری فیصلے نے پھوپھی نصیبن کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔

"نہیں، نہیں پتر جوید، اس موئی دولت کی چکا چوند نے میری بینائی چھین لی تھی، میں لالچ میں اندھی ہو گئی تھی جو ہیرے موتی جیسے انمول رشتے اور پر خلوص سنگی ساتھیوں کو اپنا دشمن سمجھ، چھوڑ چھاڑ ان مطلبی موقع پرست غیروں میں جا بسی، مجھے معاف کر دو، پرجائی، مجھے معاف کر دے پرجائی، میں قاتل ہوں اپنے بھاء نور دین کی، میں مانتی ہوں میرے ظالم فیصلے نے میرے بھائی کی جان لے لی، مگر پرجائی اب تو رحم کر ان بچوں پر تو میرے جیسا ظالم اور سنگدلانہ فیصلہ نہ کر بیٹھنا، میں جانتی ہوں اگر میرا جوید، زبیدہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تو، میری دھی زبیدہ بھی اس کے بغیر ادھوری ہے، پرجائی رحم کر، ان دونوں کے حال پر۔" معافیاں مانگتی ہوئی ترلے کرتی، کرلاتی یہ تو وہ ہی نصیبن تھی جو تھوڑے عرصے تک مصنوعی رنگ میں رنگی رہنے کے بعد پھر سے اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی تھی۔

"اٹھ جاؤ پھوپھی! اس طرح ہمارے پیروں کو ہاتھ لگا کر ہمیں گناہ گار نہ کر، تیرے اس طرح وین (بین) ڈالنے سے ہمارا ابا تو واپس نہیں آ جاتا، مگر ہاں تو ٹھیک کہتی ہے تیری طرح ظلم ہم سے نہ کمایا جا سکے گا، ہم چاہ کر بھی تیری طرح ظالم نہیں بن سکتے، اٹھ جا اور مجھے زبیدہ سے پوچھ لینے دے، اس کی کیا مرضی ہے۔" سردار نے آگے بڑھ کر پھوپھی نصیبن کو اٹھایا اور خود اندر زبیدہ کے پاس چلا گیا، جو دروازے میں کھڑی برستی آنکھوں سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ کیا کر ڈالا لالہ تم لوگوں نے، اس طرح کیسے ہو سکتا ہے بھلا، ہم مردوں نے زبان دی تھی، دی تھی کہ نہیں، تو پھر آپ اپنی زبان سے کیسے پھر سکتے ہیں، میں آپ کے فیصلے کو نہیں مانتا، مہینہ پہلے جو فیصلہ آپ سب کی موجودگی میں ہوا تھا، آپ اسے کیسے اکیلے ہی بدل سکتے ہیں، ان مکاروں کے آنسوؤں نے ایسا کیا جادو کر دیا کہ آپ جانتے بوجھتے اندھے بہرے ہو گئے، بتائیں لالہ مجھے اب ان لوگوں کو کیا جواب دوں میں، میں کیا کروں اب، اس شاطر مکار عورت نصیبن کی وجہ سے میری زندگی ایک بار پھر داؤ پر لگ گئی ہے لالہ، مگر اب میں ایسا کچھ بھی برداشت نہیں کروں گا، اب کہ کسی قسم کی چالاکی نہیں چلے گی میرے ساتھ، سن لیں آپ، کان کھول کر سن لیں، میں نے زبان دی ہے اور مجھے اپنی زبان پوری کرنی ہے بس۔" وقت مقررہ پر سرتاج اپنے سسرال والوں کے ساتھ بارات لے آیا تھا، مگر یہاں تو پانسہ ہی پلٹ چکا تھا ایک دن پہلے ہی تو بڑی ایمرجنسی میں زبیدہ اور جاوید کا نکاح پڑھوا کر رخصتی بھی کر دی گئی۔

اور اب سرتاج مارے غصے کے کف اڑاتا پھر رہا تھا، ادھر اس کی ساس اور تائی ساس نے الگ بول بول کر ایک سیاپا کھڑا کر رکھا تھا اب ایسے میں سوائے ان کی جلی کٹی سننے کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا، سو وہ سب خاموشی سے صبر کے گھونٹ بھرتے سب سنے جا رہے تھے، مگر یہ معاملہ خاموشی سے حل ہونے والا نہ تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، معاملہ کی سنگینی کا اندازہ سب کو ہوتا جا رہا تھا۔

"سرتاج! تم نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے، تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی شادی کے بدلے تم ہمارے لڑکے کو اپنی بہن کا رشتہ دو گے اور اب تمہارے گھر والے اس وعدے سے مکر گئے ہیں، ہمارے رئیس کی منگ انہوں نے کسی اور کے ساتھ رخصت کر دی، اب ہمارا فیصلہ بھی سن لو، ہم اپنی لڑکی کو تمہارے ساتھ نہیں رہنے دیں گے، تم خود ہی اسے طلاق دے دو ورنہ ہم عدالت کے ذریعے خلع لے لیں گے اور جو یہاں بلا کر ہماری تبتی (بے عزتی) کی ہے تم لوگوں نے، اس کا بدلہ بھی ضرور لیں گے، تمہارا بیٹا تم سے چھین لیں گے، کبھی تم لوگوں کو اس کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہو گی، یاد رکھنا، ہماری بات۔" رئیس کا بھائی اور بہنوئی لال انگارہ آنکھیں لئے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتے دھمکیوں پر دھمکیاں ہی دیئے جا رہے تھے اور ان کی دھمکیوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔

"لیکن بھائی! میرا قصور کیا ہے، میں تو خود کچھ نہیں جانتا، میں بھی تو آپ لوگوں کے ساتھ ابھی ابھی آیا ہوں، مجھے بھلا کیسے علم ہو سکتا تھا کہ یہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے، بھلا کسی اور کی غلطی کی سزا مجھے اور میری بیوی بچے کو کیوں ملے، آپ کچھ تو خیال کریں خدارا۔"

"اچھا اب خیال بھی ہمیں ہی کرنا ہے اور تم کیا کرو گے، نری باتیں اور یہ غلطی نہیں جس فعل کو تم غلطی کہہ رہے ہو ہم اسے گناہ کہتے ہیں تمہارے گھر والوں نے دھوکہ دیا ہے ہمیں، ہمارے جذباتوں کے ساتھ کھیلے ہیں یہ لوگ اور تم ...... تم برابر کے شریک ہو اس میں، آخر کو خون تو ان کا ہی ہو ناں، تو پھر الگ کیسے ہو سکتے ہو ان سے، سنا تم نے۔" اس کی بات کاٹ کر اس کا سالا مارے غصے کے اسے مارنے کو لپکا تھا، مگر سردار نے درمیان میں آ کر اسے بچا لیا تھا۔

"دیکھئے بھائی صاحب! جو کچھ ہوا، ہماری وجہ سے آپ کو جو تکلیف اٹھانی پڑی ہمیں اس کا دلی افسوس ہے، ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتے ہیں اور رہا زبیدہ کے نکاح کا معاملہ تو سرتاج نے آپ کو شاید بتایا نہ ہو کہ جاوید اس کا بچپن کا منگیتر تھا، بعض نجی وجوہات کی وجہ سے اس سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا، مگر اب وہ واپس آ گیا اور اپنی امانت لینے چلا آیا تو ہم کیا کر سکتے تھے، سوائے اس کے کہ عزت کے ساتھ اسے رخصت کر دیں، آپ کے بیٹے کے ساتھ تو صرف مہینہ قبل ہی بات ہوئی تھی ناں مگر اس کے ساتھ تو رشتہ ہمارے والد مرحوم نے طے کیا تھا، اب بتائیں بھلا زیادہ اہمیت کس کی ہو سکتی ہے، سرتاج کی یا ابا جی کے وعدے کی۔" سردار نے اپنے طور پر انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا تھا، مگر وہ لوگ غصے کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے دماغ کام ہی نہیں کر پا رہے تھے، اس لئے وہ سمجھ کر بھی ناسمجھ بن رہے تھے اور اب

کھلم کھلا گالی گلوچ پر اتر آئے تھے۔

''دیکھو بھائیو! اس طرح گالی گلوچ کرنے اور تو تکار کرنے سے مسئلے کا حل نہیں نکلنے والا، آپ لوگ ذرا ٹھنڈے دماغوں سے کام لیں تو ابھی بھی کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا، آپ آرام سے بیٹھیں تو سہی۔'' چوہدری بشیر جو گاؤں کے سربراہ بھی تھے، ان کو سارے معاملے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً بھاگے چلے آئے تھے اور اب دونوں فریقین کو سمجھانے بجھانے میں مصروف تھے۔

''او چھڈو چوہدری جی! اب کیا حل نکلے گا مسئلے کا، اب تو صرف ایک ہی حل ہے اور وہ بھی آخری اور حتمی، ہم اپنی لڑکی اور اس کا بچہ ساتھ لے کر جائیں گے ان کے لڑکے کو اسے طلاق دینی ہی ہوگی اور جو ہماری بے عزتی کی ہے گھر بلا کی، اس کا ہرجانہ بھی یہ ہی دیں گے اور اس شادیہ پر جو خرچہ آیا ہے اور اتنے لمبے سفر کا خرچہ وہ بھی الگ سے بھرنا ہوگا ان لوگوں کو، ورنہ پھر خون خرابا ہوگا ہی ہوگا، یہ کوئی گل ہے کرنے والی۔'' رئیس کے بھائی اور بہنوئی مان کر ہی نہیں دے رہے تھے اور ادھر بارانی عورتیں الگ زہر اگلنے میں مصروف تھیں۔

''او بھاء جی پر آپ بیٹھو تو سہی، ہم ابھی کے ابھی پنچائیت بٹھاتے ہیں اور آپ کے مقدمے کا فیصلہ پنچائیت میں کروا دیتے ہیں آپ ہمارے پروہنے (مہمان) ہو، آپ فکر کیوں کر رہے ہو جی۔'' ایک اور بزرگ نے آگے بڑھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا اور پھر باری باری سب ہی بولنے لگے تو چاروناچار انہیں گاؤں والوں کی سننی ہی پڑی اور پھر دیکھتے ہی پنچائیت بیٹھ گئی، سارا معاملہ نئے سرے سے پنچائیت کے سامنے رکھا گیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔

☆☆☆

''دیکھ پتر! اب اس پنڈ کی لاج تیرے ہی ہتھ میں ہے، تو چاہے تو اپنے پرکھوں کی اپنی بہشتی باپ دادا کی پگ کو رلنے سے بچا سکتی ہے، فیصلہ تجھے ہی کرنا ہے پتری، کہ تو اپنے پرکھوں کی اور ہم پنچائیتوں کی لاج پالے گی یا پھر ہمیں یہاں سے ننگے سر، جھکے کندھوں کے ساتھ خالی ہاتھ واپس جانا پڑے گا، سوچ لے پتر، اچھی طرح سوچ لے، آخری فیصلہ بہرحال تمہارا ہی مانا جائے گا۔'' چوہدری بشیر سمیت گاؤں کے معززین اس کے سامنے بیٹھے اس کا فیصلہ جاننے کے منتظر تھے اور وہ بھلا کیا فیصلہ کرتی، ان حالات میں اور اس وقت وہ بھلا کیا فیصلہ کرتی کہ وہ اس پوزیشن میں تھی ہی کہاں، سو چپ چاپ گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کو گھورے جا رہی تھی۔

''صفیہ پتر! اگر تجھے پنچائیت کا فیصلہ منظور ہے اور تو ہماری لاج رکھنے کو تیار ہے تو پتر، یہ سرخ شگنوں والی چنری اپنے سر پر رکھ لے، اور اگر تیرا جی نہیں مانتا تو خیر، زبردستی کوئی نہیں ہے تیرے ساتھ۔'' تایا رمضان اور چوہدری بشیر جاتے جاتے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی اور خالی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی اور صرف وہ ہی نہیں کمرے میں موجود تمام نفوس حیرت سے گنگ رہ گئے تھے، گو کہ پنچائیت کا فیصلہ سب کو ہی مشکل اور سخت لگ رہا تھا، مگر سب سے زیادہ تکلیف پروین کو ہو رہی تھی، کیونکہ اس نے صفیہ کو سگی اولاد کی طرح ہی پالا تھا اور اب، اس سے دگنی عمر کے رئیس کے ساتھ، یہ تو واقعی اس کے لئے سوہان روح بات تھی اور اس کا احتجاج بالکل بے ساختہ اور فطری ہی تھا، ان لوگوں کے سر پر جو خون سوار تھا اور جس طرح زبانوں کے تیز دھار واروں سے وہ ان کے جگر کا خون کیے دے رہے تھے، یہ سب اس سے بالکل برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''کیوں؟ اپنی باری آئی تو بڑا درد اٹھ رہا ہے اپنی لڑکی کی عمر کا، کیا میں تمہیں نظر نہیں آئی جو اپنے سے دگنی عمر کے سرتاج کو اپنے سر کا تاج بنائے بیٹھی ہوں اور اور تم لوگوں کو وارث بھی دے دیا ہے میں نے، یہ بچہ تم لوگوں کے خاندان کا وارث ہی تو ہے ناں، اگر میں صفیہ کی ہم عمر ہو کر، اپنے مامے کی عمر کے مرد کے ساتھ ہنسی خوشی رہ سکتی ہوں تو اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو اس کے لئے دہایاں دے رہی تو تم بھابھی، آخر میں بھی تو سنوں برائی کیا ہے میرے مامے میں جو میری سسرال والے اسے رد کیے جا رہے ہیں، پہلے ایک منگ کی چپ چپاتے ڈولی ٹور دی اور اب دوسری کو آنے بہانے پکا کر رہی ہیں کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے ہونہہ۔'' سدرہ سے پروین کے واویلے دیکھے نہ گئے تو وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑی۔

''او پتری! تم لوگوں کو آپس میں الجھنے کی کوئی لوڑ نہیں، ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ آخری فیصلہ بہرحال صفیہ کا ہی ہوگا، اس لئے تم لوگ ٹھنڈ رکھو، رولا ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہورانی (بہورانی) تم نے اگر سرتاج کو اپنے سر کا تاج بنایا ہے تو اپنی مرضی سے بنایا ہے، پسند کی شادی کی ہے تم دونوں نے کوئی زور زبردستی نہیں تھی تم لوگوں پر، مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے، ایک تو سرتاج نے اپنے گھر والوں کو اعتماد میں ہی نہیں لیا اور اس پر زبیدہ کی جگہ صفیہ، ہے تو یہ ظلم ہی، پر کیا کریں، اب مجبوری ہے۔'' چوہدری بشیر نے دونوں کو باری باری سمجھاتے ہوئے کہا اور پھر وہ سارا ماحول یکلخت بدل گیا، صفیہ نے آگے بڑھ کر وہ سرخ زرتار چنری اٹھائی اور اپنے سر پر اوڑھ لی اس کی طرف سے رضامندی کا عندیہ تھا، اس کے اس عمل نے سب کے چہرے کھلا دیئے تھے۔

''صفیہ پتر!'' اماں نے روانی سے آنسو بہاتے ہوئے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''اماں! بس کریں، آپ لوگ روئیں نہیں، آپ نے سنا نہیں اگر میں نے ہاں نہ کی تو وہ لوگ بدلہ لینے پر اتر آئیں گے، میرے سرتاج لالے کو بسا بسایا گھر اجڑ جائے گا اور پھر میرے ویر، میرے ماں جائے، اتنی زیادہ رقم کہاں سے لائیں گے جرمانے بھرنے کے لئے، اگر میں رئیس لالہ سے شادی کر لوں گی تو ہمارے پنڈ کے پنچائیتوں کی اور میرے باپ دادا کی لاج بھی رہ جائے گی اور پھر شادی تو میری کرنی ہی ہے ناں آپ لوگوں کو اور اگر ابھی کر دیں گے تو کتنے مسئلوں کا حل نکل آئے گا اور لالہ آپ ہی تو کہتے ہیں ناں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں تو بس، مان جائیں آپ لوگ کہ یہ ہی میرا نصیب ہے، آپ لوگ دعا کریں میرے لئے، روئیں نہیں۔'' اور وہ لوگ بھیگی پلکوں سمیت اپنی کم عمر اور باحوصلہ بیٹی کو دیکھے جا رہے تھے، جو ان کی عزت کے لئے اپنے پرکھوں کی لاج بچانے کے لئے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اتنے آرام سے کر کے اب مطمئن سی انہیں بھی اطمینان دلا رہی تھی۔

☆☆☆

''بھابھو! آپ ہماری بات کیوں نہیں

سمجھ رہیں، ہم نے صرف اپنی خوشی اور خواہش سے آپ کے لئے صرف آپ کی محبت میں یہ فیصلہ کیا ہے اور آپ پھر بھی......"

صفیہ کے فیصلے نے بظاہر اس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی، وہ جس طرح خاندان، برادری کی رسموں اور روایتوں پر قربان ہوئی تھی، گمان یہ ہی غالب تھا کہ اب یہ دوشالہ ہی اس کا کفن بنے گا، اس کے اور سرتاج کے مشترکہ سسرالی، زبیدہ کی اچانک شادی اور رخصتی پر جس طرح سیخ پا تھے، اسے خود لگتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر خود کھود کر اس میں جا لیٹی ہو اور ادھر جب زبیدہ اور جاوید کو اس کے نکاح اور رخصتی کا علم ہوا تو انہوں نے الگ ہنگامہ کھڑا کر دیا، زبیدہ نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا، اس سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی جگہ اس کی چھوٹی بہن کو سولی چڑھا دیا گیا، وہ تو اپنے ساتھ ہونے والے حادثے پر ہی گم صم ہو گئی تھی، کب اس کے دو بول پڑھائے گئے اور کب اسے وداع کر دیا گیا، اسے کچھ ہوش نہ تھا اور پھر جیسے ہی وہ حواسوں میں واپس آئی، اس کے دل کو جیسے پتنگے لگ گئے تھے، اس کا وجدان اسے کچھ غلط بہت غلط ہو جانے کی گواہی دے رہا تھا اور پھر وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی، فوراً جاوید کے ساتھ میکے آئی تھی، مگر یہاں آ کر جو سارے حالات ان کے علم میں آئے تو ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"یہ کیا کر دیا چاچا جی آپ نے، کتنا تاوان مانگ لیا تھا سرتاج کے سسرال والوں نے، کتنی رقم چاہئے تھی ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے، دو لاکھ، چار لاکھ، دس لاکھ، پچاس لاکھ، ارے ایک بار ہم سے کہہ کر تو دیکھتے آپ، اگر میں اسی وقت نوٹوں کے انبار نہ لگا دیتا تو پھر کہتے آپ، مگر آپ...... آپ لوگوں نے بڑی زیادتی کی، اس معصوم بچی کے ساتھ، چاچا جی! آپ لوگوں نے پرکھوں کی لاج کا واسطہ دے کر اس معصوم لڑکی کے ساتھ کیا کر ڈالا، اس کا اندازہ ہی نہیں ہے شاید آپ کو، اب مجھے پتا چلا کہ کیوں...... کیوں آپ لوگوں نے اس دن ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیا تھا یہاں سے، کاش...... کاش میں نے آپ کی بات نہ مانی ہوتی اور...... خود سرتاج اور اس کے سسرالیوں سے بات کر لیتا، تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔" ایک تو جاوید کو ویسے ہی تپ چڑھی ہوئی تھی اور پھر زبیدہ کا رونا، اس کا ملال اب غصے میں بدلتا جا رہا تھا۔

"بس کریں بھائی جان! اب جو ہونا تھا ہو چکا، ہماری صفو ہمارے اس گھر، گاؤں سے جو لاج کی چادر اوڑھ کر نکلی ہے، دعا کریں وہ ہمیشہ اس کے سر پر تنی رہے اس کی عزت زندگی اور اس کی خوشیاں خدا ہمیشہ سلامت رکھے، اس وقت اسے ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے آہوں کی نہیں، ہم رو پیٹ کر واویلا کر کے اپنا غصہ تو نکال لیں گے مگر ہمارے اس عمل سے اس کی راہیں کیسے کھوٹی ہو سکتی ہیں، ہمیں شاید اس کا اندازہ ہی نہیں اس لئے میری آپ سے التجا ہے کہ اب اس کی بھلائی کے لئے صرف دعا کریں اس کے حق میں۔" سدرہ اور سرتاج کو دیکھتے ہوئے معراج نے اس انداز میں کہا کہ سب جیسے چپ سے ہو گئے، مگر سرتاج خاموش نہ رہ سکا، اس نے ایک بار پھر پورے شد و مد سے رئیس کی تعریفیں کرتے ہوئے ان سب کو صفیہ کے تابناک اور روشن مستقبل کی یقین دہانی

کروانے کی بھی بھرپور کوشش کی تھی، جس پر سب بے ساختہ دل سے آمین کہہ اٹھے تھے، لیکن جیسے ہی اس نے وٹے سٹے کے حوالے سے صفیہ کی تکلیف کے بدلے، سدرہ کو زک پہنچانے کی بات کی تو اماں جیسے تڑپ سی گئیں۔

"بس رہنے دو سرتاج! جو ہونا تھا ہو چکا، اب آئندہ کے لئے دعا کرو تم لوگ اور ویسے بھی یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے، اب چھوٹی بہو کے سامنے اس طرح کی باتیں کر کے اس کا دل دکھانے کا کیا فائدہ، کیوں نیا محاذ کھولنا چاہتے ہو، میں نے اپنی بیٹی کو اللہ کے حوالے کر دیا، اب وہ سوہنا رب جانے اور اس کا کام۔" اماں کی بات نے سب کو خاموش کروا دیا۔

☆☆☆

گاؤں کی کھلی اور شفاف فضا سے ایکدم نکل کر شہر کے دھواں دھار ماحول اور پھر خوب بڑے اور کھلے سے درختوں سے بھرے صحن والے گھر کی جگہ پانچ مرلے کا ڈبل اسٹوری بند بند سا گھر، صفیہ کے لئے اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونا مشکل لگ رہا تھا اور پھر وہ رئیس احمد جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھا نہیں لگا تھا، اکھڑ اور مغرور سا، سو سوالوں کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں دینے والا، مگر یہاں آ کر تو وہ کسی دوسرے رئیس احمد سے واقف ہوئی بے حد حساس، نرم دل اور ہمدرد انسان، جو اپنے گھر والوں کے گزشتہ رویئے کی وجہ سے دلی پشیمانی اور ندامت محسوس کرتا تھا، اس کی طرح وہ بھی ان گزرے پے در پے واقعات کی وجہ سے جیسے سکتے کی حالت میں ہی تھا، مگر جلد ہی وہ سنبھل گیا اور ایک نامحسوس سا تحفظ اور محبت کا حصار اس کے گرد باندھ دیا تھا، اپنی بہنوں اور بھابیوں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا تھا، کہ اسے خود بھی صفیہ کی کم عمری اور مظلومیت کا احساس تھا، اسے تو وہ چہکتی ہوئی مینا تب ہی بڑی اچھی لگی تھی جب وہ گاؤں پہلی بار گیا تھا، اپنی معصومیت اور سادگی کے باوجود اور اب وہ مینا ہی اس کے گھر آ کر سہمی چڑیا بن گئی تھی اور یہ اس کی برداشت سے باہر تھا، لہٰذا اس کے لئے یہ اقدام بے حد ضروری تھے رئیس احمد کے التفات اور محبت کے جواب میں بھلا صفیہ بھی کب تک پتھرائی رہ سکتی تھی، کچھ تو نکاح کے مقدس بولوں کا اثر اور کچھ اس کی توجہ، وہ دونوں جلد ہی شیر و شکر ہو گئے تھے۔

☆☆☆

زبیدہ اور جاوید بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن دیکھ کر پر سکون ہو چکے تھے، ویسے بھی ان لوگوں نے جب سے رئیس احمد کو قریب سے جانا تھا، ان کا ملال جاتا رہا تھا اور پھر صفیہ کے چہرے پر کھلتے ہمہ وقت دھنک کے رنگ، بھلا اب اور کسی ثبوت کی کیا ضرورت رہ جاتی باقی، مگر ہاں ایک خلش ضرور تھی باقی سب تو ٹھیک ٹھاک تھا، مگر رئیس احمد کے معاشی حالات کبھی بھی اتنے اچھے نہیں رہے تھے، جان توڑ محنت مشقت کے باوجود وہ صرف اتنا ہی کما پاتا تھا کہ زندگی سہولت سے گزر رہی تھی اور بس ورنہ زہرہ اور زبیدہ کی طرح پروین اور سدرہ بھی خوب عیش بھری زندگی گزار رہی تھیں، کھلا ڈلا پیسہ، بہترین خوراک اور لباس، مگر صفیہ......!!!

اور پھر بہت سوچنے کے بعد ان سب

نے یہ ملال بھی، یہ خلش بھی بالآخر ختم کر ہی ڈالی، دو سال تک وہ رئیس احمد کے حالات بدلنے کا انتظار کرتے رہے اور پھر جاوید اور کمال کے ساتھ ساتھ سردار، سرتاج نے بھی بمشکل انہیں راضی کیا اور رئیس احمد بھی اپنے والدین کی دعاؤں کے حصار میں گھرا، صفیہ کو مستقبل کی خوشیاں دینے کے لئے جاوید اور زبیدہ کے ساتھ کویت سدھارا، اس کی شبانہ روز محنت اور صفیہ کی اور اس کے والدین کی دعائیں کہ وہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا، جلد ہی ان کے حالات بھی بہترین ہو چلے تھے ابھی چند ماہ قبل ہی تو چھٹی گزار کر واپس گیا، کہ انہیں فوری واپس آنا پڑا تھا، مگر اس بار وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ زبیدہ اور اس کے بچے بھی تھے، بات ہی اتنی خوشی کی تھی کہ وہ لوگ رک ہی نہیں پائے تھے۔

شادی کے پورے چار سال بعد اللہ نے ان کی جھولی سچی خوشیوں سے بھر دی تھی، صفیہ نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تھا، یہ ایسی خبر تھی کہ جس نے ہر چہرہ کھلا دیا تھا، سب بے حد خوش تھے، رئیس احمد اور اس کے گھر والوں کے تو پاؤں مارے خوشی کے زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے، صفیہ واقعی ان کے لئے بڑی خوش بخت ثابت ہوئی تھی، جس کے قدم پڑتے ہی ان کے سارے درد دور ہو گئے تھے، ان سب ہنستے مسکراتے، خوشی سے چمکتے چہروں کو دیکھتے، صفیہ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتی اور پھر رئیس کے ٹوکنے پر اسے دیکھنے لگتی، آس بھری، امید بھری نگاہوں سے اور اس کی نگاہیں جو سوال اس سے کرتی تھیں، وہ بھلا کیسے انجان رہ سکتا تھا ان سوالوں سے، آخری اور مکمل فیصلے کا اختیار تو بہرحال صرف اور صرف اس کے ہی پاس تھا ناں اور وہ بھلا اپنی صفو کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔

آج سے چار سال قبل اگر وہ اپنے سر پر عزت اور لاج کی ردا اوڑھ کر اس کے سنگ چلی تھی، تو اب اس کی باری تھی اپنی محبت کی لاج رکھنے کی، اپنے بھروسے اپنے اعتبار کی لاج رکھنی تھی اسے اور وہ بھی دل کی گہرائیوں کے ساتھ، اپنے دل کی پوری خوشی اور رضا مندی کے ساتھ، مگر وہ دونوں جن کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں سے کچھ کرنا چاہ رہے تھے، وہ تھیں کہ مان کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔

”بھابھی! آپ ہماری بات مان کیوں نہیں جاتیں، آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں،

”ہاں میں جانتی ہوں کہ تم دونوں نے میری خوشی کے لئے میری بہتری کے لئے، تم نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے، تم جانتے ہو رئیس احمد کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت کیا ہے، یہ...... یہ اولاد...... اور خاص طور سے بیٹا یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی دولت سب سے بڑی نعمت، جو بڑے نصیبوں والوں کو ملتی ہے، اس دولت، اس نعمت کے لئے بڑے بڑوں کو ترلے کرتے، منتیں مانتے دیکھا ہے میں نے، اور دور کیوں جائیں، میں خود میں خود مثال ہوں تم سب کے سامنے سب سے بڑی مثال، کتنے سالوں سے جھولیاں پھیلائے یہ نعمت، یہ رحمت مانگ رہی ہوں مگر میں...... میں اتنی خوش نصیب کہاں سے ہوئی کہ یہ دولت یہ نعمت مجھے بھی ملتی، جب میرے مالک کی مرضی ہی نہیں تو کیوں بھلا تم لوگوں کی خوشی چھینوں، نہیں

جیسے ہی صفیہ نے اپنا بیٹا پروین کی گود

میں یہ کہہ کر ڈالا کہ ”یہ آج سے آپ کا ہے“ تو بھابھی بے اختیار رو پڑیں تھیں۔

”بھابھی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، آپ جانتی ہیں صفیہ آپ سے کتنا پیار کرتی ہے، اتنا ہی جتنا وہ اماں سے کرتی ہے، میں نے ہمیشہ اس کے منہ سے آپ کی تعریف اور محبت سے لبریز جملے ہی سنیں ہیں، سچ کہوں تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی بھابھی ایسی بھی ہو سکتی ہے جو اپنے دیوروں اور نندوں کو اپنے بچوں کی طرح پالے، ان کے دکھ پر ماں کی طرح ہی دکھی ہو اور ان کی خوشی پر بے ساختہ خوشی اور دلی مسرت کا اظہار کرے اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ کی صفو آپ سے جتنی محبت کرتی ہے، میں آپ کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں جو یہ خلا ہے اسے کیسے پورا کیا جا سکتا ہے اور بھابھی لالہ، آپ کو ایک راز کی بات اور بتاؤں، یہ جو آپ کی لاڈلی ہے ناں دن رات اللہ سے رو رو کر دعا مانگتی رہی ہے کہ اسے ایک نہیں دو بچے اکٹھے دے تا کہ وہ ایک بچہ آپ کی گود میں ڈال دے، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اگر ہمارا ایک ہی بچہ ہوا تو آپ ہمارا فیصلہ بالکل نہیں مانیں گے، مگر اب آپ کو ہماری بات ماننا ہی ہو گی، بھابھی مان لیں کہ یہ بھی اللہ کی ہی مرضی ہے، آپ کے آنگن کی یہ خوشی اللہ نے آپ کی صفیہ کے ذریعے ہی دینی تھی آپ کو، آپ سمجھ لیں اللہ نے آپ کی امانت ہماری گود میں ڈال دی اور اب ہم اسے فوری طور پر آپ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں، تو پلیز اسے اپنی جھولی میں بھر لیں تا کہ ہم اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو سکیں کہ ہم نے جو دعا مانگی وہ قبول ہوئی، ہم نے جو منت مانی اسے پورا کرنے کا موقع اس سوہنے رب نے عطا کیا ہمیں اور مجھے بھی موقع ملنا چاہیے ناں اپنی محبت کی لاج نبھانے کا، پلیز بھابھی۔“

اتنے مان محبت اور اصرار کے ساتھ جب انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل رہی تھی تو پھر، وہ لوگ کفران نعمت کر کے ناشکری کیوں کرتے بھلا، اور پھر ان کے فیصلے سے باقی گھر والے بھی تو بے حد خوش تھے، اور سب کو یوں خوش اور شاد دیکھ کر صفیہ کے ہونٹوں پر بھی ایک الوہی مسکان ٹھہر گئی تھی، کہ اس کا برسوں پہلے کیا گیا فیصلہ بالکل بھی غلط نہ تھا، اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو اس کا نصیب تھا اسے مل کر رہا اور پھر اسے اپنے پرکھوں کی، اپنے گاؤں کی لاج احسن طریقے سے نبھانے کا بہترین صلہ بھی تو ملا تھا، رئیس احمد کی بے پناہ محبت سب کے دل سے بے ساختہ نکلنے والی دعائیں اور صحت مند توانا اولاد یہ سب اللہ کا انعام ہی تو تھا اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے، اندرونی خوشی سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرائے تھے اور پھر اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے جو یقیناً ان کے لئے انعام ہی تو تھا۔

اب آگے کا راستہ بڑا پرسکون اور خوشگوار نظر آ رہا تھا کہ دعاؤں کے پھولوں سے ان کا دامن بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

تم آخری جزیرہ ہو

ام مریم

اکیسویں قسط کا خلاصہ

پرنیاں سے اپنے رشتے کی نوعیت جان لینے کے بعد معاذ کا رویہ ایکدم اس کے تبدیل ہوتا ہے، جس میں موجود بے باکی اور واضح استحقاق کا رنگ پرنیاں کو خائف اور ششدر کرنے کا باعث ہے مگر معاذ حظ لینے کے ساتھ ساتھ غصے کا بھی شکار ہے۔

پپا کو کال کر کے مسز آفریدی جہان کے نکاح کا بتا کر جہان کو ان کی نظروں میں معتوب ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے ژالے کی باعزت رخصتی پہ مجبور کرتی ہیں پپا اس انکشاف کے بعد پریشان تو ہیں مگر جہان سے بدگمان نہیں۔

معاذ لاہور میں جہان کو ژالے کے ساتھ دیکھتا ہے تو یہ بات اس پر جتلاتا ہے، جہان کو اس پہ ساری حقیقت منکشف کرنی پڑتی ہے، معاذ جہان پہ پرنیاں کے متعلق آگاہی ظاہر کر کے اپنے عزائم سے بھی باخبر کرتا ہے، جہان بہرحال اسے قائل نہیں کر پاتا۔

معاذ ریسٹ ہاؤس میں موجود پرنیاں کے پاس آیا ہے اور پرنیاں اسے دیکھ کر خائف ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

بائیسویں قسط

اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ مسلسل چیخے جاتی تھی، حواس باختگی کا کوئی انت تھا نہ شمار، اسے لگتا تھا اگلے پل وہ زمین پر گرے گی اور گھوڑے کے بے رحم قدموں تلے آ کر کچلی جائے گی، مگر ایسا جب بہت دیر تک نہ ہوا اور امن و سلامتی رہی تب وہ خود کو حیران پاتی ایک دم سے آنکھیں کھول گئی تھی، مگر کلیجہ دھک سے رہ گیا، وہ یکلخت شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی، کاش اس نے آنکھیں نہ کھولی ہوتیں، وہ معاذ حسن کے بازو میں بری طرح سے چپکی ہوئی تھی یقیناً گرنے کے خوف سے منہ اس کے سینے میں گھسیڑا ہوا تھا، وہ حجاب اور خفت سے جل جل اٹھی اور بدک کر فاصلے پر ہونا چاہا تھا مگر فاصلے کا برقرار رہنا یہاں گھوڑے کی پشت پہ سوار ہو کر کسی طور بھی ممکن نہیں تھا، اس کی دونوں ٹانگیں ایک سائیڈ پہ تھیں جیسے بائیک پہ بیٹھی ہو، اس کا وجود معاذ حسن کے مضبوط آہنی بازوؤں کے حلقے میں تھا گھوڑے کا ہر اٹھا ہوا قدم ایک جھٹکا لگاتا تھا اور اسے کچھ اور بھی معاذ سے قریب تر کر جاتا، اس درجہ قربت آکورڈ پوزیشن اس پہ اپنی بے بسی کا شدید ترین احساس وہ بے ساختہ و بے اختیاری رو پڑی تھی، بھلا کب معاذ سے اسے اتنی جرأت اور ہمت کی توقع، وہ سکتے سے نکلی تھی تو رنج اور طیش کے ساتھ مرنے مارنے پہ اتر آئی۔

''یہ...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چھوڑیں مجھے۔'' خفت آمیز طیش میں اس نے معاذ کے سینے پہ دونوں ہاتھوں سے مکوں کی بارش کر ڈالی تھی، مگر اس پہ کیا اثر ہونا تھا، اس نے تو جیسے اعزاز سمجھ کر یہ سوغات قبول کی تھی اور مزے سے ہنستا چلا گیا تھا۔

''یہ بدتمیزی نہیں ہے محترمہ رومانس کا ایک خوبصورت اسٹائل ہے اور چھوڑوں کیوں؟ چھوڑوں گا تو تم گر جاؤ گی نا۔'' پرنیاں کا دماغ بھک سے اڑ گیا، اسے معاذ کے رویئے کی قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی آخر وہ اس درجہ بدتمیزی پہ کیوں آتر آیا تھا، وہ ہٹ دھرم تھا اور سرکش بھی، اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی اسے، اگر وہ اس سے ضد لگائی تو یقیناً وہ اسے زچ کرتا اور تنگ کرتا۔

''یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے سر! کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا، پلیز مجھے نیچے اترنے دیں۔''

گھوڑے کی رفتار ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور پرنیاں کا دل بند ہوا جاتا تھا، اسے اپنی موجودہ پوزیشن پہ اتنی شرم آ رہی تھی کہ اس سے نجات کی خاطر وہ اب اس کی منت سماجت پہ بھی اتر آئی تھی۔

''میں تو اس میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا، کوئی کچھ نہیں سوچے گا، سب کو پتہ ہے آپ سے میرا کیا تعلق قائم ہونے والا ہے، میں شادی کر رہا ہوں نا آپ سے، سوچا ذرا آپ کو خود سے مانوس کر لوں تھوڑا رومانس سکھا دوں۔'' وہ اسے آنکھ مار کر شرارت آمیز ہنسی سے کہہ رہا تھا، پرنیاں کٹ کر رہ گئی تھی، کچھ بس نہ چلا تو منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی۔

''سارے مجھ سے بچاؤ کے لئے اپنائے گئے طریقے ہیں نا، میں آگ لگا دوں گا ان سب طریقوں کو۔'' وہ پھر بھپھرنے لگا، پرنیاں کی جان ہوا ہونے لگی۔

''مجھے نیچے اتار دیں پلیز۔'' وہ پھر گڑگڑائی۔

''پہلے وعدہ کرو۔'' معاذ نے اسے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے آگے بٹھا دیا، اپنے ہی انداز میں اب پرنیاں کی پشت اس کے بال اور اس کی گردن معاذ کے سہارے ٹھہر گئی اور اس کا منہ سامنے آ گیا اب وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی، اس کے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے بے بسی اور لاچاری کا کوئی انت تھا بھلا۔

''کون سا وعدہ؟'' اس نے سارے آنسو اندر اتار کر رقت آمیز گلے سے سوال کیا، وہ اس وقت پوری طرح اس کے رحم و کرم پہ تھی۔

معاذ نے اس کی واضح شکست کو محسوس کیا تھا اور بے اختیار مسکرا دیا، پرنیاں کے بال بہت خوبصورت انداز میں ہوا میں لہرا رہے تھے، ریشمی سیاہ مخملیں بال لٹوں کی صورت اڑتے تھے اور ہوا کو مشکبوہ کر رہے تھے، معاذ ذرا سا آگے جھکا اور اس کے انہی بالوں کو ذرا سا سمیٹ کر اس کے داہنے کندھے پہ آگے کی جانب ڈال دیا پھر اپنا چہرا اس کے اسی کاندھے پہ ٹکا کر خوشبو بھرے انداز میں گنگنایا تھا۔

خوشبو کی طرح میری ہر سانس میں
پیار اپنا بسانے کا وعدہ کرو
رنگ جتنے تمہاری محبت کے ہیں
میرے دل میں سجانے کا وعدہ کرو
ہے تمہاری وفاؤں پہ مجھ کو یقیں
پھر بھی دل چاہتا ہے میرے دل نشیں
یونہی میری تسلی کی خاطر ذرا
مجھ کو اپنا بنانے کا وعدہ کرو
صرف لفظوں سے اقرار ہوتا نہیں
ایک جانب سے ہی پیار ہوتا نہیں
میں تجھے یاد رکھنے کی کھاؤں قسم
تم مجھے نہ بھلانے کا وعدہ کرو

''بولو ہے قبول؟'' اس نے شرارت بھرے انداز میں پرنیاں کو بازو کے حلقے میں لے کر زور سے بھینچا تھا، معاوہ چونک اٹھا، پرنیاں کی آنکھ سے بہتے آنسوؤں کی نمی نے معاذ کے بازو کو نم آلود کر دیا تھا، معاذ نے پہلے گھوڑے کی لگا میں کھینچی تھیں اور پھر اس کے رکنے کا انتظار کیا تھا، اس کے بعد پرنیاں کی سمت متوجہ ہوا جو ہچکیوں سے رو رہی تھی، معاذ نے اسے اتارنا چاہا تو وہ بری طرح سے مچلی تھی، اس کے ہاتھ جھٹک کر خود نیچے کود گئی، ناتجربے کاری کے باعث کودتے ہی اس کا پیر مڑ گیا تھا، وہ بے ساختہ کراہی، معاذ نے گہرا سانس بھر کے پہلے اسے پھر اپنے ہاتھ میں رہ جانے والے اس کے شیفون کے دوپٹے کو دیکھا اور خود بھی نیچے اتر آیا۔

''اگر میں آپ کو نیچے اتار دیتا تو یہ ہرگز کوئی ایسا احسان نہ ہوتا جس کا بار آپ سے اٹھایا نہ جاتا، سرکشی اور نافرمانی کا انجام دیکھ لیں۔''

آنسوؤں سے بھیگا چہرا، نم پلکیں، چہرے پہ تکلیف کے آثار لئے زمین پہ بیٹھی وہ دونوں ہاتھ میں اپنا پیر دبوچے ہوئے تھی، ریشمی بالوں کا سیاہ آبشار سمٹ کر کندھے سے ہوتا گود میں گر رہا تھا، وہ صحیح معنوں میں حواس چھین لینے کی صلاحیت اور حسن سے مالا مال تھی، معاذ کا دل بہکنے سا لگا۔

''آ...... آپ؟'' پرنیاں نے غصے میں سر اٹھا کر اسے گھورا تھا کہ نظر اس کے ہاتھ میں موجود اپنے دوپٹے پہ جا ٹھہری اس کا چہرا جانے کس احساس سے دہک کر انگارہ ہوا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر جھپٹنے کے انداز میں اس سے اپنا دوپٹہ چھینا تھا اور سرعت سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔

''دکھائیں، زیادہ تکلیف ہے پیر میں۔'' معاذ اس کے مدمقابل پنجوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا تھا، پرنیاں شدید تکلیف کے باوجود بدک کر نہ صرف فاصلے پہ ہوئی بلکہ اٹھ کر بھی کھڑی ہو گئی۔

''کچھ نہیں ہوا مجھے اور کچھ ہوا بھی ہو تو آپ کی ہیلپ نہیں چاہیے، سو پلیز آپ جائیں یہاں سے۔'' شدید غصے میں وہ کچھ زیادہ ہی بد لحاظ ہو گئی تھی، معاذ کی صبیح پیشانی پہ ایک شکن نمودار ہوئی تھی، کشادہ آنکھوں میں ناگواری کا عکس لہرایا مگر اس نے خود پہ قابو پا لیا تھا۔

''اندر چلیں۔'' اس نے ایک قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ سمیٹا اور اسے بازو کے حلقے میں لے لیا، پرنیاں ماہی بے آب کی مانند مچھلی تڑپی مگر معاذ کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔

''اس مزاحمت کو یہیں ترک کر دیں پرنیاں یہی بہتر ہے ورنہ میں آپ کو گود میں اٹھا کر بھی لے جا سکتا ہوں اور آپ مجھے روک نہیں سکتی ہیں۔'' اس کا لہجہ سنگینی لئے ہوئے بے لچک تھا، پرنیاں یکلخت سرد پڑ گئی، اس نے سہمی ہوئی نظروں سے معاذ کو دیکھا، وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی سمت متوجہ نہیں تھا، پھر اس کی ہی چلی تھی، وہ اسے سہارا دیئے ایک طرح سے اسے اٹھا کر ہی لایا تھا، اس کا سارا بوجھ تقریباً اس نے خود اٹھایا ہوا تھا، پرنیاں اس قربت میں حواسوں کو سلامت نہیں رکھ سکتی تھی، ڈوبتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے آنکھیں میچ لی تھیں، معاذ نے کمرے میں لا کر اسے صوفے پہ لٹا دیا تھا، پھر کشن اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھے اور خود اس کے پیر کا معائنہ کرنے لگا، پرنیاں چپ چاپ آنسو بہائے گئی تھی، اسے یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ معاذ اس کے ساتھ ایسا کیوں کرنے لگ گیا تھا، ہر خیال منفی تھا ہر سوچ شدید تھی، وہ بس یہی سوچے جاتی تھی معاذ کا ہر لڑکی سے یہی ایٹی ٹیوڈ رہا ہو گا خاص طور پہ انگلینڈ میں، وہاں تو اسے کیا مشکل پیش آئی تھی، اس کی شائننگ گراؤنڈ پرسنالٹی تھی نا جسے وہ کیش کرا کے اپنا وقت رنگین کرتا رہا ہو گا، یہاں گھی اگر سیدھی انگلی سے نہیں نکلا تو اس نے انگلی کو ٹیڑھا کر لیا، زور زبردستی جبر...... تو یقیناً وہ ایک عیاش اور بد فطرت انسان تھا، جس کا مقصد بس اپنا وقت اچھا گزرتا تھا، گناہ اور ثواب کی ایسے لوگوں کے نزدیک کیا اہمیت بھلا...... وہ معاذ کے اس روپ سے گھن محسوس کر رہی تھی، وہ خدا سے بھی شاکی ہوتی جا رہی تھی، جس نے اس جیسی لڑکی کو ایسا بد کردار ساتھی دیا تھا، وہ ہمیشہ معاذ کو شدت پسند کہتی تھی حالانکہ وہ خود بھی کچھ کم شدت پسند نہیں تھی۔

''اتنی نازک ہیں تو پھر اس نزاکت سے سمجھوتہ بھی کر لیں، مردانہ قسم کی اچھل کود سے پرہیز کیا کریں، گوشت پھٹ گیا ہے ٹخنے کے نیچے سے، یعنی اگلے کئی دن کا مکمل بیڈ ریسٹ۔'' وہ اٹھتا ہوا کسی قدر جھلا کر کہہ رہا تھا پرنیاں نے سن کر بھی ان سنی کر دی تو معاذ نے بغور اسے دیکھا تھا پھر اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھتا نزدیک آ گیا، اس کے بھیگے گال کو انگشت شہادت سے چھوا اور اسے ہونٹ بھینچ کر دیکھنے لگا۔

''ان آنسوؤں کی وضاحت کریں گی پرنیاں!'' اس کا لہجہ سرد تھا، پرنیاں نے منہ پھیر لیا، معاذ کے اندر اس کے انداز نے آگ دیکھا دی۔

''مجھے اپنا نظر انداز ہونا ہرگز پسند نہیں ہے پرنیاں، سو بی کیئرفل نیکسٹ ٹائم!'' اس کا تنبیہی انداز پرنیاں کو بے حد ناگوار محسوس ہوا تھا، اس سے پہلے کہ کچھ کہتی دروازے پہ دستک دے کر کشمالہ اندر آئی تھی۔

''کھانا لگا دوں جی؟'' معاذ نے ایک نظر کلائی پہ بندھی رسٹ واچ پہ ڈالی پھر کشمالہ کو اثبات میں جواب دیا تھا، اس کے جانے کے بعد پرنیاں کی سمت متوجہ ہوا۔

''کھانا کھا کر چلنے کی تیاری کیجئے گا، وہاں جا کے ہی آپ کے پاؤں کا کچھ علاج ہو سکے گا۔'' پرنیاں نے اب بھی جواب نہیں دیا، معاذ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا، پرنیاں آنکھوں پہ بازو رکھے پھر سے رونے لگی، اس کا دل بھرایا جا رہا تھا، معاذ کا رویہ اس کی دل شکنی اور دل آزاری کا مسلسل باعث تھا آخر کس حد تک اعلیٰ ظرفی دکھائی وہ معاذ اس کی ہر کوشش کو اپنی ہٹ دھرمی اور زعم کی ٹھوکر رسید کر کے اسے ریزہ ریزہ بکھیر دیا کرتا تھا۔

''کھانا یہاں کیوں لگا رہی ہو کشمالہ، کچن میں لگا دو ٹیبل پہ۔'' برتنوں کی کھنک پہ پرنیاں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر گلوگیر آواز میں کہا تھا۔

''صاحب نے ادھر لگانے کا کہا ہے بی بی جی۔'' کشمالہ کے جواب پہ پرنیاں ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔

''اٹھو کھانا کھاؤ۔'' معاذ تولیے سے ہاتھ خشک کرتا اندر آ کر بولا تھا، کشمالہ صوفے اور ٹیبل کے نزدیک ایک کرسی یقیناً معاذ کے لئے ہی رکھ کر گئی تھی، معاذ اسی چیئر پہ بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' پرنیاں نے نخوت سے جواب دیا تھا۔

''کیوں بھوک نہیں ہے؟ آپ نے دوپہر بھی کھانا نہیں کھایا تھا میں جانتا ہوں۔'' معاذ نے اب کے قدرے نرمی سے کہا تھا مگر پرنیاں پہ اثر نہیں ہو سکا، اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر معاذ نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے اٹھا کر بٹھا دیا تھا، پرنیاں ایک پل کو حق دق رہ گئی تھی، پھر ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

''آپ میری جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کہا نا نہیں ہے بھوک۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''نہیں چھوڑ سکتا جان من، مجبوری ہے، چلو بتاؤ میں کھلاؤں اپنے ہاتھ سے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں گھستا ہوا مسکراہٹ دبا کر بولا، پرنیاں نے بے اختیار اس کی بولتی شوخ آنکھوں سے نظریں چرائیں اور روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ معاذ؟''

''معاذ!'' وہ اچھل پڑا تھا اور بے اختیار ہنسا۔

جاؤں سو جان سے اس طرز تکلم پہ نثار
پھر سے فرمایئے کیا آپ نے ارشاد کیا

پرنیاں کے چہرے پہ جیسے آگ سی دہک اٹھی، اس نے بے داری سے ہونٹ کچلے تھے۔

''آپ یہاں سے چلے جائیں ورنہ......''

”ورنہ کیا؟ کیا کریں گی مادام آپ؟“

جان و دل ہوش و حواس صبر و قرار تو لے چکے
اور بھی آپ کو کچھ درکار ہے کہ بس

وہ مسکراہٹ دبا کر بولا تھا، پرنیاں نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں، اس شخص کو لوٹ لینے کے کتنے انداز برتے تھے، برجستگی، شگفتگی بے ساختہ گفتگو حسب حال شاعری، کتنی لڑکیوں کو بے وقوف بنا چکا ہوگا، میرا تو اسے نمبر بھی یاد نہیں ہوگا، اس کا دل رونے سا لگا۔

”کیا سوچ رہی ہی، کھانا کھا لیں پھر ہمیں جانا بھی ہے۔“

”آپ جائیے گا، مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ پرنیاں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا، معاذ نے سر کو نفی میں زور و شور سے جنبش دی تھی۔

”ایسا ممکن نہیں ہے مادام! آپ کو میرے ساتھ ہی جانا پڑے گا، چاہے خوشی سے چاہے زبردستی۔“ وہ بے نیازی سے نخوت کا مخصوص انداز خود بخود اس کے لہجے میں شامل ہو گیا تھا جو پرنیاں کو روہانسا کر گیا تھا۔

”زبردستی کے قائل کیوں ہیں آپ؟ زبردستی سے محبت نہیں ہو جایا کرتی۔“ وہ چیخ کر بولی تھی، منہ کی سمت لقمہ لے جاتے معاذ کا ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہو گیا تھا، اس نے تھم کر بہت دھیان سے پرنیاں کو دیکھا پھر زعم سے گویا ہوا تھا۔

میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم ناواقف ہو
جس پہ مجھ کو پیار آ جائے اس کو پاگل کر دیتا ہوں
چھوڑ کے مجھ کو جانے والا لوٹ کے واپس آ کے گا
دائیں بائیں آگ لگا کر آگے جنگل کر دیتا ہوں

”آزمائش شرط ہے۔“ اسی طرح اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ متکبرانہ انداز میں بولا تھا، پرنیاں دانت بھینچ کر رہ گئی۔

”آں آں ہوں، مت اٹھیں، مجھے بتائیں کیا چاہیے، ابھی حاضر کر دیتا ہوں۔“ اسے اٹھتے دیکھ کر معاذ نے بے اختیار ٹوکا تھا، پرنیاں گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

”میں نے پپا سے بات کر لی ہے، اب انہیں آپ سے میری شادی پہ کوئی اعتراض نہیں، اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔“ وہ موضوع گفتگو بدل چکا تھا، پرنیاں خاموش رہی، معاذ کے کچھ دیر اسے دیکھا تھا، پھر دوبارہ بولا۔

”وہ آپ کی رقیب ہے نا نیہاں، مجھ سے اظہار محبت کر رہی تھیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا، پرنیاں ایکدم چونکی تھی، اس کا چہرا متغیر ہو کر رہ گیا، معاذ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا تھا پھر گلا کھنکارا۔

”اپنا پروپوزل خود پیش کر رہی تھیں۔“

”تو کر لیتی تھی شادی، مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“ وہ پھٹ پڑی، معاذ بے اختیار ہنس دیا۔

”آپ کو جیلسی نہیں ہوئی؟“

”میرا آپ سے کیا تعلق؟“ وہ بری طرح سلگی، معاذ نے اب کی مرتبہ اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”کیا کہا آپ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں؟ آپ کو یقین ہے اس بات کا؟“ اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ گمبھیرتا سمیٹ لایا تھا، پرنیاں نے جز بز ہو کر اسے دیکھا۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ آپ کا واقعی مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“ معاذ اب کچھ اور سنجیدہ ہو چکا تھا، پرنیاں کی سانسیں الجھنے لگیں، وہ جھنجھلا کر پھر اٹھی تھی، معاذ نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“

”آپ کے پاس میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتی۔“ اس نے ترخ کر جواب دیا تھا معاذ ہنستا چلا گیا، پھر اسی ہنسی کے دوران بامشکل بولا تھا۔

”بے وقوف ثابت ہو گئی ہیں آپ۔“

”کیا مطلب؟“ پرنیاں کو آگ سی لگ گئی تھی اس ٹائٹل پہ۔

”مطلب یہ کہ......“

تجھ کو الجھا کے کچھ سوالوں میں
میں نے جی بھر کے تجھ کو دیکھا ہے

اس کے فریش کھنکتے لہجے پر پرنیاں پہ جیسے گڑوں کے حساب سے پانی پڑ گیا تھا، اس کی شوخ نظروں کے آگے وہ اسے ڈھنگ سے گھور بھی نہیں سکی تھی۔

☆☆☆

معاذ بہت عجلت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا، گولائی کا موڑ مڑتے ہی پرنیاں ایکدم اس کے سامنے آ گئی، جہاں پرنیاں خائف ہوئی تھی معاذ کے گویا دل کی کلی کھل اٹھی۔

”کدھر بھاگتی پھر رہی ہیں، تین دن کا ریسٹ بتایا تھا آپ کو، کالج سے چھٹی کر لی اور گھر میں کلانچیں بھری جا رہی ہیں۔“ دلی کیفیت کے برعکس اس کا لہجہ و انداز کڑا تھا، پرنیاں کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا، لمبی پلکیں خفت سے جھک گئیں۔

”ابھی اٹھی ہوں بستر سے، وہ بھی بھابھی کے کہنے پہ۔“ وہ منمنائی تھی۔

”بھابھی آپ کی ڈاکٹر ہیں جو ان کی اجازت ملی اور آپ نے......“

”اب اتنا بھی درد نہیں ہے مجھے۔“ پرنیاں اس کی ڈانٹ کا دورانیہ بڑھتا دیکھ کر درشتی سے بولی تھی۔

”اچھا آپ کو بہت پتہ ہے، سوری آپ تو خود ڈاکٹر ہیں میں یہ بات تو بھول ہی گیا، ساری قابلیت ہے آپ کے پاس ڈگریوں کے ثبوت سمیت۔“ وہ طنز سے بولا، پرنیاں شرمندگی سے سرخ پڑنے لگی، کچھ کہے بغیر وہ یونہی سرخ چہرے کے ساتھ پلٹی اور آہستگی سے چلتی راہداری عبور کر گئی، معاذ سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آ گیا، اس پل جنید بھائی کاٹن کے کھڑکھڑاتے سوٹ میں اپنے کمرے سے نکلے تھے۔

''چلیں بھائی تیار ہیں سب؟'' ان کی مخاطب زینب اور ماریہ تھیں جو تیار بیٹھی تھیں چادریں اوڑھے۔

''کہاں کی تیاری ہے جناب؟'' معاذ کی مداخلت پہ ماریہ جوش سے بولی تھی۔

''سی سائیڈ لے کر جا رہے ہیں ہمیں جنید بھائی۔''

''ہمیں سے مراد کون کون؟'' معاذ نے بھنویں اچکائیں۔

''سب ہی پرنیاں، نوریہ، صوریہ میں ماریہ بھابھی، زیاد، حسان اور آپ چاہیں تو آپ بھی۔''

''پرنیاں کا پیر ٹھیک نہیں ہے پتہ ہے آپ لوگوں کو؟'' معاذ تیوری چڑھا کر بولا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب ہمیں بھی احساس ہے مگر وہ تفریح پہ جانا چاہتی تھی، اب پیر اتنا بھی درد نہیں کرتا، آئی نہیں ابھی تک۔'' جنید بھائی نے اسے گھورا تھا، معاذ کھنکارا۔

''میں نے ڈانٹا ہے اسے، اب یقیناً اس ظلم کے مظاہرے پہ احتجاج بلند ہو رہا ہوگا۔'' معاذ نے ہونٹوں کا کونہ دانتوں تلے داب کر اصل واقعہ بیان کیا، جنید بھائی نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

''تمہیں کوئی کام نہیں ہے اسے ڈانٹنے کے سوا؟ اچھے استاد بنے ہو تم، جاؤ اب منا کے لے کر آؤ۔'' جنید بھائی نے اسے ہی لتاڑنا شروع کر دیا تھا، معاذ نے سر کھجایا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پہ لیکن اگر ذرا دیر ہو جائے تو گھبرایئے گا نہیں، اس طرح کے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔'' جنید بھائی کو آنکھ مار کر شرارت سے کہتا وہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا، وہ سب کھسیا کر ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے، معاذ اوپر آیا تو کچھ لمحے بند دروازے کے باہر رک کر سانس بحال کی تھی پھر دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا، پرنیاں بیڈ پہ اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی، نازک وجود ہچکیوں سے لرزتا تھا اور ریشمی بالوں کا مخملیں آبشار بستر پہ دور تک بکھرا ہوا تھا، ذرا سا غور کرنے پہ معاذ جان گیا تھا کہ وہ جانے کی تیاری مکمل کر چکی تھی، معاذ نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا، پرنیاں کا لرزتا وجود یکلخت ساکن ہو گیا، اگلے لمحے وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی تھی، بیڈ پہ بکھرا ریشمی بالوں کا آبشار سمٹتا سرکتا، اس کی پشت پہ جا گرا جبکہ وہ اسے روبرو پا کر گھبرا کر سرو قد کھڑی ہو گئی تھی۔

''آ...... آپ؟'' اس کی سحر انگیز آنکھوں میں یہاں وہاں ہراس بکھر گیا۔

''کیوں میں یہاں نہیں آ سکتا۔'' معاذ نے بھنویں اچکائیں تھیں۔

''کیوں آئے ہیں یہاں؟'' وہ سخت کوفت زدہ ہو کر بولی۔

''سوری کرنے، پرنیاں آپ کو مجھے ایسے نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا، جایئے نیچے آپ کا سب لوگ ویٹ کر رہے ہیں۔'' پرنیاں ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی، کیا تھا وہ کبھی شعلہ کبھی شبنم، کتنے رنگ تھے اس کے ہر رنگ پہلے سے زیادہ جان لیوا اور سحر طاری کرتا ہوا، وہ گم صم ہو گئی تھی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ ایسے مت دیکھو یار، گنہگار بندہ ہوں، بہک گیا اور کوئی گستاخی کر دی تو پھر شکوہ کرو گی۔'' اس کا لہجہ دھیما اور سحر انگیز تھا، لبوں کی تراش میں دل آویز مسکان رقصاں تھی، جذبوں سے پر لو دیتی آنکھیں کتنے استحقاق سے اسے دیکھ رہی تھیں، پرنیاں کا شرم اور خفت سے برا حال ہو گیا، اس نے گڑبڑا کر تیزی سے رخ بدل لیا۔

''اوکے میں آ جاتی ہوں، آپ جائیں۔'' اس نے جیسے جان چھڑانا چاہی تھی۔

''اب یہاں رک کر کیا کریں گی؟ تیاری تو مکمل ہے آپ کی، میرے ساتھ ہی چلیں۔'' اس نے اپنے مخصوص فیصلہ کن اور اٹل انداز میں کہا تھا، پرنیاں دل ہی دل میں تلملائی ضرور مگر بحث نہیں کی، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رک کر اس نے بالوں میں ازسرے نو برش پھیرا دراز کھول کر کوئی کیچر ڈھونڈنے لگی، سلور کلر کا کیچر جس پہ چمکتا ہوا پتھر اس کی خوبصورتی کو مزید بڑھا رہا تھا نکال کر اس نے بالوں کو سمیٹ کر لگانا چاہا تھا کہ تب سے اس کی کاروائی خاموشی سے دیکھتا معاذ بے اختیار آگے بڑھ آیا۔

''اونہہ، پرنیاں میرے خیال میں آپ کے بال کھلے ہوئے زیادہ اچھے لگتے ہیں، ایسے ہی رہنے دیں انہیں۔'' اس نے صرف کہا نہیں تھا، اس کے قریب آیا پھر ہاتھ بڑھا کر کیچر نکال دیا تھا، بے تحاشا گھنے سیدھے بال ڈھلک کر پرنیاں کی نازک پشت پہ سیدھے گرنے لگے، پرنیاں اس کی اس حرکت پہ ساکن رہ گئی تھی، اس کے وجود کی آنچ دیتی قربت اور ملبوس سے اٹھتی مہک نے اس کے حواس سلب کر لئے تھے، وہ جیسے پتھرا سی گئی تھی، معاذ نے کسی قدر شوخ نظروں سے اسے دیکھا پھر اطمینان بھرے انداز میں مسکرایا۔

''نائس، ناؤ یو لکس ویری پریٹی۔'' پرنیاں کو اس کی آواز ہی حواسوں میں لے کر آئی تھی، اس کے لئے یہ لمحے قیامت خیز تھے، وہ جتنا اس کی قربتوں سے بھاگتی تھی وہ اس قدر اس کے قریب آتا تھا، شاید اس کی بے بسی کو جان گیا تھا اور دانستہ زچ کرتا تھا اور ہر بار پہلے سے بڑھ کر بے باکی کا مظاہرہ کیا کرتا۔

''واٹ ہیپنڈ؟'' معاذ نے جھکے سے سوال کیا تھا، وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''آئی تھنک آج آپ نے پہلی بار مجھے دھیان سے دیکھا ہے اور میری وجاہت کی تاب نہیں لا پائیں، بس جی اللہ کا کرم ہے کبھی غرور نہیں کیا میں نے۔'' مسکراہٹ دبائے وہ بظاہر انکساری سے کہہ رہا تھا، پرنیاں کے اندر ایک ساتھ بہت سارے احساس اڈے، غصہ وحشت، اکتاہٹ اس نے ہونٹ بھینچ کر معاذ کو پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا، پھر بھنیچے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''آپ چلے جائیں یہاں سے۔'' معاذ نے جواباً اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''مجھے آپ کا یہ لہجہ و انداز بالکل پسند نہیں، کتنی مرتبہ بتاؤں؟'' پرنیاں نے ان سنی کی تھی اور پیروں میں الجھتا دوپٹہ سنبھالتی کترا کر کمرے سے نکل آئی، وہ سب اس کے منتظر تھے اس کے پہنچتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

تو پیا سے مل کے آئی ہے
بس آج نیند پرائی ہے

زینب نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی، پرنیاں نے گھبرا کے اسے دیکھا، پھر آنکھیں بھگو لی تھیں۔

''لالہ بہت پاور فل ہیں جناب، کچھ بھی کر سکتے ہیں، آپ کے چہرے پہ سنہرے قوس و قزح سجانے سے لے کر ہر مشکل بات منوانے تک۔'' وہ ہنس رہی تھی، پرنیاں کی سنجیدگی میں فرق نہیں

آیا تھا، وہ جا کر ماریہ اور حوریہ کے ساتھ بیٹھ گئی، دوسری جانب زینب تھی، فرنٹ سیٹ پہ جنید بھائی اور زیاد موجود تھا، شاید معاذ ساتھ نہیں جا رہا تھا، اس نے سکون کا سانس لیا، وہ معاذ کی ہمہ وقت شوخی سے عاجز آ گئی تھی، اس کا یہ شوخ و شنگ انداز اپنے اسی شک کی بنا پہ اسے ہرگز نہیں اچھا لگ رہی تھا، دوران سفر ان سب کی شوخیوں کے باوجود وہ سوچوں میں گم اور گلستی رہی تھی۔

ساحل پہ آنے کی خواہش بھابھی کی تھی، چند دنوں تک ان کی ڈلیوری متوقع تھی اور جنید بھائی ان کی ہر خواہش پہ لبیک کہہ رہے تھے، یہاں جس جگہ وہ آئے تھے رش نہ ہونے کے برابر تھا، اس کے باوجود جنید بھائی اور زیاد انہیں قدرے فاصلے پہ بالکل الگ تھلگ گوشے میں لے آئے تھے، کھانے پینے کا سامان اور چٹائی وغیرہ زیاد نے اٹھا رکھی تھی احسان اور ماریہ حوریہ وغیرہ تو اس وقت پانی میں اتر گئے تھے، ڈھلتی ہوئی شام کا عکس ساحل کی ریت کے سرمئی پن کو اور گہرا کر رہا تھا، ڈوبتے سورج کا رنگ پانی میں گھل کر سطح پہ سونا بکھیر رہا تھا، ٹھنڈی ہوا نے مزاج پہ اچھا اثر ڈالا تھا، وہ ریت پہ آہستگی سے چلتی آگے بڑھنے لگی، وائیٹ سوتی بے حد خوبصورت ایمبر ائیڈ سوٹ کا بڑا سا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی وہ جھک کر پیروں کو جوتوں سے آزاد کرنے لگی، گیلی ریت پر چہل قدمی کا اپنا لطف تھا وہ اسی سے محفوظ ہونا چاہتی تھی، کچھ دیر سب پانی میں بھیگتے رہے اس کے بعد بھابھی نے انہیں آواز دے کر بلایا تھا، سورج مکمل طور پہ ڈوب چکا تھا، رخصت ہونے کی تیاری کرتے سورج کی روشنی بالکل مدھم پڑ گئی تھی، سامنے سمندر کی وسعت میں آسمان کا کنارہ مدغم ہوتا لگ رہا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب معاذ اور جہان نے اپنی بائیک وہاں لا کر روکی تھی، پرنیاں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، اسے اپنی یہ تفریح بھی غارت ہوتی ہوئی لگی تھی، اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزرا تھا، ناگواری کا رنگ جسے معاذ نے بہت شدت سے نوٹ کیا۔

”بائیک پہ کیوں آئے آپ لوگ، نوریہ کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟“ زیاد نے اسی وقت ان سے جرح شروع کر دی تھی۔

”اللہ کے بندے سانس تو لینے دو، چائے تو پینے دو۔“ معاذ نے چہرے پہ بیچارگی طاری کر لی۔

”میری تو پکنک غارت کر دی نا، میں جا رہا ہوں واپس۔“ غصے میں پیر پٹختا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا معاذ نے آنکھیں پھاڑیں تھیں۔

”ہائیں ابھی سے یہ حال ہے بعد میں کیا کرو گے لڑکے، وہ خود نہیں آئی، کہہ رہی تھی طبیعت خراب ہے، اس کی وجہ سے ہم بھی نہ آتے مگر یہاں بھی کچھ لوگوں کی تفریح غارت ہو سکتی تھی۔“ معاذ نے مسکراہٹ دبا کر پرنیاں کو دیکھا جس کے چہرے پہ لاتعلقی اور نخوت تھا، معاذ نے یونہی ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ صرف زیاد کا نہیں باقی سب کا بھی موڈ بحال کر دیا تھا، جب وہ چائے کے دونگ پی کر سارے اسنیکس بھی چٹ کر چکا تب سب نے مل کر اس سے گانے کی فرمائش کر دی تھی۔

”انکار نہیں ہونا چاہیے لالے، فل رومینٹک ماحول ہو، بقول شاعر۔“

رات بھی خوب ہے پاس محبوب ہے

زیاد نے شوخی سے آنکھیں گھمائی تھیں، جہاں پرنیاں کی رنگت دہک گئی معاذ لطف لے کر ہنسنے لگا، پھر براہ راست پرنیاں کو دیکھ کر بولا تھا۔

”مجھے تو اعتراض نہیں، ان سے پوچھ لو۔“

”کیا پوچھ لیں؟“ زیاد نے آنکھیں نکالیں۔

”انہیں اعتراض نہ ہو میرے گانے پہ، یار اب ناراضگی تو نہیں چاہتے نا ہم۔“ وہ بن کر بولا اور ان سب نے اسے ہوٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔

”اتنے ہی شریف ہیں نا جیسے آپ، ان سے پوچھ کر تو ہر کام کرتے ہیں، میں جورو کا غلام بن کے رہوں گا، آپ پہ ہی تو بنا ہے۔“ ہر سمت سے ہونے والی سنگ باری معاذ نے گھبرا کر جلدی سے حامی بھر لی تھی۔

”او کے سناتا ہوں چپ کرو پلیز۔“ وہ سب اپنی کامیابی پہ دانت نکالنے لگے، معاذ نے گلا کھنکار کر پرنیاں کو دیکھا۔

”گانا، گانا، گانا......“ زیاد اور حسان کے ساتھ جنید بھائی بھی مل گئے۔

”یار میرا شاعری کا موڈ ہے، وہ نہ سنا دوں؟“

”پہلے گانا پھر شاعری۔“ زینب نے فیصلہ کر دیا اور معاذ نے کاندھے اچکائے تھے۔

تمہارے سوا کچھ نہ چاہت کریں گے
کہ جب تک جئیں گے محبت کریں گے
نظر چاہتی ہے دیدار کرنا
یہ دل چاہتا ہے تمہیں پیار کرنا
وفا میں تمہاری ڈوبے رہیں
ہم ہے کیا حال دل کا یہ کیسے کہیں ہم
مہکنے لگے لگا بدن یہ تمہارا
ہم آنکھوں سے ایسی شرارت کریں گے
تمہارے سوا کچھ نہ چاہت کریں گے
کہ جب تک جئیں گے محبت کریں گے

پرنیاں کا سرد مہرا اجنبی تاثر زائل ہوا اس کی جگہ حجاب اور گھبراہٹ نے لے لی تھی، اس کا چہرا ہی نہیں پورا بدن جل اٹھا تھا، پتہ نہیں وہ اتنا بے باک کیوں تھا، ہر قسم کے اظہار میں چاہے وہ زبانی ہو یا عملی، اس سے اتنے لوگوں کے بیچ ان بے باک جذبوں کا اظہار خفت سے سرخ کر گیا تھا۔

اس نے لرزتی پلکیں لمحہ بھر کو اٹھائیں، وہ بڑی والہانہ پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، ان نگاہوں میں کچھ ایسی جنوں خیزی اور ایسی لپک تھی کہ پرنیاں کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی، اس نے کہیں پڑھا تھا ہر مرد کے اندر ایک فاتح ہوتا ہے، وہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو زیر کرنا چاہتا ہے ورنہ اس کی انا بد مزا ہوتی ہے، اسے اپنا آپ بھی معاذ کے لئے ایک رکاوٹ محسوس ہوا تھا جسے وہ کسی بھی قیمت پہ زیر کر لینا چاہتا تھا، وہ سمجھ ہی نہ سکی، جان ہی نہ سکی کہ

اس کی دلربائی قیامت خیز تھی اور معاذ اسی دلربائی کا اسیر ہو گیا تھا، سب نے معاذ کو بے پناہ داد سے نوازا تھا، شاید کوئی بھی اس کی طرح حساس ہو کر یا پھر شدت پسندی سے نہیں سوچتا تھا، اب اس سے نظم سننے کی فرمائش ہو رہی تھی، پرنیاں نے ہونٹ بھینچے اور سر جھکا لیا، چاندنی کا غبار اب ہر سو پھیل رہا تھا، یہ ماحول بھی گویا سحر انگیز طلسماتی دنیا کا ہی ایک عکس لگ رہا تھا، چاندنی کی چمکتی کرنیں سمندر کی پرشور لہروں پر بے دریغ اپنا حسن لٹا رہی تھیں، معاذ کی ساری توجہ اسی پہ تھی، سفید سوٹ میں ملبوس وہ چاندنی کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتی تھی، پرلز کے ائیر رنگ اس کے شفاف تر و تازہ گلاب چہرے پہ اپنی رعنائی کا عکس بکھیر کر اس کو کچھ اور حسین بنا کر دکھا رہے تھے، بہتی چاندنی اور لہروں کے شور نے ایک طلسم بکھیر دیا تھا اور اس ماحول میں وہ گم صم خود سے بے نیاز لڑکی ایسی ساحرہ لگ رہی تھی جو اپنے حسن کی سحر انگیزی سے دیکھنے والوں کو پتھر بنا دیتی ہے، وہ بھی اس کے سحر میں گم ہو رہا تھا، ایسے میں اس کا گمبھیر تر لہجہ بے اختیار دل کو چھونے لگا۔

میں ایک فرد ہوں عام سا اک قصہ نا تمام سا
نہ لہجہ بے مثال ہے نہ بات میں کمال ہے

''اف اتنی انکساری، وہ بھی سب کچھ ہوتے ہوئے۔'' زیاد نے گال پیٹے تھے مگر وہ مگن رہا۔

ہوں دیکھنے میں عام سا اداسیوں کی شام سا
جیسے اک راز ہوں خود سے بے نیاز ہوں
نہ صہبہ جبینوں سے ربط ہے نہ شہرتوں کا خبط ہے

زیاد کو اچھو لگ گیا، وہ خاصی دیر تک کھانستا رہا، معاذ نے جھینپ کر اسے ایک دھپ لگا دی، پرنیاں کے چہرے پہ زہر خند پھیلا۔

رانجھا نہ قیس ہوں انشاء نہ فیض ہوں
میں پیکر اخلاص ہوں وفا دعا اور آس ہوں
میں شخص خود شناس ہوں تم ہی کرو اب فیصلہ
میں فرد ہوں عام سا یا پھر بہت ہی خاص سا

''اف......تو یہ قصہ تھا، میں پہلے ہی حیران تھا آپ اور یہ عاجزی کا عالم میں تو مرنے والا تھا، شکر ہے آپ نے سچ تو بولا۔'' وہ جیسے ہی خاموش ہوا زیاد بلبلانے لگا تھا، باقی سب مسکرا رہے تھے، معاذ نے پرنیاں کو دیکھا گلابوں کی سی تازگی لئے نوخیز چہرا، ملکوتی سبک نقوش، بھرے بھرے گداز ہونٹ، سیاہ گھور آنکھیں جن میں چاند ستاروں کی جگمگاہٹ بھری ہوئی تھی جیسے چاند کی روشنی میں وہ خود بھی دمک رہی تھی، مگر اس کا انداز بالکل سرد اور اجنبی تھا، جیسے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو، واپسی پہ جب وہ پھر سب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے لگی، معاذ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''بے تم گاڑی میں چلے جاؤ، پرنیاں کو مجھے کچھ کہنا ہے۔'' معاذ اس کے احتجاج اور مزاحمت کو خاطر میں لائے بغیر سنجیدگی سے بولا تھا، وہ سب ہنستے مسکراتے اسے وش کرتے وہاں سے چلے گئے، پرنیاں اپنے لاتعداد خدشوں اور سراسمگیوں کے ساتھ ہولتی وہاں اس کے ساتھ تنہا کھڑی رہ گئی۔

''اگر آپ نے مجھ سے کسی قسم کی کوئی بدتمیزی کی تو میں سمندر میں کود کر جان دے دوں گی، یاد رکھیئے گا۔'' اسے اپنی سمت دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکراتے پا کر وہ اتنا بھڑکی تھی کہ ہیجانی کیفیت کے زیر اثر چلا پڑی، معاذ کے چہرے کی مسکان لمحے کے ہزارویں حصے میں غائب ہو گئی تھی۔

''میں جانتا ہوں آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے، شاید آپ مجھے اپنے قابل بھی نہیں سمجھتیں اور......''

''مجھے یہاں کیوں روکا ہے، اس طرح، بتائیں مجھے، آپ کو میری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔'' وہ رو ہی پڑی تھی، معاذ نے ہونٹ بھینچ لئے۔

''آپ کو مجھ سے اپنی عزت کی پامالی کا خوف ہے؟'' وہ ششدر ہو کر اور کچھ سلگ کر بولا، پرنیاں نے ہونٹ بھینچ لئے۔

''گھر چلیں۔'' اس نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔

''چلیں۔'' معاذ نے ہرگز تردد نہیں کیا، جینز کی جیب ٹٹول کر بائیک کی چابی نکالی پھر بائیک کو سیدھا کیا تھا اور خود اس پہ سوار ہو گیا، کک لگاتے ہوئے جیسے کچھ یاد آنے پہ بولا تھا۔

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے
وہ ساون کے کچھ بھیگے بھیگے دن رکھے ہیں
اور میرے اک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھوا دو
میرا وہ سامان لوٹا دو
پت جھڑ ہے
کچھ ہے نا......؟
پت جھڑ میں کچھ پتوں کے گرنے کی آہٹ
کانوں میں اک بار پہن کے لوٹائی تھی جو تم نے
پت جھڑ کی شاخ ابھی تک کانپ رہی ہے
وہ شاخ گرا دو
میرا وہ سامان لوٹا دو
ایک اکیلی چھتری میں
جب آدھے آدھے بھیگ رہے تھے
آدھے سوکھے آدھے گیلے
سوکھا تو میں لے آیا تھا
گیلا من شاید تمہارے بستر کے پاس ہو
وہ بجھوا دو
میرا وہ سامان لوٹا دو

ایک سوسولہ تاک کی راتیں
ایک تمہارے کاندھے لگ کر کاٹوں
گیلی مہندی کی خوشبو
جھوٹ موٹ کے شکوے کچھ
جھوٹ موٹ کے وعدے بھی
یاد دلا دوں سب بجھوا دو
میرا وہ سامان لوٹا دو

وہ خاموش ہوا تب پرنیاں چونکی تھی اور جیسے اس ٹرانس سے باہر آئی اور قدرے خفیف سی ہو گئی، معاذ ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے پاس اپنے جذبوں کی سچائی ثابت کرنے کو کوئی ثبوت نہیں ہے پرنیاں۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا اور کسی حد تک تھکا ہوا بھی، پرنیاں کچھ نہیں بولی اور اسی خاموشی کے ساتھ اس کے ساتھ بائیک پہ سوار ہو گئی، معاذ جو اس کی جانب سے کسی خوبصورت اظہار کا خواہش مند تھا سرد آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

بدلتے موسم نے وادی کو سرسبز و شاداب نوخیز کلیوں اور مہکتے پھولوں سے دلفریب حسن عطا کیا تھا، موسم دلکش و دل آویز تھا، سرمئی پہاڑوں کے دامن میں ایک قدرتی جھیل تھی، جس کے اطراف میں پھیلے سبزے میں بکثرت کھلے سرخ گلاب نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے، جھیل کے نیلگوں پانی کی سطح آئینے کی طرح شفاف اور ستھری تھی اور اس میں سبزے و سرخ گلابوں کا عکس یوں نظر آتا تھا جیسے سامنے آئینہ رکھ دیا گیا ہو، تیمور خان نے جیپ وہیں روک دی، اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی مچل کر اوپن جیپ سے نیچے کودی تھی اور کیمرا تیمور کی سمت اچھال کر خود اپنی تصویریں بنوانے لگی، یہ اسی نائقہ کی فراہم کردہ رنگ برنگی تتلیوں میں سے ایک تھی جو دن رات تیمور خان کا دل بہلا رہی تھیں، جاگیروں اور سرداری کے سارے کام باپ پہ ڈالے وہ اپنا وقت اپنے انداز میں گزارنا پسند کرتا تھا، زینب کی غیر موجودگی کے باعث یہ عیاشی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"کہاں گم ہو رہے ہیں سائیں! یہاں بھی میری ایک تصویر کھینچیں۔" لڑکی اداؤں سے لبریز تھی اس پہ اس کا حشر برپا کرتا حسن، تیمور تو فدا ہوا جاتا تھا، وہ سبزے کے درمیان آتشی سفید اور سرخ پھولوں کے تختوں کے بیچ کھڑی اس شگفتہ لڑکی کی اداؤں سے گھائل ہو رہا تھا، کیمرا دور اچھال کر وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے نزدیک آیا اور اسے بازوؤں میں بھر لیا، اس نے دانستہ خود کو گرایا تھا اور اگلے لمحے دونوں سبزے سے بھری ڈھلوان سے نیچے لڑھکنے لگے، لڑکی کی شوخ مصنوعی سریلی چیخوں سے ہر سو اک شور سا مچ گیا، تیمور ہنسے گیا تھا، تب ہی اس کی جیپ میں پڑا ہوا سیل فون گنگنا اٹھا اور مسلسل بجتا چلا گیا، تیمور نے ایک گالی فون کرنے والے کو بکی تھی اور اس دلچسپ شغل کو ترک کر کے فون جیپ سے نکالا، کال اس کے خاص ملازم کی تھی۔

"کیا تکلیف ہے سمندر خان! تمہیں کہا بھی تھا بغیر کسی خاص وجہ کے ڈسٹرب نہ کرنا۔" اس نے فون پک کرتے ہی دھاڑ کر کہا تھا۔

"سرکار گستاخی معاف، مگر بات بہت اہم ہے، ایک لڑکی ہے سرکار بے حد خوبصورت شہر سے آئی ہے، راستہ بھٹک کر ہمارے ٹھکانے کی جانب آ گئی، آپ بتائیں کیا کرنا ہے۔" تیمور خان کی تیوری کے بل کھلنے لگے۔

"اسے سنبھال کر رکھو، میں آ کے بتاؤں گا۔" اس نے مختصراً کہہ کر فون بند کر دیا۔

"آپ چلے جاؤ گے سائیں؟" لڑکی گھاگ تھی لمحوں میں اس کے چہرے سے نتیجہ اخذ کر گئی، تیمور چونکا۔

"آں ہاں، جانا پڑے گا، ڈونٹ وری میں پھر آ جاؤں گا۔" اس کا گال سہلا کر تسلی سے نوازا گیا، لڑکی کا چہرا اتر گیا، وہ جانتی تھی اچھی طرح اپنی اوقات ان جیسوں کو ایسے مرد کسی ٹشو کی طرح اک بار ہی استعمال کرتے ہیں اور وہ استعمال ہو چکی تھی، تیمور نے واپسی کا راستہ عجلت میں طے کیا تھا، لڑکی کو باہر سے ہی چھوڑ کر وہ ایک بار پھر روانہ ہوا، وادی پر غروب ہوتے سورج کی شعاعیں اپنا سونا لٹا رہی تھیں، بدلتے موسم نے برف پگھلا دی تھی جس کے وجود سے بے شمار جھرنے اور آبشار جنم لے چکے تھے، تیمور بہت مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا، یہ سڑک بہت پتلی تھی، دائیں طرف آسمان کی طرح بے وسعت کھائیاں مگرمچھ کی طرح جبڑے کھولے ہولناکی کے احساس کو بڑھاتی تھیں جن کی گہرائیوں کا کوئی تعین کوئی حد معلوم نہ تھی، دوسری طرف فلک بوس پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی کرسٹل کی مانند چمک رہی تھیں، یہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ ذرا سی بھی بے احتیاطی موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی، تیمور خان کا نئے شکار کے متعلق سن کہ موڈ خوشگوار ہو چکا تھا، اس نے سارا راستہ گنگناتے ہوئے طے کیا تھا، پہاڑی سلسلہ ختم ہوا اور سرسبز علاقہ پھر سے شروع ہو گیا، مزید کچھ سفر کے بعد اس نے گاڑی سبزے سے گھرے آتشی پھولوں کی بیلوں سے ڈھکے ہٹ نما پختہ مکان کے آگے روکی تھی، دو مستعد بڑی مونچھوں والے مسلح ملازم جو پہرے پہ مامور تھے مستعد نظر آتے تھے، اسے دیکھتے ہی احتراماً ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور آگے بڑھ کر ایک نے جیپ کا دروازہ کھولا تھا، دوسرے نے گھر کا دروازہ اس کے پہنچنے سے قبل وا کر دیا۔

"لڑکی نے کوئی مسئلہ تو نہیں کیا سمندر خان۔" وہ اندر آتے ہی اپنے ہمراہ چلتے آدمی سے بولا تھا۔

"نہیں سرکار آپ کے حکم کے مطابق اندر کر دیا تھا، روئی چلائی تو سہی مگر نکلنے سے قاصر تھی۔"

"تم روسٹ تیار کرو، رات کے کھانے میں، باقی سامان موجود ہے۔"

"موجود ہے سائیں۔" سمندر خان نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی، تیمور خان اپنے پرتعیش کمرے میں آ گیا، جہاں وہ لڑکی بند تھی، خوب گھیر دار سوتی سکرٹ اور بے حد نفیس نیلا ایمبرائڈ بلاؤز وہ لڑکی دراز قد اور واقعی حواس چھین لینے کی حد تک خوبصورت تھی، تیمور خان تو اسے دیکھ کر ہی جھوم اٹھا تھا۔

"ک...... کون ہو تم؟" وہ سراسیمہ سی اسے دیکھتی دیوار سے جا لگی۔
سریلی گھنٹیوں کی آواز جیسے کسی پہاڑ سے جھرنا گرتا ہو، سچ ہے حسن مکمل ہو تب ہی جچتا ہے۔

"بولتے نہیں ہو کون ہو تم؟" وہ چلائی تھی، تیمور خان نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا لڑکی پہلے سے الرٹ تھی، اس کا نازک ہاتھ فضا میں گھوما تھا اور تیمور خان کے چہرے پہ جا پڑا تھا، اک شور سا برپا ہوا تیمور خان ہتک کے احساس سے بلبلا گیا، تکلیف تھپڑ کی نہیں توہین کی تھی، وہ جیسے آپے سے باہر ہوا تھا اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آگے بڑھ کر لڑکی کو دبوچ لیا، لڑکی مزاحمت کر رہی تھی، جس کے نتیجے میں اس کے بلاؤز کی دھجیاں بکھرنے لگیں ساتھ ساتھ تیمور خان کے وحشیانہ قہقہے بھی، وہ انسانی سطح سے گر کر جانور درندہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

"جہان ذرا کمرے میں آ کر میری بات سن لیں۔" وہ ابھی سونے کے ارادے سے لیٹا ہی تھا جب پپا کی کال اس کے سیل پہ آئی تھی، وہ حیران رہ گیا، ٹائم دیکھا بارہ بجنے والے تھے، ایسی کون سی ایمرجنسی ہو گئی تھی، نائٹ ڈریس پہ گاؤن پہن کر وہ ان کے کمرے کی بجائے اسٹڈی روم کی طرف آیا، اگر انہوں نے اس سے ضروری بات کرنی تھی تو پھر یقیناً وہیں کرتے، معاذ کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے اس نے ادھ کھلے دروازے سے جھانکا وہ اگلے دن کے لیکچر کی تیاری میں مصروف تھا مگر اس کی آہٹ پہ متوجہ ہو گیا تھا۔

"آؤ نا جے؟" اسے پلٹتے دیکھ کر معاذ نے مسکرا کر پکارا۔

"نہیں میں چاچو کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اس وقت؟ پپا جاگ رہے ہیں؟" وہ حیران نظر آیا، جہان نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"انہوں نے خود بلوایا ہے مجھے، میں حیران ہوں اس وقت کیا بات کرنی ہے؟" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی، معاذ نے شرارت سے آنکھیں نچائی تھیں۔

"کہیں انہیں لاہور والے واقعے کا تو پتہ نہیں چل گیا؟ تمہاری ساس کی اچھی خاصی سورس ہے۔" جہان کا دل دھک سے رہ گیا، خود اسے بھی یہی خدشہ لاحق ہوا تھا۔

"آئی ڈونٹ نو، دیکھتے ہیں۔" جہان نے کاندھے اچکا کر بے نیازی ظاہر کی۔

"تم چلو میں بھی آتا ہوں، پپا سے مجھے بھی اک بات کرنی ہے۔" جہان کمرے سے نکل کر اسٹڈی کے دروازے پہ آن ٹھہرا اور آہستگی سے دستک دی۔

"کم ان، آ جاؤ بیٹے، میں آپ کا ہی انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے دروازہ کھول پپا سگریٹ سلگائے ٹہل رہے تھے، اسے دیکھ کر تھکے ہوئے انداز میں بولے۔

"جی چاچو؟" وہ کچھ خائف سا انہیں دیکھنے لگا۔

"تم سوچ رہے ہو گے میں نے آدھی رات کو آپ کو ڈسٹرب کیا مگر......"

"اٹس او کے چاچو خیریت آپ پریشان لگتے ہیں۔" جہان نے بے حد محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا، جانے کیوں اسے اپنا خدشہ سچ ہوتا لگ رہا تھا۔

"جہان بیٹے اس روز ہم مسز آفریدی کی بات کر رہے تھے، ان کے حوالے سے اگر کوئی بات میرے علم میں نہیں تھی تو آپ کو مجھے بتانی چاہیے تھی۔" پپا کا لہجہ و انداز بے حد شاکی تھا، جہان کا دل ایکدم گہرائیوں میں جا کر ڈوبا، چہرا تاریک پڑنے لگا، کچھ کہے بغیر اس کا مجرمانہ انداز میں سر جھکانا ہی پپا کو مضطرب کر گیا تھا۔

"دس از ناٹ فیئر مائی سن، کیا آپ کو ہم میں سے کوئی پہ بھی اعتبار نہیں تھا؟" وہ بے حد ہرٹ ہو کر پوچھ رہے تھے۔

"آئی ایم ساری چاچو!" اس کا لہجہ شرمندگی سے بوجھل ہو گیا، اس شرمندگی سے جس سے بچنے کی خاطر اس نے مسز آفریدی کی اپنی سمت اچھالی غلاظت کو بھی اپنے اوپر سجا لیا تھا۔

"ہوا کیا تھا؟ کیوں آپ یہ قدم اٹھانے پہ مجبور ہوئے، آپ بہک گئے ہوں گے آئی کانٹ بلیو اٹ۔" پپا کے لہجے کے مان نے اس کے تن مردہ میں جان ڈال دی تھی، اتنا سمجھتے تھے یہ لوگ ایسے اسے خود اپنی اس وقت کی سوچ اور بدگمانی پہ ندامت اور یاسیت نے آن لیا، وہ کیوں بھول گیا تھا کہ پپا اس پہ جان دیتے تھے، ایک بار وہ آزماتا تو سہی، اسے پشیمانی اور پچھتاوا سا ہونے لگا۔

"کیا بتایا انہوں نے آپ کو؟" جہان نے لمحہ بھر ان سے نظریں چار کی تھیں۔

"ان کی چھوڑو، مجھے آپ بتاؤ کیسے ٹریپ کر لیا اس عورت نے آپ کو؟" جہان کچھ اور بھی شرمندگی محسوس کرنے لگا اور سفر کر کے جلتے چہرے سے انہیں بتانے لگا، پپا نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

"مجھے وہ خاتون بہت شارپ لگتی ہیں۔" پپا کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ نے کسی اور کو تو نہیں کچھ بتایا چاچو؟" جہان جھجک کر بولا تو پپا کی سوالیہ نگاہیں اس پر تھیں پھر سر جھکا تھا۔

"نہیں بیٹے! ڈونٹ وری، ایکچوئیلی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل اس بچی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں پپا کہ آپ ژالے بھابھی سے مل لیں، اپنی والدہ سے یکسر مختلف ہیں وہ۔" اسی پل معاذ نے اندر قدم رکھا تھا، جہان بری طرح جز بز ہوا۔

"آپ ملے ہو؟" پپا حیران ہوئے۔

"جی پپا نہ صرف ملا ہوں بلکہ ساری حقیقت سے بھی آگاہ ہوں ورنہ ان محترم نے تو سوچ رکھا تھا ہر ٹینشن خود ہی لینی ہے بس۔" معاذ نے بات کے اختتام پہ جہان کو گھورا جو بے زار نظر آ رہا تھا۔

"چاچو اب اس کھڑاگ میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر آپ مجھ پہ اعتماد ہے تو میں کل ہی ڈائیورس پیپر تیار کرا کے......"

"جہان بیٹے ریلیکس! جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں، یہ معاملہ اب میں خود ہینڈل کروں گا۔" جہان نے یوں ہونٹ بھینچ لئے جیسے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا ہو۔

"پپا میں بھی اب پرنیاں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" معاذ نے جلدی سے اپنا معاملہ پیش کیا تھا، پپا نے اسے خاموش نظروں سے دیکھا۔

"تو پھر مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"آف کورس آپ ہی اس معاملے کو لے کر آگے چلیں گے۔"

''یہ بعد میں دیکھی جائے گی، فی الحال مجھے جہان کا معاملہ حل کرنا ہے۔'' پپا نے اسے جان بوجھ کر ہری جھنڈی دکھائی، معاذ کا چہرا سرخ پڑ گیا، اسے یہ سراسر اپنی توہین محسوس ہوئی تھی، وہ کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھا تھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''السلام علیکم! بیٹا مبارک ہو جناب!'' وہ ہنستا مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا تھا، فریش اور خوش باش، بھابھی کے چہرے پہ نقاہت تھی مگر ہر کسی سے مبارک باد خوشی خوشی وصول رہی تھیں، معاذ کی نظروں نے بچے کو ڈھونڈا تو بھابھی نے ہنستے ہوئے، صوفے پہ بیٹھی پرنیاں کی سمت اشارہ کر دیا تھا، نومولود اس کی گود میں تھا، معاذ گہرا سانس بھرتا اسی جانب آگیا، جھک کر بچے کو پیار کرنا چاہا تھا کہ پرنیاں نے گھبرا کر بچے کو اس کی سمت بڑھا دیا، بھابھی اور زینب زور سے ہنس پڑیں، معاذ کو خجالت نے سرخ کر ڈالا۔

''میں بعد میں دیکھ لوں گا۔'' وہ نروٹھے پن سے کہتا سیدھا ہو گیا۔

''کس کو بچے کو یا پرنیاں کو؟'' زینب نے چھیڑا تھا اور خود ہی زور سے ہنس پڑی، معاذ کی سنجیدگی میں فرق نہیں آسکا۔

''کوئی نام سوچا؟'' وہ اسی سپاٹ انداز میں بھابھی کو دیکھنے لگا۔

''پرنیاں عدن رکھنے کو کہہ رہی ہے، میں نے تو صاف منع کر دیا کہ اپنے بیٹے کا رکھ لینا میرے شوہر کو تو عبدالرافع پسند ہے۔'' بھابھی نے کچھ دیر قبل کی کہی بات معاذ کے سامنے بھی دہرا دی، پرنیاں کا چہرا حیا کے احساس سے دہک کر انگارہ ہو گیا تھا اس پر معاذ کی آنچ دیتی ہوئی نظروں کا احساس، وہ اپنی جگہ پہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''ہاں تو نہ رکھیں آپ یہ نام ہم خود اپنے بیٹے کا رکھ لیں گے، کیوں پرنیاں؟''

معاذ کا موڈ لمحوں میں بحال ہو گیا تھا، اس کے برابر آکر بیٹھتے ہوئے وہ بظاہر بڑی معصومیت بڑی سادگی اور دوستانہ انداز میں بولا تھا مگر پرنیاں کا شرم سے برا حال ہو کر رہ گیا تھا، کمرے میں بولتی تنہائی تھی، اس کی بے باک دہکتی نگاہیں اپنے چہرے پہ مرتکز پا کر وہ اتنی نروس ہو چکی تھی کہ دھیرے دھیرے لرزنے لگی، معاذ کے ہونٹ بظاہر خاموش تھے مگر نگاہوں کی گستاخ سرگوشیاں اسے سہانے کو کافی تھیں، اس نے اپنا دھیان بٹانے کو بچے کو جھک کر پیار کیا تھا، معاذ کی شوخ کھنکار پہ وہ گھبرا کر سیدھی ہوئی، معاذ اس کی توجہ آئینے کی سمت مرکوز کرا رہا تھا، پرنیاں نے حیرانی سے نگاہوں کا زاویہ بدلا، اطالوی طرز کے قد آدم گولڈن فریم کے آئینے میں ان دونوں کا عکس بے حد نمایاں تھا، لمبا چوڑا بے حد خوبرو معاذ اس کے پہلو میں بچہ گود میں لئے بیٹھی وہ خود معاذ کا ایک بازو صوفے کی بیک پہ اس طرح پھیلا ہوا تھا گویا پرنیاں کے کاندھوں کے گرد ہو۔

''کتنا کمپلیٹ ہے نہ یہ منظر؟'' وہ اس کی نروس ہوتی نگاہوں میں جھانک کر شرارت آمیز مسکان کے ساتھ بولا، اس کی نگاہوں سے لپکتی شوق کی شعاعیں پرنیاں کے اندر تک ہلچل مچا گئیں، شرم اور خفت سے اس کا چہرا تپنے لگا، وہ اس قدر گھبرائی تھی کہ یکلخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آگے بڑھ کر بچے کو بھابھی کے پہلو میں لٹا دیا۔

''کیا ہوا پری! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' بھابھی جو زینب سے بات چیت میں مصروف تھیں اسے دیکھ کر چونکیں، پرنیاں نے محض ہونٹ کاٹے تھے، اس کے چہرے سے ابھی تک جیسے بھاپ سی نکل رہی تھی۔

''افوہ اسے شرم آرہی ہو گی لالے کہ پہلے یہ پھر آپ بھی عبدالرافع کو ایسے ہی دیکھ چکے ہیں، حالانکہ بچے کو دیکھنے کے بعد رونمائی دیتے ہیں۔'' زینب نے ایک اہم نقطہ اٹھایا تھا، بھابھی ہنسنے لگیں۔

''پرنیاں کو تو بھلے میں معاف کر دوں مگر معاذ کو نہیں کر سکتی، بھاری اسامی ہے بھئی۔''

''پرنیاں یہ بھی احسان کرنے کی ضرورت نہیں، یہ لیجئے ان کی طرف سے بھی ساتھ ہی۔'' معاذ نے والٹ کھول کر دو بڑے نوٹ ایک ساتھ بھابھی کی سمت بڑھائے، بھابھی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''بڑے فیاض بن رہے ہو، پرنیاں کی طرف سے کسی خوشی میں؟'' بھابھی کو شرارت سوجھ رہی تھی، وہ دونوں ساتھ کھڑے بے حد پیارے لگ رہے تھے، اونچا لمبا بے حد شاندار نظر آتا معاذ اور جدید تراش خراش کے لباس میں جھینپی گھبرائی شرمائی سی نازک گڑیا جیسی پرنیاں۔

''جب مستقبل میں ان کی ساری ذمہ داریاں مجھے اٹھانی ہیں تو ابھی بھی کوئی حرج نہیں ہے۔'' معاذ نے ترچھی نگاہوں سے پرنیاں کو دیکھا تھا، جس کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزرا تھا۔

''بھابھی ان کے پیسے واپس کر دیں، مجھے کسی کا احسان لینا پسند نہیں۔'' بچے کو ان کے پہلو میں لٹانے کے بعد پرنیاں نے اپنا بیگ کھول کر ہزار کا نوٹ نکالا تھا معاذ نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر قدم بڑھاتا پلٹ کر باہر چلا گیا، اس کے پیچھے کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا تھا۔

''تم نے اسے خفا کر دیا ہے پرنیاں۔'' بھابھی کے لہجے میں از حد تشویش تھی، پرنیاں نے سر جھٹک دیا تھا۔

''تمہارے رویئے میں شدت ہے پرنیاں اور شدت ہمیشہ نقصان کا باعث بنا کرتی ہے۔'' زینب کا انداز ناصحانہ تھا، پرنیاں نے ہونٹ بھینچ لئے، یہ ایسا موضوع تھا جس پہ وہ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی، تیمور خان کی کال آنے لگی، زینب وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

''تمہاری معاذ سے شادی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے پرنیاں، اس کی شکایتوں اور خفگی میں اضافہ مت کرو گڑیا، تم چھوٹی بہن ہو میری، اگر اس کی کوئی بات ناگوار بھی لگ جاتی ہے تو درگزر سے کام لیا کرو، عورت کو ازدواجی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھنے پڑتے ہیں اور زیادہ تر قربانی بھی عورت کا ہی نصیب بنا کرتی ہے، تم تو خوش نصیب ہو کہ معاذ بہت چاہتا ہے تمہیں۔'' پرنیاں نے سر جھکائے رکھا، اختلاف نہ تائید، اس کی خاموشی سے بھابھی کچھ اخذ نہیں کر سکتی تھیں۔

''تمہیں کوئی شکایت ہے معاذ سے؟'' پرنیاں کی آنکھیں بھر آنے کو ہوئیں مگر اس نے محض سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔

"آئی تھنک اس نے تمہاری بات کو مائینڈ کیا ہے، تم ذرا اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنا او کے؟" وہ پھر اسے قائل کرنے لگیں، پرنیاں کے اندر غضب کا احتجاج امڈ آیا۔

"سوری بھابھی مجھے اپنا آپ پیش کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

"تم بیوی ہو اس کی پرنیاں۔" بھابھی تو اس کی پھٹ پڑنے پہ تعجب زدہ رہ گئی تھیں۔

"بیوی ہوں، جبھی طوائفوں والی حرکتیں نہیں کر سکتی۔" اس نے کلس کر کہا تھا، معاذ جو کسی کام سے اندر آ رہا تھا اور بھابھی کو اپنے متعلق بات کرتے سن چکا تھا وہیں ٹھٹکا رہ گیا، پرنیاں کے جواب نے اس کے چہرے پہ پورے جسم کا خون جمع کر دیا تھا، دانت بھینچ کر وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر چلا گیا، جبکہ اندر بھابھی پرنیاں کے تنفر زدہ انداز کو دیکھتی سناٹے کی زد پہ آ گئی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہو پری؟ خدانخواستہ کیا بات ہو گئی؟" پرنیاں ایک دم ڈھیلی پڑ گئی، اسے خود سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس کے منہ سے اس قدر نازیبا بات نکل کیسے گئی تھی، جبھی بے تحاشا خفت کا شکار ہو کر رہ گئی۔

"سوری بھابھی...... مجھے پتہ نہیں......" اسکی آنکھیں بے بسی کے احساس سے نم ہوئیں تو بھابھی نے آہستگی و نرمی کے ساتھ اس کا ہاتھ تھپک کر گویا تسلی دی تھی، پرنیاں پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے لگی، اس کی ذہنی کیفیت اس قدر دگرگوں ہو رہی تھی کہ اسے یونہی بعد میں شرمندہ ہونا پڑتا تھا اور یہ سب معاذ کی وجہ سے تھا اسے پھر معاذ پہ غصہ آنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پہ گیم کھیل رہی تھی جب ملازمہ نے آ کر اسے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

"مما کو بتاؤ جا کے۔" اس نے یونہی مصروف رہ کر کہا تھا۔

"بیگم صاحبہ نے انہیں یہاں بھیجا ہے، آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"مجھ سے؟" وہ حیران ہوئی، ملازمہ کے سر ہلانے پہ سوچ میں ڈوب گئی۔

"کوئی خاتون ہیں؟" پہلا خیال اسے نیلما کا ہی آیا تھا۔

"نہیں جی صاحب ہیں بابو آدمی ہیں۔" اس کا دل زور سے دھڑکا سب سے پہلے دھیان جہان کا ہی آیا تھا۔

"او کے چلو آتی ہوں، چائے بنالاؤ۔" اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئی تھی، آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا ٹھیک ٹھاک تھا۔

"السلام علیکم!" وہ اندر داخل ہوتے ہی گھبرا کر چوکھٹ پہ رک گئی تھی، سامنے صوفے پہ پپا بڑے طمطراق سے بیٹھے ہوئے تھے، وہ انہیں بہر حال پہچاننے سے قاصر رہی تھی، گرے کلر کے قیمتی سوٹ میں انکی پرسنالٹی بے حد پر وقار و متاثر کن تھی، سرخی مائل چہرے پہ کچھ ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ مقابل خود بخود ہی مرعوب و مودب ہو جائے، ژالے بھی کچھ کنفیوژ ہو گئی تھی جبھی محض سلام ہی کر سکی۔

"وعلیکم السلام! آپ ژالے ہیں؟" انہوں نے متاسف بھرے انداز میں سلام کا جواب دیتے اس کا جائزہ لیا، وہ بے حد خوبصورت تھی جب بولی تو جیسے ہوائیں بھی گنگنا اٹھی تھیں، وہ جتنی خوبصورت تھی اس سے زیادہ دلکش آواز کی مالک تھی اور خوبصورتی بذات خود کسی معجزے سے کم نہیں ہوتی، کاسنی کلر کے سوٹ میں ہم رنگ دوپٹہ سینے پہ سلیقے سے پھیلایا ہوا تھا، گولڈن کلر کے اسکارف میں اس کے چہرے کی جاذبیت اور نکھار دل موہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"جی مگر...... سوری میں آپ کو......؟"

پپا آہستگی سے مسکراتے تھے۔

"بیٹھ جاؤ بیٹے آپ، مجھے آپ سے بات کرنی ہے کچھ، جہانگیر کا چاچو ہوں میں۔" اس کے گریز اور گھبراہٹ کو دیکھتے انہیں تعارف کرانا پڑا تھا، ژالے چند ثانیوں کو ساکن رہ گئی، پھر اتنا بوکھلائی کہ فوراً سلام کر دیا تھا، حالانکہ وہ سلام سے ابتدا کر چکی تھی مگر انہوں نے اسے جتلا کر مزید کنفیوژ کرنا مناسب نہیں سمجھا، کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر چند رسمی باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑے ہوئے تو ژالے بھی سٹپٹا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ بیٹھئے نا پلیز، کھانا کھا کر جائیے گا، میں ممی کو کال کرتی ہوں، وہ بھی آ جائیں گی۔" پپا نرمی و حلاوت بھرے انداز میں مسکرا دیئے۔

"تھینکس بیٹے، مجھے واپس کراچی جانا ہے، آفیشل کام سے یہاں آنا ہوا تھا، سوچا اپنی بیٹی سے ملاقات کر لوں۔" انہوں نے اس کا سر تھپکا اور الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے، ژالے مسحور سی کھڑی رہ گئی، معاذ کے بعد جہان کے حوالے سے ان سے ملنا اسے ایک بار پھر بہت انوکھے اور خوشنما احساس سے لبریز کر گیا تھا۔

(یہ شاید معاذ بھائی کے پپا تھے، یہ مجھ سے ملنے کیوں آئے ہوں گے، شاہ کی وجہ سے؟ یا پھر معاذ بھائی نے بھیجا ہو گا؟ شاہ نے تو اتنے عرصے سے گھر میں شاید میرا تذکرہ بھی نہیں کیا ہو گا، یہ یقیناً معاذ صاحب کا کارنامہ ہے، تھینکس معاذ بھائی۔)

وہ آسودگی کے بھرپور احساس سے مسکرائی، اس پل ایک بار پھر وہ بھول گئی تھی کہ اس کی ماں کی یہ کوئی نئی چال بھی ہو سکتی ہے، وہ بس سب کچھ بھلائے اسی دلکش احساس میں مبتلا ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ثناء نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے لمحہ بھر کو نگاہ بھر کے اس کا سرخ چہرا دیکھا اور پھر سے غصے سے پیچ و تاب کھانے لگی۔

"تمہاری یہ خاموشی مجھے مصلحت نہیں بزدلی لگتی ہے پرنیاں، تمہیں اس کا منہ توڑنا چاہیے تھا، آخر تم ڈرتی کس بات سے ہو؟"

آج پھر نیہاں نے پرنیاں سے خوامخواہ الجھنا چاہا تھا، پرنیاں فساد نہیں چاہتی تھی، جبھی چپ سادھے رکھی مگر نیہاں کو تو جیسے آگ لگی ہوئی تھی، اپنی انسلٹ اسے صاف نظر آتی تھی، معاذ کا واضح جھکاؤ وہ محسوس کر چکی تھی پرنیاں کی طرف اور جب اس نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے معاذ سے خود اپنا مدعا بیان کیا تو جواب میں اس سے تہذیب اور روایات کے علاوہ مذہب کے حوالے سے بھی طویل لیکچر سننے کو ملا تھا، جس کے آخر میں معاذ نے صاف لفظوں میں یہ بھی جتلا دیا تھا کہ

اسے لڑکیوں کی بے باکی پسند ہے نہ وہ اس قسم کی لڑکیوں کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی حماقت کر سکتا ہے۔" اتنی سبکی اس درجہ تذلیل پہ وہ معاذ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی البتہ اس کی نفرت اور انتقام کا نشانہ پرنیاں کو بننا پڑا تھا، اس وقت بھی نیہاں نے بے دریغ پرنیاں پہ رکیک قسم کے الزام لگائے تھے کہ اس نے سر معاذ کو اپنے حسن کے دام میں الجھا لیا ہے اپنی گھٹیا اداؤں سے اور سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان سے چھپ کر ملتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ایسی گھٹیا اور بیہودہ زبان استعمال کرتی تھی وہ لڑکی کہ پرنیاں تو پرنیاں ثنا کے بھی کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا، ثناء نے تلملا کر اسے چند ایک جواب دینے چاہے مگر پرنیاں اسے زبردستی وہاں سے کھینچ لائی تھی، جس پہ ثناء غصے میں خود پہ کنٹرول کھو کر اسے ہی سخت سست سناتی رہی۔

"ایک پورا مجمع جمع ہو گیا تھا یہ گھٹیا بکواس سننے کو، تمہاری خاموشی سے بھاگ آنے پہ سب نے پتہ ہے کیا سمجھا ہو گا کہ غلط تم ہو۔" ثناء نے آئینہ اس کے سامنے رکھا تھا، پرنیاں نے غور کیا تو اسے یہ بات سو فیصد درست لگی، اس کا دماغ چکرانے لگا، اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے ایسے میں جب کالج آف ہونے پہ معاذ نے اسے بلوایا تو وہ بنا سوچے سمجھے تلملائی ہوئی اس کے سر پہ جا پہنچی تھی۔

"کیوں بلوایا ہے آپ نے مجھے؟"

"اُف اتنا غصہ؟ مجھے تو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ آپ آ جائیں گی۔" اس کا موڈ فریش تھا پرنیاں کے سر پہ لگی تھی جا کے گویا۔

"ہاں میں تماشا ہوں آپ کے لئے جانتی ہوں، میری عزت کی آپ کو پرواہ ہوتی تو مجمع اشتہار ہی کیوں بناتے آپ؟" وہ پھنکاری تھی، معاذ حیران رہ گیا۔

"پرنیاں...... خیریت کیا ہوا؟"

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں کیا ہوا، نیہاں سے پوچھیں جس نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے، میں آپ سے پوچھتی ہوں سر آپ کو کس نے حق دیا میری تذلیل اس طرح سے کرانے کا، آپ بھی یہ سب کچھ میرے ساتھ اس لئے کر رہے ہیں کہ میری بیک پہ کوئی نہیں ہے، اگر ایسا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں نکلتا، آپ کی ذرا سی بے احتیاطی نے میرا ایسا نقصان کیا ہے جس کا کوئی ازالہ بھی نہیں ہے۔" وہ ایکدم رو پڑی تھی اور یونہی روتے ہوئے اسٹاف روم سے باہر چلی گئی، معاذ حسن ساکن کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

سامنے اسکرین پر چلتی سلائیڈ ایک دم سے تبدیل ہوئی تو اس نے اپنا ہاتھ غیر ارادی طور پہ آنکھوں کے آگے کر لیا، اب تک کے اعداد و شمار کو ظاہر کرتی ہوئی، رنگوں سے سجی اس سلائیڈ کے تیز رنگ اس کی آنکھوں میں ایکدم چبھے تھے، اس سر درد کی وجہ سے کل سے اس کی طبیعت خراب تھی، جواب مزید بگڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اسی وجہ سے اس مدھم روشنی والے اس کمرے میں چلتی ہوئی پریزنٹیشن پر دھیان دینے میں بھی اسے دقت محسوس ہو رہی تھی، اس نے کوٹ کی آستین پیچھے سرکا کر گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج رہے تھے، اس کے اندازے کے مطابق ابھی ایک گھنٹے کی

پریزنٹیشن باقی تھی، پھر اس کے اہم نکات پر بحث و سوال جواب کچھ نہیں تو کم از کم دو ڈھائی گھنٹے مزید یہیں صرف ہونے تھے، بات صرف سر درد کی نہیں تھی اسے اپنا وجود ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس نے گردن کے پیچھے ہاتھ پھیرا جہاں پٹھوں میں شدید کھنچاؤ تھا اس نے کرسی پہ پہلو بدلا تو درد کی شدید لہر وجود میں اتر گئی، پپا بھی آفس میں نہیں تھے، اسے ہر صورت خود ہی اس پریزنٹیشن کو پورا کرنا تھا۔

"پتہ نہیں چاچو نے وہاں کیسے معاملہ نپٹایا ہو گا، وہاں جا کے بیٹھ ہی گئے ہیں، اتنی دیر تو نہیں لگانی چاہیے تھی مجھے کال بھی نہیں کی۔"

وہ نئے سرے سے ڈسٹرب ہونے لگا پہلے خود انہیں فون کرنے کا سوچا مگر پھر فطری جھجک آڑے آ گئی تھی، مگر اضطراب بڑھتا جا رہا تھا تبھی اس نے معاذ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا، اس کی آواز سنتے ہی اپنی پریشانی کی وجہ بتانے لگا۔

"اُفوہ تو تمہیں انتظار رہے کہ کیا رہا، وہ بھی بے چینی سے، یار یہ تو آخر ہونا ہی تھا، لڑکی تھی ہی بہت فیسی ٹیٹک۔" معاذ نے قہقہہ لگایا تھا، جہاں اسی لحاظ سے بدمزا ہوا۔

"بکو مت معاذ! مجھے اس میں کتنا انٹرسٹ ہے تم اچھی طرح جانتے ہو، مجھے یہ فکر ہے مسز آفریدی نے چاچو کو بھی شیشے میں نہ اتار لیا ہو۔" وہ جھنجھلا کر بولا تھا، معاذ کا قہقہہ مزید طویل ہو گیا۔

"یہ بات تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی، پپا تو اس ایج میں بھی اتنے امپریسو ہیں، اگر ایسی بات ہوئی نا جے تو مما کے ساتھ ساتھ میں بھی عمر بھر تمہیں معاف نہیں کروں گا، تم نے زندگی کے کس مقام پہ لا کر ہمارے ڈیڈ کو ہم سے چھیننے کی سازش کی ہے۔"

وہ جتنا غیر سنجیدہ تھا یہ اس کی گفتگو نے ظاہر کر دیا تھا، جہان اتنا جھلایا تھا کہ فون بند کر دیا، کچھ دیر بعد ہی معاذ کی کال آنے لگی مگر وہ نظر انداز کیے، اسکرین کی سمت متوجہ رہا تھا، جانے کتنی دیر تک ٹیبل پہ پڑا سیل فون وائبریٹ کرتا رہا، ڈیڑھ گھنٹے بعد جب جہان نے گھر جانے سے قبل اپنا سیل فون اٹھایا تو معاذ کا ٹیکسٹ موجود تھا۔

"پپا واپس آ گئے ہیں، تمہاری قسمت کا فیصلہ سننے کو میں تو ہاسپٹل سے ابھی گھر جا رہا ہوں، اللہ تمہیں ثرالے آفریدی مبارک کرے ہاہاہا۔"

جہان کا چہرا تپ گیا تھا، اس نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، گھر پہنچا تو اس کی گردن اور کمر کی درد شدید اینٹھن میں ڈھل گئی تھی، بیگ اور کوٹ بستر پہ پھینک کر وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ڈریسنگ روم میں گھس گیا، موسم تبدیل ہو چکا تھا، خرابی طبیعت میں اس نے باتھ لینا مناسب خیال نہیں کیا تھا، چینج کر کے باہر آیا تو ماریہ پپا کے پیغام کے ساتھ موجود تھی۔

"جہان بھائی پپا آپ کو اپنے روم میں بلا رہے ہیں۔" جہان کے چہرے کی گمبھیرتا میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا، اس نے معاذ کے متعلق سوال کیا تھا۔

"لالہ بھی وہیں ہیں، آپ چائے تو پی لیں بھائی۔"

"میں ابھی آ جاتا ہوں گڑیا۔" وہ آہستگی سے کہتا کمرے سے نکل آیا، پپا کے روم میں چاروں

بزرگوں کے علاوہ معاذ بھی موجود تھا، ایسے دیکھتے ہی شرارت سے مسکرایا اور بھاگ کر اس سے زبردست معانقہ کرنے لگا۔

"مبارک ہو جناب! پپا نے آپ کے لئے ژالے آفریدی کو کنفرم کر دیا ہے۔" وہ بچوں کی سی خوشی سے کھلکھلایا تھا، جہان نے ٹھٹک کر پپا کو دیکھا تھا، اس کی نگاہوں میں عجیب سی وحشت سرسرائی تھی، جسے دیکھتے پپا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئے۔

"میں مسز آفریدی کے ساتھ ساتھ ژالے سے بھی مل کر آ رہا ہوں بیٹے! مجھے وہ بچی ہر لحاظ سے آپ کے لئے پرفیکٹ لگی ہے، ویسے بھی میں کسی کے جرم کی سزا کسی اور کو دینے کا قائل نہیں ہوں۔" پپا اس کی متغیر ہوئی رنگت پہ نگاہ جمائے مدبرانہ انداز میں گویا ہوئے تھے، جہان نے سر نہیں اٹھایا اس کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے، اسے ایک بار پھر اپنی ہار کا احساس ہوا، حالانکہ جب پپا نے اس کی طرفداری کی تھی تو اسے لگا تھا تمام زخموں کے کھلے منہ کسی نے بہت دھیرے سے بند کر کے ان پہ مرہم رکھ دیا ہو، مگر اب انہی زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے تھے، یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔

(یقیناً چاچو کو میری پارسائی اور بے گناہی پہ ڈاؤٹ ہے جبھی انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے ورنہ انہیں ہمیشہ میری خوشی عزیز و مقدم رہی تھی۔)

اس کی پور پور سلگ اٹھی، رگوں میں خون کی جگہ انگارے دوڑنے لگے، اپنی بے وقتی اور تذلیل پہ کبھی کبھی تو مر جانے کو دل کرتا تھا۔

"میں جانتا ہوں بیٹے آپ کو میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا، ان لوگوں کو بھی نہیں قائل کر سکا ہوں میں۔" پپا نے گم صم اور کسی قدر رنجیدہ نظر آتیں مما اور مما جان کی سمت اشارہ کر کے گہرا سانس بھرا اور مزید گویا ہوئے۔

"مگر وقت ثابت کرے گا انشاء اللہ کہ یہ فیصلہ کسی درجہ بہترین ہے۔" پپا نے اس کے ضبط کی کوشش میں سرخ پڑے چہرے پہ پیار بھری نگاہ ڈال کر نرمی سے کہا تھا، وہ تب بھی کچھ نہیں بولا، پپا نے کچھ دیر اسے ہونٹ سختی سے بھینچے نظریں جھکائے دیکھا تھا، پھر آہستگی سے کھینچ کر اسے گلے سے لگا لیا، ماحول ایک دم سے سوگوار اور گمبھیر تر ہو گیا تھا، مما نے ہونٹ کچلنا شروع کر دیئے تھے۔

"آئی ایم ساری بیٹے! میں سمجھ سکتا ہوں کہ میرا یہ جبری فیصلہ آپ کو ہرگز پسند نہیں آیا مگر آپ کو میرے خلوص اور محبت پہ شک نہیں کرنی چاہیے۔" جہان کا گلا ایکدم بھرا گیا، اس نے نم ہو جانے والی آنکھوں کو ان کے کاندھے سے رگڑ کر نمی کو اندر اتارا تھا، پھر خود کو سنبھال کر بہت جبر سے مسکرایا۔

"مجھے گنہگار مت کریں چاچو، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" پپا نے جواباً کچھ کہے بغیر آہستگی اور محبت سے اسے تھپکا تھا، جہان ان سے الگ ہوا تھا پھر یونہی سر جھکائے پلٹ کر باہر نکل گیا، تب سے خود کو سنبھالے بیٹھی مما کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں، پپا نے ایک نظر انہیں دیکھا اور سگریٹ سلگانے لگے، ابھی لاہور سے واپس آنے کے بعد انہوں نے جب یہ سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا تو سب سے زیادہ اختلاف اور احتجاج مما نے ہی کیا تھا، مما جان کو بھی اختلاف تھا مگر انہوں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، جبکہ پاپا جان کو اب بھی ہمیشہ کی طرح اپنے چھوٹے بھائی کے فیصلے پہ اطمینان اور تسلی تھی کہ وہ کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔

"کیوں رو رہی ہیں مما؟" معاذ بے چین ہو کر ان کے نزدیک آیا اور انہیں اپنے بازوؤں میں سمٹ لیا، وہ تو جیسے ایسے ہی کسی جذباتی سہارے کی منتظر تھیں شدتوں سے رونے لگیں۔

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے، اپنے پپا، کو دیکھا آپ نے معاذ! اللہ جانے کیسی لڑکی کو اٹھا کر یہاں لا رہے ہیں، خود سوچو جنہوں نے میرے معصوم بچے کو ایسی چالاکی سے پھانس لیا کیسی عورتیں ہوں گی، منہ دیکھا تھا کیسا اتر گیا تھا جہان کا۔" انہوں نے شوہر کے آگے پیش نہ چلتی دیکھ کر بیٹے سے شکایت کی، ماما جان بھی دیورانی کی ہمنوا تھیں جبھی جھٹ ساتھ نبھانے کو آنسو بہانے لگیں، معاذ نے بے بس سا ہو کر پپا کو دیکھا جو جھلاہٹ کا شکار ہونا شروع کر چکے تھے۔

"جہان کا دشمن نہیں ہوں میں، غالباً آپ محترماؤں سے زیادہ ہی قریبی رشتہ ہے اس سے

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی عید کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں، مہندی، چوڑیاں، نت نئے لباس، گھر کی آرائش و زیبائش اور مزے دار چٹ پٹے پکوان، عید کے تصور سے ہی ہر چہرہ شاد اور دمکتا نظر آتا ہے، حسب روایت ہم نے مصنفین اور قارئین سے عید کی مناسبت سے ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ جس کے سوالات کچھ یوں ہیں۔

عید سروے سوالات:۔

۱۔ آپ عید الفطر کس طرح مناتی ہیں، عید کی مناسبت سے کوئی ایسی رسم و روایت جس کے بنا آپ کو عید نامکمل لگتی ہو؟
۲۔ عید کا کوئی خاص پکوان جس کی آپ کے گھر والے اور مہمان فرمائش کر کے بنواتے ہیں اس کی ترکیب لکھیں؟
۳۔ چاند دیکھ کر کوئی دعا یاد آتی ہے یا کوئی چاند سا چہرہ؟
۴۔ عید سے قبل یا عید کے دن رونما ہونے والا کوئی خوشگوار واقع یا فون یا میسج جس نے عید کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا ہو؟
۵۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ عید کا دن اپنی پسندیدہ مصنفہ یا شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہیں تو آپ کس کے ساتھ گزاریں گی؟
۶۔ اپنے سپنوں کے چاند کے لئے کوئی شعر یا خوبصورت جملہ؟

ان سوالات کے جوابات بیس جولائی تک ارسال کریں ساتھ میں تصاویر بھی۔
(تصویر ضروری نہیں)

میرا، معذرت کے ساتھ۔'' مما کو خود کو گھورتے پا کر انہوں نے گھبرا کر وضاحت ضروری جمی پھر اسی مناسبت سے بولے تھے۔

''یہ جو کچھ بھی ہوا مسز آفریدی کا کیا دھرا ہے بیگم صاحبہ بچی کا کوئی قصور نہیں نکلتا، کیا آپ کو مجھ پہ میری بات پہ یقین نہیں ہے؟ بہت پیاری بچی ہے ژالے، جہان کو ایسی ہی ہم سفر کی ضرورت ہے اس وقت جن حالات سے وہ گزر رہا ہے، دھیمے مزاج کی وفا پرست، پرخلوص ساتھی کی، محبت میں ساتھی کی خطاؤں کو درگزر کرنا اور اس کی خاطر ایثار کرنا ہی عورت کا طرف نہیں ہوتا، اس بچی میں مجھے یہی کوالٹیز نظر آئی ہیں اور آپ اسے میری ریکوسٹ سمجھ لیں کہ اس بچی کو کبھی اس حوالے سے ہرٹ نہ ہونا پڑے، آپ سمجھ لیں یہ بات آپ کے علم میں آئی ہی نہیں، وہ اس گھر کی بہو بنی ہے تو اسے اس کا یہ حق پورے اعزاز اور وقار کے ساتھ ملنا چاہیے، مجھے امید ہے آپ لوگ مجھے شکایت کا موقع نہیں دیں گے، خاص طور پہ یہ بات بچوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔'' انہوں نے بات ختم کردی تھی، معاذ نے دیکھا مما کا چہرا ہنوز بجھا ہوا تھا، وہ گہرا ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''جے!'' وہ بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، زینب کی آواز پہ گہرا سانس بھر کے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اس کے تاثرات سرد تھے۔

''لالے کو تو بدنام کیا ہوا ہے لوگوں نے خوامخواہ، ورنہ بدنام سے بد اچھے بہرحال نہیں ہوتے۔'' الفاظ تیکھے اور لہجہ طنزیہ تھا، جہان نے ایکدم یوں ہونٹ بھینچ لئے جیسے خود پہ ضبط کے پہرے سخت کیے ہوں، اسے سمجھنے میں ایک لحہ بھی نہیں لگا تھا وہ کسی حوالے سے یہ نشتر زنی کر رہی ہے، سرخ چہرے کے ساتھ وہ قدم بڑھا چکا تھا، جب زینب نے سرعت سے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

''کب سے ہے یہ سلسلہ شروع کیا ہوا؟ اگر نکاح اتنے عرصے سے کر رکھا تھا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ پھنکاری تھی، جہان نے جلتی آنکھوں کو لحہ بھر کو اٹھا کر اس کے غصیلے تاثرات والے چہرے کو دیکھا تھا۔

''آئی تھینک یہ میرا انتہائی ذاتی معاملہ ہے زینب! آپ کو انٹرفیئر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' بالآخر اس کا ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تھا، وہ جتنے سکون سے بولا تھا اندر سے اسی قدر شدت سے بکھر رہا تھا، اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں سیڑھیاں پھلانگ گیا، اس کے لہجے کی تلخی اور بیگانگی زینب کو برچھی کی انی بن کر چبھی تھی۔

(جاری ہے)

تیرے انتظار کے پھول

خالدہ نثار

اس نے جب گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر قدم رکھا شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے کچھ سائے، اس کے صبیح چہرے پر بھی پھیلے ہوئے تھے گہرے دکھ کے، مایوسی کے، شکست کے سائے، اس کے قدموں سے صدیوں کی تھکن لپٹی ہوئی تھی اور ایسی ہی تھکن اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی، سفید دوپٹے کا ایک کونہ سر پہ تھا تو دوسرا اس کے پاؤں سے الجھ رہا تھا، شاہوں کی حویلی کو جاتے راستے پر قدم رکھتے ہی اس کی بنجر آنکھوں سے نکل کر دو موتی اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے، اس حویلی سے جاتے ہی وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر گئی تھی اور آتے سمے خالی ہاتھ تھی، جاتے وقت قدم بہت تیزی سے اس راستے کو ناپ رہے تھے اور اب ایک ایک قدم اٹھانا بھی قیامت تھا، یہ اٹھتے قدم کے ساتھ کیا کچھ نہ یاد آیا تھا، اپنا غرور، اپنا زعم، کس طنطنے کے ساتھ وہ حویلی اور وہاں بسنے والوں کی محبتوں کو ٹھوکر مار کر گئی تھی۔

''مجھے آپ کی کھوکھلی اور دکھاوے کی محبتوں کی ضرورت نہیں ہے میں اس کے بغیر بھی بہت آسانی اور خوشی کے ساتھ رہ سکتی ہوں اور رہوں گی۔'' اسے اپنے فخر اور غرور سے بھرے الفاظ یاد آئے، اپنا باغی لہجہ یاد آیا تو قدم وہیں ٹھٹک گئے، ٹھہر گئے، آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے، مگر آگے کو بڑھنا تھا کیونکہ یہی حویلی اس کا آخری ٹھکانہ تھی۔

☆☆☆

مغرب کی نماز ادا کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہی تھے جب دعا پھولے سانسوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

''داجی...... داجی...... زینی واپس آگئی ہے۔'' اس نے ان کے قریب آکے بتایا تو ان کے دعا کے لئے اٹھے ہاتھ کپکپا کر رہ گئے تھے، دل سینے میں اتنی زور سے پھڑپھڑا رہا تھا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

''خدا گواہ ہے زینی میں نے تمہیں کبھی بد دعا نہیں دی، تمہاری ہزار غلطیوں اور نادانیوں کے باوجود کبھی نہیں چاہا کہ تم پچھتاؤ، کبھی بھی نہیں۔'' الفاظ ان کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ ہال کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر اس پر پڑی تھی، زرد چہرا، ویران آنکھیں، پپڑی زدہ ہونٹ، شکستہ وجود، ان کا دل کٹ کر رہ گیا تھا، ٹوٹی بکھری نظر آنے والی شکست خوردہ، بھلا ان کی زینی کہاں تھی؟۔

ہال کمرے میں اس وقت ماسوائے ایک شخص کے سبھی لوگ موجود تھے، دلاور شاہ، زبیر شاہ سے لے کر حویلی کے ملازمین تک سب ہی خاموش تھے، سب ہی کی نظریں کمرے کے وسط میں سر جھکائے کھڑی زینب شاہ پر تھی، سب کی آنکھوں میں سوال تھے، لا تعداد سوال؟ اور سب ہی کی آنکھوں میں ان سوالات کے علاوہ جو چیز مشترک تھی وہ نفرت تھی بے انتہا نفرت، جسے ایک نظر دیکھتے ہی اس کا جھکا سر مزید جھک گیا تھا، داجی کے کمرے میں آتے ہی تمام نظریں زینب شاہ کے چہرے سے ہٹ کر ان کے چہرے پر آ ٹھہری تھی، زینب شاہ نے چونک کر سر اٹھایا تھا پھر اپنے سامنے کھڑے وجود کو دیکھتے ہی اس کے نجانے کب کے رکے آنسو بے اختیار ہو کے بہنے لگے تھے۔

☆☆☆

''دا جان!'' بڑی مشکل سے اس کے لبوں سے ادا ہوا تھا اور دل نے شدت سے چاہا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے دیکھتے ہی اپنی بانہیں وا کر دیں اور وہ دوڑ کر ان کے سینے سے جا لگے۔

سیاہ پراڈو جیسے ہی کچے راستے پہ اتری، رسول بخش نے کندھے پر رکھا صافہ جھاڑا دوبارہ سے کندھے پر جمایا اور مستعد سا کھڑا ہو گیا، گاڑی اس کے قریب آ کر رکی تو اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، لائٹ براؤن کاٹن کے شلوار سوٹ میں لیدر کی چپل پہنے آزاور شاہ باہر نکلا۔

''السلام علیکم سرکار!'' رسول بخش نے فوراً سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام اور سب خیریت رہی؟'' گاڑی لاک کر کے اس نے پوچھا تھا۔

''جی شاہ جی بس وہ......'' بات کرتے کرتے رسول بخش ایک دم رکا تھا، آزاور شاہ نے فوراً پلٹ کر اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے رسول بخش۔'' آزاور شاہ نے اپنے خاص بندے کی طرف نگاہ ڈالی۔

''وہ شاہ جی...... زینب بی بی واپس آگئی ہیں۔'' رسول بخش نے سر جھکائے جو خبر سنائی تھی، وہ سن کر ٹھٹکا اور رکا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو رسول بخش؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں شاہ جی۔'' سر جھکائے ہی رسول بخش نے کہا تو اس کا پورا وجود گویا شعلوں کی زد میں آ گیا تھا، تنفر سے سر جھٹکتے وہ اندر کی جانب بڑھا تھا۔

☆☆☆

جڑے ہوئے ہاتھوں اور بہتے اشکوں کے ساتھ وہ ان کے سامنے کھڑی تھی، وہاں موجود سبھی لوگوں سے اس نے معافی مانگی تھی، رو رو کر، وہ زینب شاہ جس نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا تھا، جو ہمیشہ ہر کام ڈٹ کر اور ڈنکے کی چوٹ پر کرتی تھی، جس کی ڈکشنری میں معافی نام کا کوئی لفظ تھا ہی نہیں، آج وہی زینب شاہ بہت بلندی سے گری تھی اور گرنے میں ساری خطا بھی تو خود اس کی اپنی تھی، انسان گرتا ہمیشہ اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہی ہے، ٹھوکر کھائے بغیر سنبھلتا ہی نہیں ہے، اسے بھی ٹھوکر لگی تھی اور ایسی لگی تھی کہ وہ سیدھی منہ کے بل آ گری تھی۔

''مم...... مجھے معاف کر دیں...... دا جی...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں معافی کے قابل نہیں ہوں میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں آپ میری جھولی کو نہیں اپنے ظرف کو دیکھیں گے، آپ نے ہمیشہ مجھ پر لٹایا ہے، بے تحاشا لٹایا ہے اور بے حساب لٹایا ہے، اپنا پیار، اپنی محبت اپنی توجہ اور میں بد نصیب قدر نہیں کر سکی، سنبھال نہیں سکی، انسان کو جو چیز بنا کوشش کے مل جائے اس کی اسے قدر ہوتی بھی نہیں ہے، وہ اسے سنبھال سنبھال کر سینت سینت کر رکھتا بھی نہیں ہے، مگر اپنی لاپروائی کے ہاتھوں جب وہ چیز گنوا دیتا ہے تو پھر روتا ہے، پچھتاتا ہے افسوس کرتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا داجی، آپ کی تحفظ بھری چھت کو چھوڑ کر گئی تو پھر کہیں امان نہیں ملی، لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں داجی، اب میں مر کر ہی یہاں سے نکلوں گی، اپنی ساری زندگی آپ کے قدموں میں گزار دوں گی، پلیز داجی ایک بار مجھے معاف کر دیجئے، میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں، نادم ہوں مگر خدا کے لئے میری خطاؤں کو

میرے لئے پچھتاوا نہ بنا دیجئے گا، پلیز داجی ایک بار مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگا لیجئے، میں بہت تڑپی ہوں اس کے لئے۔" بھل بھل بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ بمشکل بول رہی تھی اور ان کا دل کٹ رہا تھا ان کا پورا وجود لرز رہا تھا خود پر قابو پا کر انہوں نے اپنی بانہیں وا کر دیں تھی۔

"میری بچی، میری زینی، میری جان۔" اس کے ریشمی بالوں پر بوسے دیتے ان کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے، وہاں کھڑے تمام لوگوں کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

"میں نے تمہیں معاف کیا زینی، ان سب نے تمہیں معاف کیا، مگر۔" داجی کچھ دیر رکے اور پھر بولے۔

"تمہارے یہاں رہنے کا فیصلہ اب وہی کرے گا جسے ہم نے تمہاری ذات سے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا اختیار آج سے ڈیڑھ سال پہلے ہی دے دیا تھا۔" صوفے پر بیٹھے داجی کی بات پر ان کے قدموں میں بیٹھی زینی کے ساتھ حویلی کے باقی تمام مکینوں نے بھی چونک کر دیکھا تھا، آزاور شاہ، زینب شاہ کے لب بے آواز ہلے تھے۔

☆☆☆

کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی وہ اس پار موجود چاند پر نظریں جمائے محو انتظار تھی، اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کی انتظار جو طویل تر ہوتا جا رہا تھا، تبھی ٹھنڈی میٹھی روشنی بکھیرے چاند پر نگاہ جمائے اس نے ماضی کی کتاب کھولی اور لفظ لفظ پڑھنا شروع کر دی تھی۔

الیاس علی شاہ کے تین بیٹے تھے سب سے بڑے دلاور شاہ تھے جن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی سب سے بڑا حمزہ شاہ تھا جس کی شادی دلاور شاہ کی بیوی یعنی سلمیٰ شاہ کی بھانجی سے ہوئی تھی، اس سے چھوٹی زہرا تھی جو زبیر شاہ کے سکندر شاہ کے ساتھ منسوب تھی اور سب سے آخر میں آزاور شاہ تھا، انتہائی وجیہہ، ذہین، مضبوط سوچ اور بلند کردار کا مالک، داجی کا سب سے فیورٹ پوتا، انہیں اس کی پختہ سوچ اور سنجیدہ مزاج بہت پسند تھا، زبیر شاہ کا ایک ہی بیٹا تھا سکندر شاہ، سب سے چھوٹے عذیر شاہ نے حویلی کی روایت کے برخلاف اپنی یونیورسٹی فیلو انیلہ زمان سے شادی کی تھی جس کی وجہ سے حویلی کے تمام مکین ہی ان سے دل ہی دل میں کچھ خفا سے تھے مگر عزت کے ہاتھوں مجبور انہوں نے چاہے کیسے ہی سہی مگر انیلہ زمان کو حویلی کی بہو تسلیم کر لیا تھا۔

گزرتے وقت نے دلوں میں موجود دوریوں کو گھٹانے کے بجائے بڑھا دیا تھا کچھ انیلہ کا مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ کسی سے گھل مل کر رہنے کی عادی نہیں تھی اوپر سے اس بات کا بھی بہت غرور تھا کہ عذیر شاہ انہیں حویلی والوں کی مرضی کے خلاف اس کی محبت میں ڈوب کر ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کر لائے ہیں، فطرتاً گھمنڈی تھی، نازک مزاجی اور ناز نخرے میں بھی اپنی مثال آپ تھی، اپنے آگے کسی کو کچھ نہ گردانتی تھی، عذیر شاہ کے دل و دماغ پر ان کا پورا پورا اختیار تھا، جس کی وجہ سے کسی اور کی پرواہ۔

وقت کا کام گزرنا تھا، سو گزرتا چلا جاتا ہے، عذیر شاہ اور انیلہ زمان کی شادی کو بھی تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کے آنگن میں ننھی کلی زینب کی صورت کھل چکی تھی، گلابی چہرا کالی سیاہ چمکتی بڑی بڑی آنکھیں اور سرخ لب، اسے دیکھتے ہی بے اختیار اس پر پیار آ جاتا تھا، تبھی داجان سے لے کر چھ سالہ آزاور شاہ تک سب ہی کی اس میں جان تھی، سب اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے، بے تحاشا لاڈ پیار اور توجہ نے اسے کچھ لاپرواہ، ضدی اور نازک مزاج سا بنا دیا تھا، زندگی سیدھے سبھاؤ گزر رہی تھی جب اچانک ہی حویلی بہت بڑے طوفان کی زد میں آئی تھی، شہر سے گاؤں آتے عذیر شاہ کی گاڑی کو پیش آنے والا حادثہ جان لیوا ثابت ہوا تھا، حویلی پر یہ خبر کہرام بن کر گری تھی، انیلہ زمان کو غش پر غش آ رہے تھے دلاور شاہ، زبیر شاہ جوان بھائی کی المناک موت پر آنسو بہاتے نہ تھکتے تھے، داجی بالکل خاموش ہو گئے تھے اور وہ جس کا سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا وہ نقصان سے انجان بنی ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

حویلی کے مکینوں کے دلوں کی طرح حویلی کے در و دیوار بھی سوگوار تھے، حادثہ بہت بڑا تھا، غم ناقابل برداشت، وہ سب ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے ایک دوسرے سے چھپ چھپ کے روتے اور ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے، داجان سے لے کر حویلی کے باقی تمام لوگ بھی ہر وقت انیلہ کی دل جوئی میں مصروف رہتے جو پہلی بار اپنا تمام غرور و طنطنہ بھولے غم کی شدت سے نڈھال تھی۔

زخم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وقت کا مرہم اس مندمل کر دیتا ہے، تین سال گزر چکے تھے عذیر شاہ کو ان سب سے بچھڑے اور بظاہر وہ سب ہی سنبھل چکے تھے، انیلہ بھی مشکل سے ہی سہی مگر زینب کے لئے خود کو سنبھال چکی تھی، طوفان کے بعد حالات پرسکون تھے یا شاید پھر یہ آنے والے طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔

نجانے کب اور کیسے انیلہ زمان نے اپنے تمام دکھوں کا مداوا شیر زمان کی شکل میں ڈھونڈ لیا تھا، داجان کو جب تک خبر ہوئی بہت دیر ہو چکی تھی، انیلہ نڈر اور بے خوف تھی اور شیر زمان سے شادی کے لئے پرعزم، تب داجان نے ان کے سامنے ایک ہی شرط رکھی تھی کہ اگر وہ شیر زمان سے شادی کریں گی تو انہیں زینب سے دستبردار ہونا پڑے گا، انہوں نے انیلہ زمان کے منہ زور جذبوں پر بند باندھنے کی کوشش کی تھی، مگر انہیں ناکامی ہوئی، زینب بھی ان کے پاؤں کی زنجیر ثابت نہیں ہو سکی تھی۔

☆☆☆

باپ قدرت نے لے لیا تھا اور ماں خود اپنی مرضی سے چھوڑ کر چلی گئی تھی، زینب شاہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے حویلی کے در و دیوار کو دیکھتی اپنے سے باپ اور مما کو ڈھونڈتی رہتی، اس کی سوالیہ نظریں جب بھی داجان پر پڑتی ان کا دل کٹ کر رہ جاتا اور وہ فوراً اسے اپنی بانہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیتے، زینب شاہ کے وجود سے انہیں عذیر شاہ کی خوشبو آتی تھی، داجان نے بہت توجہ محبت اور پیار سے اس کی پرورش کی تھی اسے بہت ناز و نعم میں پالا تھا حویلی کے باقی سب لوگوں نے بھی اس پر اپنی محبت لٹانے میں کبھی کنجوسی نہیں دکھائی تھی۔

ماہ و سال بیتے اور بچے جوانی کی دہلیز پر آ کھڑے ہوئے تھے اور ماں باپ بڑھاپے کی دہلیز پر، حمزہ شاہ کے لئے سلمیٰ شاہ نے اپنی بھانجی کا انتخاب کیا تھا اور گزرتے وقت نے ثابت کیا تھا کہ ان کا انتخاب کتنا درست تھا، حمزہ شاہ سے چھوٹی زہرا شاہ کو زبیر شاہ نے

سکندر شاہ کے لئے مانگ لیا تھا اور دا جان نے آزاور شاہ کی آنکھوں سے زینب شاہ کے لئے چھلکتی محبت کو دیکھتے انہیں ایک دوسرے سے منسوب کر دیا تھا۔

☆☆☆

سکندر شاہ اور زہرا شاہ کے ساتھ ان دونوں کا نکاح بھی طے کیا گیا تھا اور جس دن یہ مبارک کام سرانجام پایا آزاور شاہ کا چہرا اس کی اندرونی خوشی کا غماز بنا ہوا تھا، محبت اس کی آنکھوں سے چھلک پڑتی تھی اور دا جان دل ہی دل میں ماشااللہ کہتے خود بھی اس کے وجیہہ چہرے پر نگاہ نہ ڈالتے کہ مبادا خود ان کی نظر ہی نہ لگ جائے۔

☆☆☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی گہنے اتارنے میں مصروف تھی جب سائیڈ پہ رکھا سیل بجنا شروع ہو گیا تھا، کان سے جھمکا اتار کر اس نے رکھا اور سیل اٹھا کر سبز بٹن دبا کر کان سے لگا لیا تھا۔

"میری بچی، میری زینب، میں تمہاری بدنصیب ماں۔" اس کے ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے آنسوؤں میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"کون؟" اس نے حیرت سے دریافت کیا تھا اور آنے والے جواب نے اسے سناٹے میں کھڑا کر دیا تھا اور دوسرے ہی پل اس کے پورے وجود کو جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔

"ماں؟ شرم آنی چاہیے آپ کو یہ لفظ ادا کرتے ہوئے بھی، آپ جانتی ہیں ماں کیا ہوتی ہے؟" اس نے تڑخ کر کہا تو دوسری طرف سے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

"تم کہہ لو، تم کہنے کا حق رکھتی ہو میری بچی مگر خدارا ایک بار فقط ایک بار اپنی اس بدنصیب ماں کو بھی سن لو، تم نے آج تک وہی دیکھا ہے جو تمہیں دکھایا گیا ہے وہی سنا ہے جو تمہیں سنایا اور سمجھایا گیا ہے مگر میری بچی میری جان فقط ایک بار اپنی اس مجبور ماں کی آپ بیتی بھی سن لو جو مجبور تھی اور ہے، بے کس اور بے آسرا تھی اور جسے حویلی سے نکال دیا گیا تھا، دھکے دے کر اور تمہیں چھین کر مجھے وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔"

☆☆☆

وہ پوری رات اس نے بہت بے چینی کے عالم میں اور جاگ کر گزاری تھی، فقط ایک لمحے کا سکون بھی میسر نہیں آیا تھا، کبھی آنکھوں کے سامنے حویلی والوں کی محبت اور پیار آ جاتا اور کبھی کانوں میں ماں کی سسکیاں گونجنے لگتی تھیں اور ذہن ان کے کہے الفاظ دوہرانے لگتا تھا۔

"حویلی والوں نے کبھی مجھے دل سے قبول نہیں کیا تھا اور عذیر کے جانے کے بعد تو وہ کھل کر اپنی نفرت اور بے زاری کا اظہار کرنے لگے تھے، ان سب کے نزدیک میں اور میری عزت نفس دو کوڑی کی بھی نہیں تھی، انہوں نے مجھ پر زندگی تنگ کر دی تھی میرا اور نہ تو کوئی آسرا تھا اور نہ سہارا، والدین کب کے اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے بہن بھائی کوئی تھا نہیں جو خبر گیری کرتا اور جب حویلی والوں نے مجھ سے تمہیں چھین کر حویلی سے نکالا تو خدا نے شیر زمان کو وسیلہ بنا کر بھیجا، وہی تھے جنہوں نے اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا مجھے عزت دی اپنا نام دیا، لیکن بچے اتنا سب کچھ پا کر بھی میں ہمیشہ اندر سے خالی رہی، تمہاری یاد مجھے کسی طور چین نہیں لینے دیتی تھی، میں نے تم سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر مجھے ملنے نہیں دیا گیا، مجھے کہا گیا کہ تم مجھ سے بے تحاشا نفرت کرتی ہو اور میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں، تب میں دل پر پتھر رکھ کر خاموش ہو بیٹھی مگر اب جب ڈاکٹرز کے مطابق میرے پاس جینے کے لئے فقط چند ہی ماہ ہیں تو مجھ سے مزید صبر نہیں ہو سکا، میں ایک بار تمہیں اپنے سامنے اپنے روبرو دیکھنا چاہتی ہوں، بس ایک بار میری اس خواہش کو پورا کر دو، زینی ایک بار آ کے اپنی ماں سے مل لو، اسے اپنی صورت دکھا جاؤ۔" دوسری طرف سے فریاد بلند ہوئی۔

☆☆☆

وہ بوجھل ذہن و دل لئے بیٹھی تھی، جب ایک بار پھر انیلہ کی کال آ گئی تھی وہ بہت شاطرانہ طریقے کے ساتھ اسے شیشے میں اتار رہی تھی، جانتی تھی وہ ماں ہیں جو ہر دور میں ہر عمر میں اولاد کی ضرورت اور اس کی کمزوری ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ہی سہی وہ ان کے جال میں آتی چلی گئی اسے اپنی ماں مظلوم اور سچی لگنے لگی تھی اور حویلی والے ظالم اور جھوٹے اور پھر اپنی ماں کے کہنے پر اس نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا سب کی محبتیں بھلا کر وہ اپنی ماں کے پاس جا رہی تھی، وہ بہت بدگمان ہو رہی تھی، اسے ان سب کی محبت کھوکھلی اور دکھاوا لگ رہی تھی اور حویلی والے سب ششدر تھے، انہوں نے ہمیشہ زینب عذیر شاہ پر محبت لٹائی تھی اس نے نفرت کرنا کہاں سے سیکھ لیا تھا۔

وہ حویلی چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی اور پیچھے دا جان اس کے لئے تڑپتے اسے یاد کرتے یہاں تک کے انہوں نے اپنی صحت خراب کر لی تھی تب ہی مجبوراً آزاور شاہ کو اس کے پاس جانا پڑا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے میں خوشی خوشی آپ کے ساتھ چل پڑوں گی۔" انتہائی طنز بھرے لہجے میں کہتے اس نے آزاور شاہ کی طرف دیکھا تھا، جو اسے دا جان کی حالت کا بتا کر ساتھ لے جانے آیا تھا۔

"تم کس حیثیت سے اسے لینے آئے ہو؟" انیلہ زمان نے بھی غصے سے پوچھا تو اس نے بمشکل خود پہ کنٹرول کیا تھا۔

"شوہر ہوں میں اس کا۔" آزاور شاہ نے انہیں یاد دلایا تھا۔

"میں نہیں مانتی اس رشتے کو اب؟" آزاور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زینی نے جس بے خوفی سے کہا تھا، وہ ششدر ہی رہ گیا تھا، مگر دا جان کی بگڑتی حالت اور انہیں اچانک ہونے والا انجائنا کا اٹیک اسے ایک بار پھر زینب شاہ درخواست کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"پلیز زینب صرف ایک بار چل کر انہیں اپنی صورت دکھا آؤ۔" اس نے بہت نرمی سے کہا تھا۔

پہلی بار اس نے زینب کے چہرے پر اضطراب دیکھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی انیلہ نے بیچ میں مداخلت کر دی تھی۔

"انہیں ہر پندرہ بیس دنوں بعد ایسے ڈرامے کرنے کی عادت ہے اور اس بار تو ان کے پاس مضبوط ریزن بھی ہے تا کہ وہ چالاکی اور ہشاری سے زینب کو بلا سکیں اور پھر سے اسے اپنی حویلی میں قید کر سکیں اور اس کی جائیداد ہتھیا لیں، مگر انہیں بتا دینا کہ میں اب

ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دونگی۔“ اور وہ ناکام لوٹ آیا تھا۔

مگر اس بار وہ اپنے دل میں موجود زینب عذیر شاہ کے لئے موجود محبت کو نفرت میں بدلنے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

سچائی اور حقیقت کو برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوئی، چہروں پر پڑے نقاب جب الٹ جاتے ہیں تو انسان کے لئے اصل صورت کو دیکھنا بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے دھوکہ، انسان کسی سے بھی کھا کے اسے دکھ ہوتا ہے، تکلیف ہوتی ہے مگر دھوکہ انسان جب اپنوں سے کھائے تو پھر خود کو جوڑے رکھنا مشکل نہیں ناممکن بھی ہو جایا کرتا ہے، سچائیاں تلخ ہوتی ہیں مگر غلط وقت پر سامنے آ جائیں تو ناقابل برداشت بھی ہوتی ہیں۔

اس نے اپنے کانوں سے اپنی ماں کو اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ بیٹھ کر پلان ڈسکس کرتے سنا تھا، وہ اس کی شادی شیر زمان کے بھتیجے سے کروا کر اس کی تمام دولت اینٹھنے کے علاوہ الیاس شاہ کی طرف سے زینب شاہ کے نام کی جانے والی جائیداد کو حاصل کرنے کے نہ صرف خواب دیکھ رہے تھے بلکہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے اس پر کام بھی شروع کر چکے تھے، اپنے کانوں سے سب سن لینے کے باوجود زینب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے ٹریپ کیا ہے استعمال کیا ہے وہ ماں تھی ماں ایسی کیسے ہو سکتی ہے ماں تو بس ماں ہوتی ہے وہ بری ہو سکتی ہے غلط ہو سکتی ہے مگر اپنی اولاد کے لئے تو وہ بس ماں ہوتی ہے۔

حقیقت اس پر کھل چکی تھی مگر وہ صرف ایک حقیقت نہیں تھی جو اس پر کھلی اس پر رشتوں کی حقیقت کھلی تھی، اس پر اپنی حقیقت بھی کھلی تھی کیا تھی وہ ایک احمق، بیوقوف، جذباتی عقل سے پیدل لڑکی ایک احسان فراموش انسان، جسے محبتوں کی قدر نہیں تھی، اس کی ماں اسے اپنی راہ کا پتھر سمجھ کر ٹھوکر مار کر چلی گئی تھی، تب جنہوں نے اسے سنبھالا تھا، اسے محبت دی تھی، عزت دی تھی، وہ تا عمر اگر چاہتی تب بھی ان کا احسان نہیں اتار سکتی تھی اور الٹا اس نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا، بائیس سالوں کی محبت کو بھلانے میں اس نے بائیس منٹ بھی نہیں لئے تھے۔

بہت ساری ندامتوں کا بوجھ لئے وہ واپسی کے راستے پر گامزن تھی، وہ لوٹ آئی تھی اس کی طرف جو اس کا اصل تھا وہ لوٹ آئی تھی اس امید پر کہ وہ سب اس کی خطا تو اس کی غلطیوں کو معاف کر دیں گے اسے خود پر بھروسہ نہیں تھا کہ وہ ان سب کو منا لے گی، اسے ان سب پر یقین تھا کہ وہ اس سے ناراض نہیں رہ پائیں گے اور ان سب نے بھی تو اس کا یقین ٹوٹنے نہیں دیا تھا، ہاں مگر آزاور شاہ، کیا وہ بھی اس معاف کر پائے گا، اس کی غلطیوں کو بھول سمجھ کر بھول جائے گا، وہ محبت جو اس کے دل میں تھی کیا وہ اب بھی باقی ہے، سوال بہت سارے تھے اور جواب۔

☆☆☆

رشتے خون کے ہوں یا دل کے ان رشتوں میں تعلقات میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے وہ ہوتا ہے ”احساس“ اور رشتوں کو جوڑنے کے لئے جو چیز ضروری ہوتی ہے وہ ہوتا ہے اعتماد، بھروسہ، یقین اور

جن رشتوں میں سے یہ چیزیں اٹھ جاتی ہیں وہ رشتے کھوکھلی دیوار کی طرح ہو جایا کرتے ہیں۔

وہ دا جان کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی جب ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر چلا آیا تھا، زینب نے گردن موڑ کر دیکھا تھا اور وہ دونوں یوں آمنے سامنے آ کر جیسے ساکت ہو گئے تھے مگر دوسرے ہی پل وہ جھٹکے سے واپس جانے کے لئے مڑا تھا لیکن دا جان نے پکار لیا تھا وہ بادل نخواستہ مڑا تھا پھر ان کے بیڈ کے نزدیک آیا تھا، وہ انہیں ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ کے متعلق بتا رہا تھا جو اس نے ان کے لئے لی تھی، پہلی بے اختیاری کی نظر کے بعد اس نے آنکھ اٹھا کر بھی زینب شا کی طرف نہیں دیکھا اور......اور زینب شاہ نے ایک پل کے لئے بھی اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

اسے واپس آئے ایک ماہ سے زائدہ کا عرصہ ہو چکا تھا رفتہ رفتہ ہی سہی مگر سب کا رویہ پہلے جیسا ہو گیا تھا ان سب کے دل شاید نہیں یقیناً بہت کشادہ تھے، ہاں مگر وہ ایک شخص جس کا اس نے سب سے زیادہ دل دکھایا تھا اس سے وہ ابھی تک معافی نہیں مانگ پائی تھی۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے جب وہ کچن سے پانی لینے آئی تھی، باقی سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، گلاس میں پانی ڈال کے گھونٹ گھونٹ پیتے وہ وہیں کرسی پر بیٹھی نجانے کہاں گم تھی جب مضبوط قدموں سے چلتا وہ لاؤنج سے گزرا تھا۔

”شیداں میرا کھانا کمرے میں ہی لے آنا۔“ وہیں سے کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا، زینب نے کھانا گرم کر کے ٹرے میں رکھا پھر یہ دیکھے بنا کہ کچن میں شیدا نہیں زینب ہے، مضبوط ہاتھوں سے ٹرے تھامے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے آ رکی تھی، ایک ہاتھ سے ٹرے تھامتے دوسرے سے دروازہ کھٹکھٹاتے اس نے گہرا سانس لے کر خود کو کمپوز کیا تھا۔

”آ جاؤ۔“ بھاری آواز میں ملنے والی اجازت پر اس نے ہولے سے دروازے کھولتے اندر قدم رکھا تھا۔

”تم؟“ وہ جو فریش ہو کے اب بیڈ پر نیم دراز تھا اسے دیکھتے ہی جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا آج دوسری بار اس کا سامنا ہو رہا تھا، پہلی بار اس نے ایک بار کے بعد دوبارہ نظریں نہیں ڈالی تھی دوسری بار اسے دیکھتے ہی اس کی ہلکی گلابی آنکھوں میں نفرت کے کانٹے اگ آئے تھے اور زینب شاہ کو آج احساس ہوا تھا جن آنکھوں میں اپنے لئے ہمیشہ محبت دیکھی ہو ان آنکھوں کی نفرت سہنا دنیا کا سب سے کٹھن کام ہوتا ہے۔

”کیوں آئی ہو یہاں۔“ خود پہ کڑے ضبط کا پہرا بٹھاتے اس نے پوچھا تھا۔

”میم...... میں وہ کھانا۔“ اس کی خود پر جمی قہر بار نظر اسے مشکل میں ڈال رہی تھی، وہ آگے بڑھا تھا۔

”میں تمہاری شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں اتنی نفرت کرتا ہوں میں تم سے اور تم، تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارا لایا ہوا کھانا کھا لوں گا۔“ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ میں تھامی ٹرے لیتے اس نے سامنے دیوار پر دے ماری تھی، سفید دیوار داغ دار ہو گئی تھی اور وہ اس کی اتنی نفرت پر دنگ کھڑی تھی۔

☆☆☆

بدلتے موسم کا اثر بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح آزاور شاہ پر بھی ہوا تھا، ناسازی طبع کی بنا پر پچھلے دو دن سے وہ حویلی میں ہی تھا، سب ہی اس کی طبیعت پوچھنے اس کے کمرے میں گئے تھے اور زینب نے ہر بندے سے اس کی خیریت دریافت کی تھی، خود وہ اس کے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی ہاں البتہ اگلے دن سیڑھیاں چڑھتے اوپر سے اترتے آزاور شاہ کو اپنے مقابل دیکھ کر وہ خود کو روک نہیں سکی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' ڈرتے ڈرتے ہی سہی مگر اس نے کہہ دیا تھا اور آزاور شاہ کی فراخ پیشانی لمحوں میں سکڑی تھی۔

''ایک بات کہوں میرے سامنے مت آیا کرو میں برداشت کھونے لگتا ہوں۔'' سرد لہجے میں کہے گئے الفاظ نے اسے وہیں پتھر کر دیا تھا۔

چھ ماہ بعد دا جان نے اچانک ہی اس کی رخصتی کا فیصلہ کر لیا تھا وہ ان کے اس فیصلے پر پریشان ہو گئی تھی، تب انہوں نے اسے اپنے سامنے بیٹھا لیا تھا۔

''بعض دفعہ زندگی کو درست سمت میں لانے کے لئے کچھ مشکل فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں بیٹا، اور پھر میں جانتا ہوں وہ ابھی غصے میں ہے، مگر تم سے محبت بھی کرتا ہے اور مجھے معلوم ہے تم اپنی توجہ پیار صبر اور تحمل سے اس کا دل جیت لو گی۔'' ان کا لہجہ پر یقین تھا۔

''دل جیتنا آساں کہاں ہوتا ہے دا جان، وہ بھی تب جب ہم اس دل میں موجود محبت کو نفرت میں تبدیل کر چکے ہوں۔'' اس نے بند لبوں کے ساتھ خاموشی کی زباں میں کہا اور سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

آج وہ اس کے کمرے میں موجود تھی اور بڑی مضبوط حیثیت کے ساتھ موجود تھی، مگر بیچ میں بہت کچھ آ چکا تھا، اب اس کا ہونا نہ ہونا اس کے لئے برابر ہو گیا تھا، وقت نے کتنا کچھ بدل دیا تھا، کل اسے لگتا تھا کہ جب زینب عذیر شاہ اس کی زندگی میں آ جائے گی تو زندگی کتنی خوبصورت مکمل اور آسان ہو جائے گی، آج اسے لگتا تھا وہ اس کی زندگی میں نہ آتی تو اچھا تھا، وقت، حالات، لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں چیزوں پر رشتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یہ اس نے سنا تھا وقت اور حالات محبتوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، یہ اس نے آج دیکھا تھا۔

وہ مکمل طور پر اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ اسے اپنی گم تشنہ محبت کا قصہ سنائے یا وہ اسے اپنے دل میں موجود نفرت و بے زاری دکھائے، خفگی ناراضگی غصہ یا پھر خاموشی اور سمجھوتہ، تبھی وہ بیڈ سے اتر کر اس کے قدموں میں آ بیٹھی تھی، وہ بنا کوئی تاثر دیے کیے اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا تھا۔

''خطا کی ہے تو سزا کی بھی حقدار ہوں اور ہر سزا کے لئے تیار بھی، بہت پہلے کہیں پڑھا تھا انسان کے حصے کا سکون اور خوشی اس کے اپنے عمل میں ہی چھپی ہوتی ہے، آج یقین آ گیا، کچھ چیزیں جب تک پاس رہیں ان کی قدر نہیں رہتی دور چلی جائیں گم ہو جائیں، کھو جائیں تو چین سے نہیں دینے دیتی، جب تک آپ کی محبت پاس رہی میں انمول رہی جب گنوا بیٹھی تو بے مول ہو گئی، دل توڑنے، محبتیں اجاڑنے جیسے جرم پر معافی ملنی چاہیے یا نہیں میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں میرا دامن بہت چھوٹا تھا جو آپ کی محبتوں کو سنبھال نہیں سکا، مگر آپ کا ظرف بہت کشادہ ہے اس میں میری معافی سما سکتی ہے۔'' کہہ کر سر جھکا بیٹھ گئی، زوار شاہ بنا بولے اٹھا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹیرس پر کھڑا سگریٹ پھونکے جا رہا تھا، ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگ رہا تھا اور ساتھ ہی اسی شدت کے ساتھ اس کا دل بھی جل رہا تھا، کچھ چیزیں جتنی آساں دیکھتیں ہیں نظر آتی ہیں کرنے میں اتنی ہی مشکل ہوتی ہیں، جن سے محبت ہو ان سے بے رخی برتنا آساں نہیں ہوتا، اس کے لئے بھی نہیں تھا مگر ساتھ ہی اسے اپنی ذات کی تذلیل بھی نہیں بھول رہی تھی، وقت نے اسے عجب دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

''میں نے تم سے شادی سمجھوتے کے تحت کی ہے اور سمجھوتے آساں نہیں ہوتے، ابھی میں اپنے ظرف کو اتنا کشادہ نہیں پاتا کہ تمہیں معاف کر سکوں، اپنی تذلیل کو بھلا سکوں، ہاں شاید گزرتے وقت کے ساتھ ایسا ممکن ہو جائے، میں ماضی کی تلخیوں کو بھول کے تمہارے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر سکوں، ابھی میرے اندر بہت سی برف جم چکی ہے اسے پگھلانے میں عرصہ لگے گا۔'' وہ خود سے مخاطب ہوا۔

☆☆☆

دو سال گزر چکے تھے زینب عذیر شاہ آج بھی اس عزم اور حوصلے کے ساتھ اس انتظار میں تھی کہ کب برف پگھل جائے گی، ہاں البتہ بہت بار اس کا دل چاہا کہ کبھی آزاور شاہ سے سوال کرے کہ محبت تو خطاؤں کو معاف کرنے کا ظرف رکھتی ہے اس کی محبت کیسی تھی جو اس کی غلطی معاف نہیں کر سکی اور یہ سوچتے ہوئے وہ ہمیشہ بھول جاتی تھی وہ محبت ایک مرد کی محبت تھی اور مرد کی، محبت کا ناطہ ہمیشہ انا کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی
عادت ڈالیئے

ابن انشاء

طنز و مزاح، سفر نامے

اردو کی آخری کتاب
آوارہ گرد کی ڈائری
دنیا گول ہے
ابن بطوطہ کے تعاقب میں
چلتے ہو تو چلین کو چلئے

قدرت اللہ شہاب

یا خدا
ماں جی

بابائے اردو مولوی عبدالحق

قواعد اردو
انتخاب کلام میر

لاہور اکیڈمی
۲۰۵ سرکلر روڈ لاہور

زندگی ایک آنسو

مبشرہ ناز

فبای آلاء ربکما تکذبن: (تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

گیارہ سالہ سعد جمال کی آواز اس وقت ماحول کی عکاسی کر رہی تھی، فجر کا دھندلکا آسمان سے چھٹنے لگا تھا اور رب کی حمد و ثناء پر پھول پودے اور چڑیوں کے ساتھ بادلوں کے پیچھے چھپا سورج بھی بے تابی سے اس کی تلاوت سننے کے لئے گویا بیتاب نظر آ رہا تھا، سات سالہ لائبہ نے حسب معمول اسی آیت پر آنکھ کھولی تھی، اس نے صحن میں بچھے تخت پر لیٹے لیٹے اطراف میں نظر دوڑائی تو اس کی سیدھی نظر صحن کے دوسرے سرے پر رکھے تخت پر چلی گئی جہاں سعد جمال نہایت خوش الحالی سے سورہ رحمٰن کی تلاوت کر رہا تھا، لائبہ نے آنکھیں مسلتے ہوئے بغور سعد کو دیکھا ایک نور تھا جو اس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا اور اس نور سے سعد جمال کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا ابھی وہ بغور اسے ہی دیکھ رہی تھی جبھی ثمینہ جمال نے آ کر اس کی پیشانی چومی اور بکھرے بال سمیٹے تو وہ فرط محبت سے ان سے لپٹ گئی۔

''بیٹا نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے پہلے نماز پڑھ لو پھر سو جانا۔''

''اچھا تائی امی!'' وہ ان کے کاندھے میں مزید منہ چھپاتی ان سے لپٹ گئی، اس کی اس حرکت پہ دوسرے تخت پہ بیٹھا سعد جمال زیر لب مسکرا دیا۔

''اٹھ جاؤ بیٹا تمہارے تایا ابو تمہارے لئے حلوہ پوری لینے گئے ہوئے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔'' انہوں نے اسے حلوہ پوری کا لالچ دیا کیونکہ جانتی تھیں اس کی آنکھوں سے نیند پلک جھپکتے بھاگ گی اور وہ جھٹکے سے الگ ہوئی۔

''واقعی تائی امی!''

''جی بیٹا جانی!'' انہوں نے اس کی

مکمل ناول

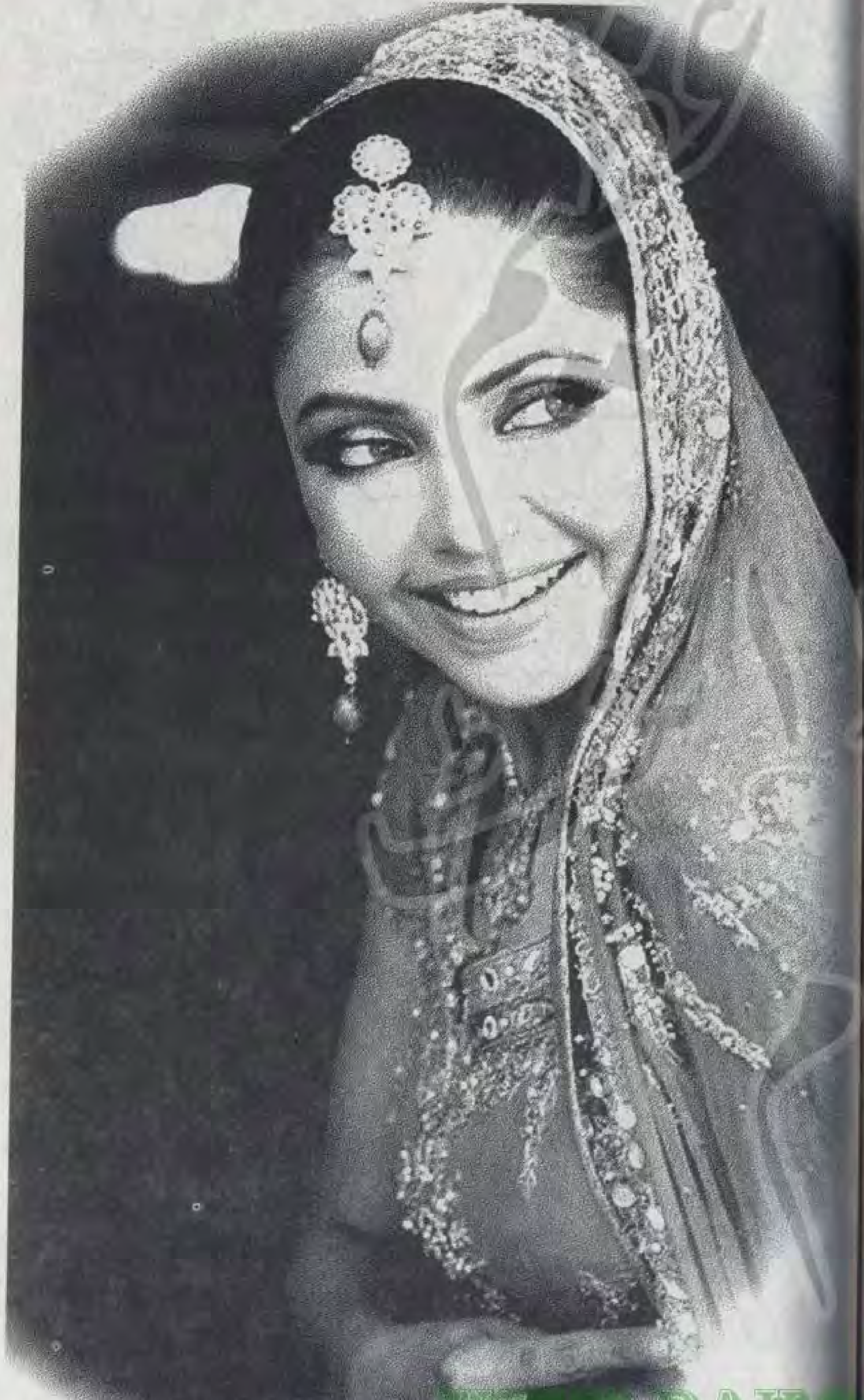

معصومیت بھرے انداز پہ اس کی پیشانی چومی۔

"پھر میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے تخت سے اتری۔

"صرف منہ نہیں دھونا بلکہ وضو کر کے نماز بھی ادا کرنی ہے، ورنہ حلوہ پوری نہیں ملے گی۔"

اسے تیزی سے اترتا دیکھ کر ثمینہ بیگم نے اسے دھمکی دی تو وہ منہ بسورتی کھڑی ہوگئی، اسے منہ بسورتا دیکھ کر جزدان میں قرآن پاک رکھتے ہوئے سعد کو بے اختیار ہنسی آ گئی اسے ہنستا دیکھ کر لائبہ نے گھور کر اسے دیکھا اور اسے منہ چڑاتی واش روم کی طرف بڑھ گئی اس کی اس بچکانہ حرکت پہ رضائی لپیٹتی ثمینہ بیگم اور دروازے سے داخل ہوتے جمال احمد بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

☆☆☆

گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر کی وجہ سے کالونی کے تمام مکین اپنے اپنے گھروں میں محو استراحت تھے، یہی وجہ ہے کہ کالونی میں چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی، لائبہ نے چہرے کے گرد اسکارف کو مزید سختی سے لپیٹا اور اِدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھ گئی اس نے احتیاط کے طور پر دوبارہ گلی کو دیکھا اور منہ میں موجود ببل گم کا بڑا سا غبارہ بنا کر شاہ پیلس کو بغور دیکھا، چوکیدار کھانا کھانے جا چکا تھا وہ دبے قدموں انٹر کام کی طرف بڑھی اور بنگلے کے باہر بنے انٹر کام پر اس نے انگلی رکھی اور دوسرے ہی پل وہ انٹر کام پہ سے انگلی ہٹا کر ببل گم اس پہ چپکا چکی تھی، انٹر کام اپنی مخصوص ٹیون میں بجنے لگا، مطلوبہ ہدف میں کامیابی دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی جنت لاج کی طرف بھاگتی چلی گئی، دھاڑ سے دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی ثمینہ بیگم اور سعد اسی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم تائی امی!" پھولی سانسوں اور شرارت سے چمکتی آنکھیں ہنسی اور ہدف میں کامیابی ملنے کی وجہ سے پانی سے لبریز ہوگئی تھیں اور پھر تو گویا ہنسی کا ایک فوارہ تھا جو اس کے لبوں سے پھوٹ پڑا تھا، ثمینہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ انہیں منہ ہاتھ دھونے کا اشارہ کرتی واش روم کی طرف بڑھ گئی جبکہ سعد جمال کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور وہ اس کی نظروں سے خائف ہوتی تیزی سے واش روم میں داخل ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر شرارت کی ذرا سی بھی بھنک سعد کے کانوں میں پڑ گئی تو پھر اس کی خیر نہیں کیونکہ شاہ پیلس اسکے دیرینہ دوست شاہ ذررحمٰن کا تھا جس سے لائبہ کو نہ جانے کیوں چڑ تھی۔

شام کی سنہری دھوپ جنت لاج کی درو دیوار کو چومتی الوداع کہہ رہی تھی، ثمینہ بیگم لائبہ کے سر میں تیل کا مساج کر رہی تھیں اور ان کی تیل میں ڈوبی نرم و نازک انگلیوں سے لائبہ کو نیند آنے لگی تھی۔

"بس تائی امی مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے ایک بار پھر اپنا آپ ان سے چھڑوانا چاہا۔

"اچھا بیٹا تھوڑی دیر اور رک جاؤ اور ویسے بھی دیکھو اب دھوپ ڈھلنے لگی ہے عصر اور مغرب کے درمیانی وقت سونا حدیث کی رو سے بھی منع ہے اور تمہارے تایا ابو کو بھی سخت ناپسند ہے۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی تو وہ جو بند آنکھوں سے بالکل ڈولنے لگی تھی یکدم بیدار ہوگئی، مگر آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

"السلام علیکم آنٹی!" سلام کی آواز پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کے دیکھا سامنے شاہ زررحمٰن کھڑا تھا۔

"وعلیکم السلام آؤ بیٹا!" ثمینہ بیگم نے اس کے بالوں کو کیچر سے جکڑا اور تخت سے اٹھ کر سن سے ہاتھ دھوتی اس کی طرف بڑھ گئیں، ں وہ مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

"خیریت بیٹا کس خوشی میں لے آئے۔" ینہ بیگم نے ڈبہ ہاتھ میں تھامتے ہوئے پوچھا بھی ان کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور مٹھائی کے ڈبے کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میرا قرآن پاک ختم ہوا ہے آنٹی!" شاہ رحمٰن نے شرماتے ہوئے بتایا تو اس کے رمانے پر لائبہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"گیلو تم نے اب قرآن پارک ختم کیا ہے یرا تو کب کا ہو چکا۔" اس نے ہنسی روک کر شاہ سے کہا اور دوبارہ ہنسنے لگی، اس کے ہنسنے پر ثمینہ نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ چہرہ جو پل بھر مسکراہٹوں سے جگمگا رہا تھا غصے سے اپنے ش بدلنے لگا، کیونکہ شاہ زررحمٰن کے سامنے جلال کی بے عزتی ہو یہ اسے کب گوارا تھا۔

"اپنی امی کو مبارکباد دینا بیٹا میں آؤں گی سے ملنے اور مبارکباد دینے۔"

"جی اچھا!" وہ سعادت مندی سے کہتا پلٹ گیا، اس کے جانے کے بعد ثمینہ بیگم خفگی سے اسے دیکھا اور اندر کی طرف بڑھ گویا یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ اس سے ہیں اور اب اس سے بالکل بات نہیں کریں لائبہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور وہیں پر نیم دراز ہوگئی، اس نے ایک نظر اٹھا کر بنے پورشن کی جانب دیکھا اور اندھیرے میں دیکھ کر دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

جمال احمد اور جلال احمد دو بھائی تھے، پانچ کا یہ مکان جو دنیا کی ہر آسائش سے پر تھا لاج کے نام سے جانا جاتا تھا، جوان دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ جنت بیگم کے انتقال پر وراثت میں تقسیم کرنے کے بجائے ازسر نو تعمیر کروایا تھا جمال احمد اور ثمینہ جمال کو خدا نے اپنی نعمت سعد جمال سے نوازا تھا، جلال احمد نے حبیبہ سے پسند کی شادی کی تھی وہ ان کی پرسنل سیکرٹری تھیں جو بعد میں ان کی شریک حیات بن گئی تھیں، ان دونوں میں جو ایک قدر مشترک تھی وہ پیسہ تھی، دونوں ہی بے تحاشہ پیسے کی متمنی تھے، یہی وجہ تھی کہ حبیبہ شادی کے بعد گھر سنبھالنے کے بجائے جلال احمد کے بزنس کو ترقی دینے کے لئے ان کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹانے گیں اسی اثناء میں ان کے گھر پیدا ہونے والی لائبہ نے بھی ان کے بے تحاشہ دولت کی خواہش کو کم نہ کیا بلکہ اسے مزید اجاگر کر دیا اور پیسے کی اس دوڑ دھوپ میں لائبہ نظر انداز ہونے لگی تو جمال احمد نے اس کی پرورش اپنے ذمے لے لی، جو تھے تو جمال احمد کے بھائی مگر قناعت اور خدا کے خوف جیسی دولت کے آگے ان کی نظر میں دنیاوی دولت ہیچ تھی، یوں ننھی لائبہ ثمینہ بیگم کے ہاتھوں پروان چڑھنے لگی وہ سارا دن نیچے کے پورشن میں رہتی اور رات کو ماں باپ کے آنے کے بعد ان کے ساتھ اوپر بنے اپنے پورشن میں چلی جاتی مگر جب عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے اسے ماں باپ کی نظر میں پیسے کے مقابلے میں اپنی اہمیت معلوم ہوئی تو اس نے اوپر کے پورشن میں غیر محسوس طور پر جانا کم کر دیا اب وہ رات کو ثمینہ بیگم سے لپٹ کر سوتی اور دن بھر فرمائش کر کے ان سے لاڈ اٹھواتی اس وقت بھی نہ جانے کیوں اوپر کے پورشن میں اندھیرا دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں حالانکہ جتنی محبت اسے ثمینہ اور جمال احمد سے ملی تھی اس کے ماں باپ کی محبت ان دونوں کے آگے عشر عشیر بھی نہ تھی یہی سوچتے سوچتے وہ نہ جانے

کب نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

جمال احمد اور سعد جس وقت عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آئے پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، صرف ثمینہ بیگم کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی انہوں نے حیرت سے اندھیرے میں ڈوبے گھر کو دیکھا اور ساری لائٹس آن کر دیں پورا گھر روشنیوں میں نہا گیا، صحن میں بچھے تخت پر لائبہ سو رہی تھی، الجھے بکھرے بال، متورم سوجی آنکھیں اور گالوں پہ بہتے آنسوؤں کے نشان جمال احمد نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی ان کے پیشانی چومنے پر اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں، سامنے تایا کو دیکھ کر اس نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر دوبارہ رونا شروع کر دیا اس کے رونے سے گھبرا کر جمال احمد نے اسے اپنے سے لپٹا لیا اس کے رونے اور جمال احمد کی آواز پر ثمینہ بھی گھبرا کر باہر آ گئیں باہر آ کر جو منظر دیکھا تو بے ساختہ مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی جسے انہوں نے کمال مہارت سے چھپا لیا اور لائبہ کو نظر انداز کر کے جمال احمد سے کھانے کی بابت پوچھنے لگیں، انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں، جمال احمد نے اپنے سے لپٹ کے روتی لائبہ کو الگ کیا اور اس کے اپنے پاس بٹھا کر رونے کی وجہ پوچھی۔

”تایا ابو میں نے تو کچھ نہیں کیا میں تائی امی سے تیل کا مساج کروا رہی تھی کہ شاہ زر مٹھائی لے کر آ گیا تو میں اسے دیکھ کر ہنسنے لگی اور میں نے صرف یہ کہا کہ تم نے اب قرآن ختم کیا ہے تو تائی امی نے پہلے مجھے مارا اور پھر مجھ سے ناراض ہو گئیں۔“ اس نے جمال احمد کے کاندھے پہ سر رکھ کر بات بتائی تو جمال احمد پہلے مسکرانے لگے پھر بولے۔

”اچھا چلو پہلے کھانا کھا لو۔“

”نہیں میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ اس نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔

”کیوں؟“ جمال احمد نے اٹھتے ہو اس سے پوچھا۔

”کیونکہ تائی امی مجھ سے ناراض ہیں اور جب تک مجھ سے بات نہیں کریں گی میں کھا نہیں کھاؤں گی۔“ اس نے ناراضگی سے کہ ہوئے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا، اس کی محبت جہاں جمال احمد مسکرائے تھے وہیں ثمینہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں انہوں نے تڑپ کر اسے گلے لگا لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں ناراض نہیں ہوں اپنی بیٹی سے لیکن پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ شاہ زر کو گپلو ڈبلو اور موٹو بالکل نہیں کہو گی۔“ انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس سے وعدہ لیا تو وہ جھٹکے سے الگ ہوئی اور حیرت سے بولی۔

”آپ کو کیسے پتہ میں اسے یہ سب کہتی ہوں مجھے تو اور کچھ بھی پتا ہے۔“ انہوں نے مبہم انداز میں کہا۔

”وہ کیا؟“

”کچھ نہیں چلو بس اب کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا اور منہ دھلا کر کمرے میں بچھے دستر خوان کی طرف آ گئیں دستر خوان بڑے قرینے سے سجا ہوا تھا، مگر دستر خوان پر مٹھائی کو نہ پا کر وہ چپکے سے اٹھی اور فرج میں سے مٹھائی نکال لائی۔

”تایا ابو دیکھیں شاہ زر مٹھائی لے کر آیا تھا۔“ مٹھائی کی شوقین لائبہ نے تیزی سے ڈبے سے شوخ رنگوں سے مزین کور اتارنا شروع کر دیا کور اتار کر اس نے ٹانگ کے نیچے دبا لیا، سنہرے کور کو ٹانگ کے نیچے رکھتے دیکھ کر جمال احمد نے حیرت سے استفسار کیا۔

”بیٹا کور تو آپ ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔“

”تایا ابو میں یہ اپنی ڈرائنگ بک میں جڑھاؤں گی۔“ اس نے فوراً بہانہ تراشا تو وہ اطمینان سے سر ہلا گئے، سعد نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا جسے اس نے سرعت سے نظر انداز کر دیا، مٹھائی کھانے کے بعد ثمینہ بیگم دستر خوان سمیٹنے لگیں، جلال احمد اور حبیبہ جمال حسب معمول بزنس ڈنر میں گئے ہوئے تھے، ثمینہ کے ساتھ دستر خوان سمیٹنے کے بہانے اس نے وہ ڈبہ تخت کے نیچے جا کر چھپا دیا، اس ڈبے سے بہت اہم کام لینا تھا اور وہ تخریبی عمل سوچ کر اس کے لب بے اختیار مسکرا اٹھے۔

☆☆☆

اسکول کی گھنٹی بج رہی تھی، وہ سائیکل کے پیڈل پہ تیز تیز پیر مارنے لگی لائبہ نے یکدم رک کر پیچھے مڑ کر دیکھا سعد گھنٹی کی آواز سننے کے باوجود نہایت سکون سے سائیکل چلا رہا تھا۔

”سعد!“ لائبہ نے اسے پکارا۔

”جلدی کرو اسکول کی بیل ہو چکی ہے اسمبلی شروع ہو جائے گی۔“ لائبہ نے اس کی توجہ بیل کے ساتھ اسمبلی کی طرف مبذول کروائی مگر سعد ہنوز اسی اطمینان سے سائیکل چلاتا اس کے پاس سے گزر گیا، اسکول پہنچنے کے بعد لائبہ بے تابی سے بریک ٹائم ہونے کا انتظار کرنے لگی جوں ہی گھڑی کا ہندسہ دس پر پہنچا بریک کی گھنٹی بج گئی، گھنٹی کی آواز سن کر لائبہ یوں بھاگی جیسے پھانسی کے مجرم کو رہائی کا عندیہ مل گیا ہو، اسکول کے میدان میں اس وقت ایک ہنگامہ برپا تھا، بچے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، لڑکیاں گروپ بنا کر بیٹھی تھیں باتیں کم اونچے اونچے قہقہے زیادہ لگا رہی تھیں، بہت سے طالب علم اپنی خاموش طبیعت کے باعث صرف وہاں کے نظارے کر رہے تھے، کالونی سے باہر یہ اسکول اپنے تعلیمی نظام کی وجہ سے بہترین شہرت کا حامل تھا یہی وجہ تھی کہ بچپن سے یہاں زیر تعلیم ہونے کی وجہ سے آج لائبہ 8th سٹینڈرڈ اور سعد 10th اسٹینڈرڈ میں تھے، لائبہ نے اسکول گیٹ کے دوسری طرف بنی ندی کو دیکھا جو کبھی ٹھنڈے میٹھے پانی کے لیے مشہور تھی مگر اب ایک جوہڑ کی شکل اختیار کر گئی تھی اور اس گندے جوہڑ میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے، مینڈک حتیٰ کہ کبھی کبھی ننھے منھے کیچوے بھی نظر آتے تھے، لائبہ نے جوہڑ کو بغور دیکھا اور ایک ہی جست میں باہر چھلانگ لگا دی اس نے یونیفارم کی پاکٹ سے شاپنگ بیگ نکالا جوہڑ کے باہر پھدکتے مینڈک کو اس بیگ کی مدد سے پکڑ کر پاکٹ میں ڈال لیا مینڈک جیب میں جا کر مزید اچھلنے لگا مگر لائبہ نے اس کے اچھلنے کی پرواہ کیے بغیر اسکول کے اندر دوڑ لگا دی، کلاس میں جا کر اس نے سب سے پہلے رات میں رکھے جانے والا مٹھائی کا خالی ڈبہ نکال کر اس میں شاپنگ بیگ رکھا اور بالوں میں لگی پونی ٹیل کھینچ کر اس سے مضبوط کر دیا گویا اگر ڈبے کو مضبوطی نہ ملی تو مینڈک پھدک کر باہر نکل آئے گا، کلاس سے باہر آ کر اس نے جیب سے دوسری پونی ٹیل نکال کر پونی بنائی اور کینٹین کی طرف بڑھ گئی، کینٹین کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اسے پیکنگ کا ٹائم نہ ملا تو وہ ڈبہ شاہ زر کو ایسے ہی دے دے گی اور وہ اتنا سادہ لوح دوسرے معنوں میں بے وقوف ہے کہ اسے شاید پیکنگ کی ضرورت بھی نہ ہو، یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئی چھٹی کے وقت وہ سعد اور شاہ زر آگے پیچھے اپنی سائیکلوں پر سوار تھے جبھی لائبہ

نے یکدم شاہ پیلس آنے پر جان بوجھ کر زمین پہ پاؤں رکھ کر سائیکل کو ڈس بیلنس کیا سائیکل تیز رفتاری کے باعث فوراً بے توازن ہو کر لائبہ سمیت زمین پہ گر گئی اسے گرتے دیکھ کر شاہ زر اور سعد نے بھی اپنی سائیکلیں روک دیں۔

''کیا ہوا لائبہ؟'' سعد نے قریب آ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں سعد بس گرمی کی وجہ سے چکر آ گیا۔'' اس نے فوراً بہانہ بنایا۔

''اب کیا کریں۔'' سعد نے شاہ زر سے پوچھا تو وہ بے وقوفی سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب کیا کریں تمہاری کزن ہے تم خود سوچو میں کیا سوچوں۔'' اس نے لاپرواہی سے ناک سے مکھی اڑائی اور اس کی لاپرواہی پر لائبہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

''ڈفر گھر کے اندر آنے کی آفر بھی نہیں کر رہا۔'' لائبہ نے اسے دل میں کوسا اور چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''شاہ اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لا دو۔''

''ہاں شاہ یہ ٹھیک رہے گا پانی پی کر کچھ تو حالت سنبھل ہی جائے گی۔'' سعد نے تفکر سے اسے دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی تو مجبوراً شاہ زر کو اپنا بیگ اور سائیکل ان دونوں کے پاس چھوڑ کر اندر جانا پڑا، کیونکہ مجبوری یہ تھی کہ چوکیدار بھی کام سے گیا ہوا تھا شاہ زر کے جانے کے بعد سعد قریبی درخت کے سائے میں ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، لائبہ تیزی سے کھسکتی ہوئی شاہ زر کے بیگ کے پاس گئی تھی بجلی کی تیزی سے کا ہاتھ اپنے بیگ میں گیا اور پھر ہاتھ میں موجود ڈبہ اسی تیزی سے شاہ زر کے بیگ میں منتقل ہو گیا۔

کھٹکے کی آواز پر وہ یکدم سیدھی ہوئی جبکہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سعد بھی اس کے قریب آ گیا، پانی پی کر وہ سعد کے سہارے سے کھڑی ہوئی سعد نے اس کے کاندھے سے بیگ اتار کر اپنے دوسرے کاندھے پر منتقل کر دیا۔

''تھینک یو شاہ اللہ حافظ۔'' سعد نے شاہ زر سے ہاتھ ملا کر الوداعی کلمات کہے اور اپنی سائیکل لے کر آگے بڑھ گیا، لائبہ بھی سائیکل کا ہینڈل تھام کر کھڑی ہو گئی۔

''تھینک یو شاہ پانی پلانے کے لئے۔'' (وہ بھی سعد کی دیکھا دیکھی اسے شاہ کہتی تھی کہ)

''تھینک یو سو مچ مجھے یقین ہے یہ تھینکس تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔'' لائبہ مسکراتی ہوئی سائیکل تھامے آگے بڑھ گئی اور شاہ زر گلاس ہاتھ میں تھامے اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہ گیا اسے یقین تھا لائبہ نے اتنا کچھ بلاوجہ نہیں کہا اس اسپیشل تھینکس کے پیچھے یقیناً کچھ اسپیشل تھا اور یہ اسپیشل کیا تھا اس تک شاہ زر رحمٰن کے ذہن کی رسائی ممکن نہ تھی۔

فرینڈ شپ پارٹی میں جانے کے لئے تیار ہو کر لائبہ ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی شاہ زر کی متوقع حالت سوچ کر اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی جبھی دروازہ کھول کر سعد اندر داخل ہوا وہ اس وقت اوپر کے پورشن میں اپنے بیڈ روم میں تھی سو اس وقت خلاف توقع اور خلاف عادت بغیر اجازت کے سعد کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر یکدم تشویش کا شکار ہو کر نیل پالش کا مشغلہ ترک کر کے کھڑی ہو گئی، وہ اس وقت بالکل تیار تھی بے بی پنک کلر کی آرگنزا فراک چوڑی دار پاجامے میں وہ بالکل چائنیز ڈول لگ رہی تھی، کانوں میں ننھے ننھے آویزے اور ہاتھوں میں بھر بھر کر چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا سعد خیریت ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔'' سعد کو مستقل پیچھے ہاتھ باندھا دیکھ کر وہ بھی تشویش کا شکار کھڑی ہو گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' سعد نے ہاتھ میں موجود ڈبہ بیڈ پہ پھینکا تو ڈبہ بیڈ پہ گر کر کھلنے سے اس میں موجود مینڈک پھدک کر باہر آ گیا۔

''سعد!'' وہ چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

''یہ تم نے شاہ کو کیوں دیا تھا تمہیں معلوم ہے ناں وہ کتنا معصوم اور سادہ انسان ہے پھر بھی اسے تنگ کرنے میں تم کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہو۔''

''سادہ نہیں بے وقوف۔'' لائبہ نے زیر لب اس کی تصحیح کی، جسے سعد نے بخوبی سن لیا۔

''شٹ اپ لائبہ شرم آنی چاہیے تمہیں وہ تم سے بڑا ہے۔''

''صرف تین سال۔'' لائبہ نے نخوت سے کہا۔

''مجھے تمہاری ہر شرارت کا علم ہے اگر میں نظریں چرا لیتا ہوں یا چچا جان کو کچھ نہیں بتاتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نقصان پہنچانے والی حرکتیں شروع کر دو۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہاں اگر وہ ابھی تک ماما از چائلڈ ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' لائبہ نے دوبارہ نخوت اور بے پرواہی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تو سعد کو اس کی بے پرواہی اور اپنی بات کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر غصہ آ گیا اس نے لائبہ کی کلائی تھامی اور نیچے کی طرف بڑھ گیا جہاں خلاف توقع جمال احمد اور جلال احمد ساتھ بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے، سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ حبیبہ بھی ان کے ساتھ بیٹھی خوشدلی سے باتیں کر رہی تھیں سعد جو لائبہ کو زبردستی کھینچتا ہوا نیچے لا رہا تھا جمال احمد کی آواز پر یکدم رک گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے سعد تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ لڑکیوں سے کیسے بات کی جاتی ہے۔'' ان کے بہنوں کے بدلے لڑکیوں کہنے پر سعد نے چونک کر انہیں دیکھا انہوں نے آج تک لائبہ کو اس کی بہن ہی کہا تھا لیکن آج باپ کے منہ سے لفظوں کے بدلاؤ نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا، اس کے چونکنے پر لائبہ تیزی سے ہاتھ چھڑاتی جمال احمد کے کاندھے سے جا لگی، اسے جمال احمد کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بھی سیدھا جلال احمد کے پاس تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آیا تھا وہ اس کے باپ کی لاڈلی تھی تو سعد بھی جلال احمد کا کم لاڈلا نہ تھا وہ عموماً لائبہ پر سعد کو ہی فوقیت دیتے تھے۔

''چچا جان اپنی لاڈلی کو سمجھا بھی لیں اور سنبھال کر بھی رکھیں اس کی شرارتیں اب نقصانات کی حدود بھی پار کرنے لگی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' جمال احمد اور جلال احمد کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو سعد نے اس کی مینڈک والی تخریب کاری ان کے گوش گزار کی اور ہاتھ میں تھما وہ پرچہ بھی دکھایا جو اس ڈبے میں سے نکلا تھا، جمال احمد نے وہ پرچہ اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھا تو بے ساختہ ان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اگر آئندہ میری شرارتوں کی مخبری کی تو انجام اس سے بھی بھیانک ہو گا۔''

''کیوں بیٹا کون کون سی تھیں وہ شرارتیں جن کی شاہ زر نے مخبری کی۔'' جمال احمد اپنے کاندھے سے لگی لائبہ سے جھک کر پوچھا تو وہ نظریں جھکا گئی اس کے جواب نہ دینے پر سب کی نظریں سعد کے طرف اٹھیں سب کو سعد کی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے کان پکڑ کر ہاتھ جوڑے تو

اس کی حرکت پر وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں بابا جان چھوڑیں بس اس نے وعدہ کرلیا ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" سعد کے بزرگانہ انداز پر جہاں سب کی ہنسی نکل گئی وہیں لائبہ کا منہ بن گیا۔

☆☆☆

زندگی کسی ٹھنڈے میٹھے چشمے کی طرح رواں تھی جس میں لائبہ کی شرارتیں ان میں تلاطم پیدا کر دیتیں تو سعد کی خفگی اور سنجیدگی سے بھری زندگی میں اپنے لئے محبت اور عقیدت دیکھ کر اسے اپنے احساسات بدلتے محسوس ہونے لگے، لائبہ 10th اسٹینڈرڈ میں آ گئی تھی جبکہ سعد اپنی خوبصورت آواز کی دولت ملکی سطح پر مدعو کیا جانے لگا تھا، پہلے وہ صرف اسکول کی حد تک قرأت و نعت پڑھتا تھا، مگر پھر اس کی آواز کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی تو اسے شہری سطح کے بعد اب ملکی و غیر ملکی سطح پر مدعو کیا جانے لگا۔

جنت لانج میں سب سے پہلا دھماکہ اس وقت ہوا جب جلال احمد نے دوبئی جانے کا اعلان کیا جس نے بھی یہ اعلان سنا وہ ساکت ہو گیا جمال احمد اپنی جگہ ساکت تھے، جبکہ لائبہ نے جب دوبئی جانے کی خبر سنی تو وہ بھاگتی ہوئی ثمینہ سے آ کر لپٹ گئی۔

"تائی ایم پلیز میں کہیں نہیں جاؤں گی میں آپ کے پاس رہوں گی پلیز تائی امی مجھے تو آپ کے بغیر نیند بھی نہیں آتی۔" وہ ہسٹریک انداز میں کبھی ثمینہ کے پاس جاتی کبھی جمال احمد کے پاس اور کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ سعد کے پاس آ گئی۔

"پلیز سعد تم بابا کو سمجھاؤ میں تم لوگوں کو بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ روتے روتے وہیں اس کے پیروں میں بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی وہ 10th اسٹینڈرڈ میں آ گئی تھی مگر لاڈ و محبت کی وجہ سے اس کی حرکتیں بالکل بچوں جیسی تھیں ان کو سسک سسک کر روتے دیکھ کر ثمینہ اپنے آنسو چھپاتی کمرے میں چلی گئیں سعد نے اسے بازوؤں سے سہارا دے کر اٹھایا اور جمال احمد کے پاس لا کر بٹھا دیا۔

"تم بے فکر ہو جاؤ لائبہ بابا تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے اور جہاں تک چچی جان کی بات ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بابا کی کوئی بھی بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔" اس کو تخت پہ بٹھا کر سعد نے اسے سمجھایا اور پانی کا گلاس لا کر تھمایا، خاموشی گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی تھی جب یہ خاموشی جلال احمد پر منکشف ہوئی تو وہ سیدھے جمال احمد کے پاس آ گئے جہاں بھائی کی جدائی اور بھتیجی کی تڑپتی حالت نے انہیں ان کی عمر سے دوگنا کر دیا تھا۔

"السلام علیکم بھائی جان!" جمال احمد جو کسی سوچ میں گم تھے یکدم چونک گئے۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا، ان کے بیٹھنے پر انہوں نے پاس کھڑی ثمینہ کو حبیبہ کو بھی بلانے کا حکم دیا، تھوڑی دیر بعد حبیبہ، ثمینہ کے ساتھ ہی آ گئیں، جمال احمد نے ہاتھ کے اشارے سے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئیں، جمال احمد کی خاموشی سے ثمینہ کے ساتھ حبیبہ اور جلال احمد کو بھی خوف محسوس ہونے لگا، انہوں نے اپنے بھائی کو زندگی میں کبھی اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

"جلال احمد اور حبیبہ تم دونوں کا دوبئی جانے اور وہیں سیٹل ہونے کا ارادہ اٹل ہے۔" انہوں نے جلال احمد کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بھائی جان!" انہوں نے مؤدبانہ انداز میں بھائی کو جواب دیا۔

"ویزا اور پاسپورٹ تیار ہو گیا؟"

"ج...... ج...... جی بھائی جان۔" انہوں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا کیونکہ وہ بھائی کی سنجیدگی کے علاوہ اب بھائی کے سوالوں سے بھی پریشان ہو گئے تھے۔

"ایک فیصلہ تم نے کیا جسے ہم نے قبول کیا اور ایک فیصلہ میں کروں گا مجھے امید ہے کہ تم بھی اسے قبول کرو گے۔"

"کیسا فیصلہ؟" جلال احمد نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

"لائبہ اور سعد کے نکاح کا فیصلہ۔"

"جی!" ایک بم تھا جو دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی لائبہ اور اس کے پیچھے کھڑے سعد کے علاوہ حبیبہ اور جلال احمد پہ پھٹا تھا، مگر ثمینہ بیگم کے چہرے پہ پھیلے اطمینان نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے اس فیصلے سے انجان نہیں تھیں وہ شوہر کی مزاج آشنا تھیں جبھی ان کی خاموشی کے پیچھے چھپے محرک کو جان گئیں تھیں۔

"یہ کیا فیصلہ ہے بھائی جان!" حبیبہ نے یکدم اختلاف کیا جسے جمال احمد نے سرعت سے نظر انداز کر دیا۔

"تم نے مجھ سے اور اماں جی کی یادوں سے جدائی کا فیصلہ کیا تو میں نے قبول کیا مگر لائبہ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے اس لئے میں اسے خود سے کچھ عرصے کے لئے تو جدا کر سکتا ہوں مگر ساری زندگی کے لئے نہیں بولو تمہیں میرا فیصلہ قبول ہے یا اختلاف ہے۔" جلال احمد نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا جہاں لہجہ میں چٹانوں جیسی سختی تھی مگر آنکھوں میں نمی کے ساتھ التجا تھی، اس پل ہر فیصلہ بیوی کے مشورے اور مرضی کو مقدم کو جاننے والے جلال احمد نے بھائی کے دل میں اپنی اولاد کی محبت اپنے سے کئی گنا زیادہ دیکھی تو ان کا دل پانی پانی بن گیا، وہ بے ساختہ اٹھ کر جمال احمد کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

"مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے اور صرف یہ فیصلہ نہیں بلکہ آپ جو حکم کریں گے مجھے وہ بھی منظور ہے کیونکہ آپ صرف میرے بھائی نہیں ہے بلکہ میرے باپ بھی ہیں آج میں جو کچھ بھی ہوں اماں جان کی دعاؤں کے بعد آپ کی محبت سے ہوں بھائی جان!" جلال احمد ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح رو دیئے ان کو اس طرح روتے دیکھ کر جمال احمد کی آنکھوں میں چھپے نہ جانے کب کے آنسو نکلنے کو بے تاب ہو گئے اور قطار در قطار ان کے گالوں پہ پھسلتے چلے گئے، ثمینہ بیگم، لائبہ اور سعد کی آنکھیں بھی آنسو بہا رہی تھیں اور سب سے بڑی بات اس پل جیٹھ اور جٹھانی کو اپنے آگے کچھ نہ سمجھنے والی حبیبہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے، نکاح ہو چکا تھا، سب لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے اور اپنی خوشی و سرمستی میں سب ہی باہر آ گئے جہاں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا کمرے میں اب صرف دو نفوس باقی رہ گئے تھے، نازک سی کم عمر سولہ سالہ لائبہ اس وقت پور پور سجی ہوئی تھی، سعد بھی سفید کلف لگے شلوار قمیض میں خوبرو لگ رہا تھا، سعد نجانے کس سوچ میں گم تھا، وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی جبھی قریب آ کر پہلے اس نے جھک کر نہایت عقیدت سے سعد کے ہاتھ تھامے جھک کر ان کو بوسہ دیا پھر بولی۔

"سعد میں تمہارا یہ احسان جو تم نے مجھے واپس اس گھر میں آنے کے لئے اپنے نام کی

زنجیر سے باندھ کر کیا ہے کبھی نہیں بھولوں گی بلکہ اس احسان کے بدلے تم نے کبھی مجھ سے میری جان بھی مانگ لی تو میں کبھی انکار نہیں کروں گی یہ میرا صرف تم سے نہیں بلکہ خود سے بھی وعدہ ہے۔" سعد نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں کو جہاں اب تک اس کے ہاتھ لائبہ کے ہاتھ میں تھے اس پل وہ نٹ کھٹ سی لائبہ نہیں بلکہ خوابوں اور خواہشوں کو اوڑھنے والی سنجیدہ لڑکی لگ رہی تھی، اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ لائبہ کے ہاتھوں سے نکالے اور اس سے فاصلے پر کھڑا ہو گیا، وہ اکیس سال کا نوجوان تھا بیوی کے روپ میں اس نے ہمیشہ تصور میں لائبہ کو ہی دیکھا تھا لیکن یہ تصور اتنے جلدی حقیقت کا روپ دھار لے گا اس کی اسے بالکل امید نہ تھی اور نہ اس بات کو اس پل اس کا ذہن قبول کر پا رہا تھا کہ وہ صرف تصوراتی نہیں بلکہ حقیقت میں اس کی بیوی بن چکی ہے اس نے ایک چور نظر لائبہ پہ ڈالی جہاں وہ حیرت سے اور الجھن بھری نظروں سے اس کے سپاٹ تاثرات اور جھکے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی سعد یکدم شرمندہ ہو گیا اور اسی شرمندگی کو کم کرنے کے لئے وہ لائبہ کے قریب آیا اس نے اس کے دونوں کاندھوں پہ ہاتھ رکھے اور اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"یہ احسان نہیں لائبہ بلکہ بابا جان کی خواہش تھی اور میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ چچا جان کبھی بھی بابا جان کی خواہش نہیں ٹالیں گے"

"اور تمہاری۔" لائبہ نے بے ساختہ پوچھا تو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سعد نے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا۔

"ہاں میری بھی۔" کہہ کر باہر نکل گیا، جبکہ اس کے لفظوں کے بدلے اس کا سنجیدہ اور قطعیت بھرا لہجہ اس پل لائبہ کے دل میں ترازو ہو گیا۔

☆☆☆

جناح ٹرمنل میں اس وقت بے انتہا گہما گہمی تھی، فلائٹ شیڈول کی اناؤنسمنٹ کی جا رہی تھی ساتھ ہی معطل ہو جانے اور لیٹ ہو جانے والی پروازوں پر معذرت بھی کی جا رہی تھی، گاڑی پارکنگ میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ اندر ٹرمنل میں چلے گئے، جبکہ گاڑی کو سعد پارکنگ میں جگہ تلاش کر کے پارک کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد جب وہ ان لوگوں کے قریب آیا تو وہ سب ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے کیونکہ اسی وقت اسلام آباد جانے والی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی تھی، انہیں پہلے کراچی سے اسلام آباد جانا تھا جہاں اسلام آباد سے ان کی فلائٹ دوبئی پہنچنی تھی، لائبہ، ثمینہ سے گلے ملنے کے بعد اب جمال احمد کے کاندھے پہ سر رکھے آنسو بہا رہی تھی۔

"اب تو تائی امی کے بغیر نیند آ جائے گی ناں سعد کے خوابوں کے ساتھ۔" ثمینہ بیگم نے اسے چھیڑا تو وہ مزید ان کے کاندھے میں منہ چھپا گئی اور اس کے منہ چھپانے پر سب ہی مسکرا دیئے، جلال احمد، سعد سے گلے مل چکے تھے، بھتیجے کے ساتھ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ دیکھ کر وہ بہت خوش تھے، حبیبہ نے بھی سعد کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دعا دی تو ان دونوں کے آگے بڑھنے پر لائبہ کنفیوژ سی سعد کو خدا حافظ کہنے کے لئے اس کی طرف بڑھ گئی۔

"خدا حافظ سعد!"

"اللہ حافظ لائبہ اپنا بہت خیال رکھنا اپنے لئے نہیں بلکہ میرے لئے۔" اس نے جھک کر سرگوشی کی۔

"اور یہ تمہارے لئے۔" سعد نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تو وہ حیرت سے اس کے الفاظ اور گفٹ پر اسے دیکھنے لگی سعد نے اس کی حیرت کو یقین میں بدلنے کے لئے مسکرا کر گردن ہلائی تو وہ گفٹ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی، ڈیپارچر لان کراس کر کے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آنکھوں میں چھائی آنسوؤں کی دھند میں اسے کچھ بھی نظر نہ آ سکا اور سعد جمال سے وہ دھند مخفی نہ رہ سکی تھی۔

جہاز ٹیک آف کر چکا تھا اور اس کے ٹیک آف ہوتے ہی لائبہ کے آنسوؤں نے مزید بند باندھنے سے انکار کر دیا، کراچی سے اسلام آباد تک کا سارا سفر اس نے بند آنکھوں کے ساتھ روتے ہوئے گزار دیا، اسلام آباد کی سرزمین پہ اترتے ہوئے اس کے آنسو تھم چکے تھے، کالی سیاہ آنکھیں رونے سے سوج سی گئی تھیں، وہ لوگ ائیرپورٹ سے منسلک ہوٹل میں آ گئے کیونکہ ابھی دوبئی کی فلائٹ روانہ ہونے میں چار سے پانچ گھنٹے باقی تھے، ہوٹل کے کمرے میں جاتے ہی اسے نے شاور لیا اور پھر سونے کا ارادہ کر کے بیڈ پہ آ کر لیٹ گئی مگر نیند پلکوں سے روٹھ چکی تھی اس کے بدلے آنکھیں ایک بار پھر جل تھل ہونے کے لئے بے تاب ہونے لگیں، بیڈ پہ لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نہ جانے کب روتے روتے سو گئی اسے پتا ہی نہ چلا، اس وقت وہ سعد کا گفٹ تک بھول گئی تھی جو اس نے آتے ہوئے اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا اس وقت بھی وہ گہری نیند میں تھی جب حبیبہ نے آ کر اسے اٹھایا، وہ مندی مندی آنکھوں سے اٹھ بیٹھی پہلے پہل تو دماغ سوچنے سے ہی قاصر رہا کہ وہ کہاں ہے اور جب دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو نہ جانے کیوں آنکھیں ایک بار پھر جلنے لگیں مگر حبیبہ کے پکارنے پر وہ آنکھیں رگڑتی باہر نکل آئی جہاں وہ دونوں ائیرپورٹ جانے کے لئے اسی کے منتظر تھے۔

دوبئی ایئرپورٹ پر اتر کر وہ اپنے آپ کو کافی فریش محسوس کر رہی تھی کیونکہ اسلام آباد سے دوبئی تک کا سارا سفر اس نے سو کر گزارا تھا، ائیرپورٹ سے کیپ ہائر کر کے وہ لوگ سیدھے الفاسٹی پہنچے تھے جہاں بہت خوبصورت اپارٹمنٹ بنے تھے، اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو حیرت و خوشی میں گھر گئی وہ اپارٹمنٹ اس کے تصور میں بھی زیادہ خوبصورت فرنشڈ اور ویل ڈیکوریٹ تھا، پانچ کمروں اور بڑے ہال پر مشتمل پنک اور اسکن کا مبنیشن سے سجا وہ گھر اسے کوئی تصوراتی محل لگ رہا تھا، ہوش کی دنیا میں وہ اس وقت آئی جب اسے حبیبہ کی آواز سنائی دی جو کھانا لگنے کی اطلاع کر رہی تھیں، ائیرپورٹ کے قریب بنے ریسورنٹ سے جمال احمد نے رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کے علاوہ اسٹور سے دیگر ضرورت کا سامان بھی خرید لیا تھا، کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی، بے بی پنک کلر اسکیم سے سجا وہ بیڈ روم بہت خوبصورت تھا، اس نے کمرے میں آ کے کھڑکی سے پردے ہٹائے تو سامنے ہی دوبئی کا روشنیوں سے جگمگاتا ٹریفک تھا، وہ کئی پل مبہوت سے اسے دیکھتی رہی جبھی کسی خیال کے تحت وہ وہاں سے ہٹ گئی بیڈ پر آ کر اس نے پہلے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سعد کا گفٹ نکالا، بیڈ پہ گفٹ رکھ کر وہ کتنی دیر تک اپنے آپ کو یہ یقین دلاتی رہی کہ یہ اسے سعد نے ہی دیا ہے، سعد جمال جو پہلے صرف اس کا کزن تھا مگر اب اس کا شوہر اور محرم راز بھی تھا، اس نے گفٹ پہ سے ریپر اتارا تو اندھر سے ایک جیولری کیس نکلا، اس

نے کیس کو کھولا تو اس میں ہارٹ شیپ کا ایک لاکٹ رکھا ہوا تھا، لائبہ نے اسے اٹھا کر ہاتھ میں لیا تو وہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اس کے کھلنے پر لائبہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس کے اندر بنے تصویری خانے میں سعد نے اپنی اور اس کے نکاح کی تصویر لگا رکھی تھی، اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی شیشے میں نظر آتے عکس کو دیکھ کر لاکٹ گلے میں ڈالا اور بیڈ پہ رکھا کارڈ اٹھا لیا جس میں سعد کی ہینڈ رائٹنگ میں بہت خوبصورت نظم لکھی تھی۔

تمہیں بخشی ہے دل پہ حکمرانی اور کیا دیتے
یہی تھی بس ہماری راجدھانی اور کیا دیتے
ستاروں سے کسی کی مانگ بھرنا اک فسانہ ہے
تمہارے نام لکھ دی زندگانی اور کیا دیتے
وہ ہم سے مانگتا تھا عمر کا اک دلنشین حصہ
نہ دیتے اس کو ہم اپنی جاودانی اور کیا دیتے
بچھڑتے وقت اس کو ایک نہ اک تحفہ تو دینا تھا فراز
ہمارے پاس تھا آنکھوں میں پانی اور کیا دیتے

نظم پڑھ کر خوشی سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے کتنا گہرا اور پیارا شخص تھا جسے خدا نے اس کے لئے منتخب کیا وہ بے اختیار سجدہ شکر کے لئے گر گئی۔

☆☆☆

وہ جس وقت امریکی طرز کی جدید جیپ سے اترا تو سامنے کھڑے آفیسرز نے اس کم عمر خوبصورت سنت نبوی سے سجے چہرے کو دیکھا اور اسے سلیوٹ کر کے مصافحہ کیا اور جانے کا اشارہ کر دیا نوجوان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر آفیسر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا کر اسے یقین دلایا اور آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے واپس جیپ میں جا کر بیٹھ گیا، چند پل اسے یقین ہی نہیں کہ آیا وہ دنیا کی بدنام زمانہ جیل سے چھوٹ آیا ہے یا ابھی تک وہیں ہے، بے یقینی سے اس نے دھول اڑاتی دور جاتی جیپ کو دیکھا اور اس بے یقینی کو یقین میں بدلنے کے لئے اس نے بے ساختہ بھاگنا شروع کر دیا، جس وقت اسے آفیسرز سے رہائی ملی اس وقت آدھی رات کا وقت تھا، بھاگتے بھاگتے وہ ایک درہ تک پہنچ گیا اس کی سانس بری طرح پھول چکی تھی اور پیاس سے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے جب اسے احساس ہوا کہ وہ ملکی حدود میں داخل ہو گیا ہے تو وہ بے دم ہو کر زمین پہ گر گیا، آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے محسوس ہوا وہ پہاڑیوں کی گود میں بنے اس درے کی پتھریلی زمین پہ نہیں بلکہ اپنے خوبصورت بیڈ روم میں لیٹا ہوا ہے، آنکھیں بند کیے اسے لیٹے ہوئے نجانے کتنی دیر بیت گئی، رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی پو پھٹنے سے آسمان کے آنچل پہ ٹکے ننھے ننھے ستارے آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے، بادلوں کے پیچھے سے بلند و بالا پہاڑوں کو منور کرنے کے لئے شاہ خاور نے اپنی کرنیں پھیلانی شروع کر دی تھیں، آسمان پہ اٹھکیلیاں کرتے بادل چلتی ہوا کے ساتھ شوخ و شنگ شرارتوں میں مصروف تھے، پرندے بھی خدا کی حمد و ثناء میں مصروف تھے سبک خرامی سے چلتی ہوا نے اللہ کے شیروں کو عقیدت و احترام سے دیکھا اور انہیں نہایت نرمی سے چھوتی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

نماز فجر ادا کی جا چکی تھی، نمازی اللہ کے حضور دعا مانگ رہے تھے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں رواں تھیں تو ساتھ ہی زبان سے اللہ کی تعریف کے ساتھ اس سے التجائیں اور شہادت کی آرزو کے ساتھ وطن عزیز کی حفاظت کی دعاؤں کے ساتھ آنسوؤں ان کے چہروں کو چومتے خاک بسر ہو رہے تھے، دعا مانگنے کے بعد ان سب نے چہروں پہ ہاتھ پھیرا اور امیر کی معیت میں چل پڑے، اچانک نعرہ تکبیر بلند ہوا اور چاروں طرف سے دشمن کے کیمپ پر گولیوں کی بارش ہونے لگی، زمین و آسمان پر ایک ساتھ ہونے والی حمد و ثنا کے خوبصورت منظر نے اس کے قدموں میں جو زنجیر ڈال دی تھی وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے یکدم ٹوٹ گئی اس نے اطراف میں مدد کے لئے نگاہ دوڑائی مگر سوائے گولیوں کی بارش کے کچھ بھی نظر نہیں آیا، جبھی اس نے تیزی سے برستی گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے ایک چٹان کے دہانے پر چھپ کر پناہ لے لی، تقریباً آدھا گھنٹہ بعد جب گولیوں کی بارش بند ہوئی تو فضا ایک بار پھر نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی وہ دم سادھے چٹان سے لپٹ کر کھڑا ہوا تھا نہ جانے کون سا خوف تھا جو اسے یکدم اپنے اردگرد محسوس ہونے لگا تھا جبھی وہ ایک مردانہ آواز پر چونکا۔

”کون ہو تم اور یہاں کیوں چھپے ہوئے ہوں؟“ وہ خاموش رہا۔

”تم کہیں دشمن ملک جاسوس تو نہیں ہو۔“ نو وارد نے مشکوک نظر سے اسے دیکھا مگر وہ اب بھی خاموش تھا جب اس شخص نے اس نوجوان پر ایک بھرپور نظر ڈالی وہ بائیس سال کا ایک کم عمر اور خوبصورت نوجوان تھا، اس کے سیاہ بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے جبکہ سرمئی آنکھوں میں چھپی حیرت و خوف کی کیفیت اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کے ساتھ چہرے پہ سجی سنت نبوی گواہ تھی اس بات کی کہ وہ کہیں سے بھی ملک دشمن جاسوس نہیں لگ رہا تھا نو وارد جس کا نام مجاہد ابو صالح تھا، اس نے ہاتھ میں موجود رائفل کاندھے سے لٹکائی اور محبت سے اسے شانوں سے تھام کر امیر کی سمت میں چل پڑا تھوڑی دیر تک چند مختلف سڑکوں اور راہداریوں سے گزرنے کے بعد ابو صالح اسے ایک پہاڑی نما گھائی میں لے آیا، جہاں اسی جیسے پر نور اور سنت نبویؐ سے سجے چہرے غالباً نماز شکرانہ ادا کرنے کی تیاریوں میں تھے۔

”السلام علیکم یا امیر المجاہد!“

”وعلیکم السلام ابو صالح! خیریت تم کہاں چلے گئے تھے حالانکہ تم جانتے تھے نماز شکرانہ اور پھر نماز ادا کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔“ سفید رنگ کے سادہ لباس میں سرخ و سفید رنگت والا وہ باریش شخص ابو صالح سے شکوہ کرنے کے ساتھ محبت بھری ڈانٹ سے نواز رہا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں امیر المجاہد مگر دشمنوں کے نشانات پر ان کے اڈوں کی معلومات کے ارادہ سے نکلا تھا کہ اس نوجوان سے ملاقات ہو گئی میں ایک بار پھر اجازت نہ لینے پہ معافی کا طلبگار ہوں۔“ ابو صالح نے نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ جواز پیش کر کے ایک بار پھر معافی مانگی۔

”ابو صالح مجھے تمہارے خیالات اور ارادے جان کر خوشی ہوئی مگر تمہیں ہم کو اپنے ارادے سے آگاہ ضرور کرنا چاہیے، خیر تم کون ہو نوجوان اور دشمن کے علاقے کے ساتھ یہاں موت کی وادیوں میں کیسے چلے آئے۔“ وہ ابھی بھی انہیں ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا، ان کے چہروں پہ پھیلا نور اور اطمینان اس بات کا گواہ تھا کہ وہ لوگ اپنی زندگیوں سے مطمئن ہیں اور ان کے چہروں پہ پھیلے اطمینان نے اسے بہت متاثر کر دیا تھا اور اسی کیفیت کے زیر اثر وہ ان کے سوالات کے جوابات دیتا چلا گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''سعد جمال۔''

''یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟''

''مجاہد بننے۔''

''مجاہد کیوں بننا چاہتے ہو؟ امیر المجاہد کے سوال پر وہ بولا۔

''کس لئے بنا جاتا ہے مجاہد اور آپ کیوں بنے ہیں۔'' سعد نے الٹا انہی سے سوال کیا تو امیر المجاہد ابوبکر نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ اس کی آواز میں چھپی بے بسی اور لہجے میں نمی اس کے چہرے سے مترشح تھی، اس لئے کچھ بھی پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اسے سمجھانا چاہا۔

''دیکھو نوجوان تمہارا جذبہ قابل تحسین ہے مگر تم ابھی اپنے ماں باپ کی امیدوں اور خوابوں کا مرکز ہو اور پھر اس منزل کا مسافر بننے کے لئے تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔'' جنگ بدر میں شرکت کرنے کے لئے اللہ کے نبی نے معاذ اور معوذ کی عمر نہیں دیکھی تھی امیر المجاہد اور ویسے بھی میں بائیس سال نو ماہ اور دس دن کا ہو چکا ہوں۔''

اس کے جذبات و احساسات کے ساتھ اپنی عمر دنوں اور مہینوں کے حساب سے بتانے پر وہاں پہ موجود تمام لوگوں کے چہروں پہ بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی، چند لمحوں بعد امیر المجاہد ابوبکر نے کھڑے ہو کر ابو صالح کو قریب بلایا اور اسے مہمان خانے میں لے جانے کے ساتھ کھانے پینے کی ہدایت کر کے خود امامت کے لئے تھوڑے فاصلے پر بچھی صفوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

دھندلی سی دسمبر کی سرد شام
جیسے ٹھہری سی گئی ہے
یادوں کے در کھل گئے ہیں
آنکھوں سے آنسوؤں کی
جھڑی لگ گئی ہے
اور ان آنسوؤں کی برسات میں
تیرا ہی عکس ہے
خوب صورت باتیں حسین یادیں
بالکل اس دل کش شام جیسی
آہستہ آہستہ مجھے گھائل کر رہی ہیں
اتر رہی ہیں میرے دل میں
تیری سب ملاقاتیں
اور
تیرے سنگ گزری شامیں
وہ سب جیسے اس سرد شام سے
منسلک ہیں
اور یہ شام میرے دل کو
اور زخمی کر رہی ہیں

وہ پچھلے کئی دنوں سے ابو صالح کے ساتھ تھا اس نے کافی حد تک ٹریننگ لے لی تھی مگر ابو صالح اس کی اداس آنکھوں اور خاموشی کا راز نہیں جان پایا تھا، اس وقت بھی سعد پہاڑ کے دہانے پہ بیٹھا ہوا تھا، ثمینہ و لائبہ اور جلال احمد کی یاد اس شدت سے حاوی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے کنارے گیلے ہونے لگے تھے، ابو صالح اسے بولنے پر اکساتا مگر وہ ہوں ہاں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا مسکراہٹ تو اس کے لبوں پہ بدلی کے پیچھے چھپے چاند کی طرح جھب دکھا کر غائب ہو جاتی تھی، اس وقت بھی وہ دونوں ایک چٹان پہ بیٹھے ہوئے تھے ہوا نہایت سبک انداز میں ان دونوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔

''سعد تمہیں یاد ہے کہ جب تم یہاں آئے تھے تو امیر صاحب نے تم سے ایک سوال کیا تھا۔''

''کیا؟'' سعد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہی کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور مجاہد کیوں بننا چاہتے ہو، کیونکہ مجاہدوں کی زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی خاردار راستوں پہ سفر کر کے رشتوں کی جدائی سہنے کے بعد عدن (جنت کا مقام جو شہیدوں کے لئے بنایا گیا ہے) ملتی ہے۔''

سعد نے خاموش نظریں چٹان کے گرد پھیلے پتھروں پہ جما دیں اس وقت یہ ایک کرب سے گزر رہا تھا اپنوں کی جدائی اور ظلم کی وہ راتیں اس پہ بہت شدت سے حاوی ہوئی تھیں اور ابو صالح نے انجانے میں اس کے دکھوں اور ظلم و ستم سے ملنے والے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔

''اگر تم نہیں بتانے چاہتے تو کوئی بات نہیں۔'' ابو صالح نے نرمی سے اس کے شانے تھپکے تو وہ اس کی آواز اور لہجے کی نرماہٹ کو نظر انداز نہیں کر سکا اور اس سے لپٹ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، ابو صالح نے اسے کسی معصوم بچے کی طرح اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا اور سعد نے روتے روتے ابو صالح سے کچھ نہ چھپایا لائبہ کی شرارتیں، اس کی سرزنش، جلال احمد کی محبتیں اور خفگی بھری ڈانٹ، ثمینہ کی محبتیں بولتے ہوئے گویا اسی گھر میں پہنچ گیا تھا۔

''جلال چچا کے جانے کے بعد پورے گھر میں اداسی کا راج تھا ہر شخص اپنی جگہ لائبہ کی اور اس کی شرارتوں کو یاد کرتا، مگر منہ سے اقرار نہ کرتا، امی جان کی حالت اس کی جدائی سے بے حد خراب رہنے لگی تھی، وہ دسمبر کے آخری دن تھے جب مجھے ایک وفد کی طرف سے انڈونیشیا جانے کی پیشکش ہوئی، میں امی جان کی وجہ سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن پھر بابا جان کے اصرار پر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے اور میں اس وعدے پر انڈونیشیا جانے پہ رضا مند ہو گیا کہ وہ امی جان کی بیماری سے چچا جان کو آگاہ کر کے ان کو واپس آنے پہ رضا مند کریں گے یا کم از کم لائبہ کو ضرور واپس بھیج دیں گے میری حسب خواہش انہوں نے وعدہ کر لیا یوں میں وفد کے ساتھ انڈونیشیا روانہ ہو گیا جہاں سے ہمیں تقریب کے لئے جکارتہ جانا تھا کیونکہ نعت خوانی کی تقریب وہیں منعقد ہونی تھی، وہ ملاقات میری اپنے والدین سے آخری ملاقات تھی۔'' بولتے بولتے اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں، ابو صالح نے اس کے کاندھے کے گرد ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے سے لگا لیا اور ابو صالح میں بڑے بھائی کی محبت اپنائیت اور شفقت محسوس کر کے وہ بچوں کی طرح رو دیا، ابو صالح نے اسے رونے دیا کچھ دیر بعد جب وہ رو رو کر تھک گیا تو خاموش ہو گیا، ابو صالح نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ لگائے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح سعد کی آنکھ کھلی تو اپنے قریب ابو صالح کو نہ پا کر وہ پریشان ہو گیا، ان چند دنوں میں ابو صالح اسے اپنا سایہ محسوس ہونے لگا تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک جان دو قالب والا رشتہ بن گیا تھا، وہ بستر کی چادر پہ بنی لکیروں پہ ہاتھ پھیر دیا تھا، جبھی ابو صالح ناشتے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا پھر اسی اصرار و محبت سے اسے ناشتہ کروایا جو اس کی محبت کا خاصہ تھی، ناشتہ کرنے کے بعد ابو صالح کے اصرار پہ اس نے دوبارہ بتانا شروع کیا۔

''وہ نو جنوری کا دن تھا میں انڈونیشیا جانے والی فلائٹ کے انتظار میں ائیر پورٹ کے ویٹنگ روم میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبھی ایف بی آئی کا ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور ہمیں اپنے ساتھ چلنے پہ اصرار کرنے لگا، ہم نے انکار کیا تو سر پہ لگنے والی بھاری بندوق نے

آنکھوں کے آگے اندھیرے کی چادر تان دی، دو دن اور دو راتیں ہم نے آنکھوں پہ پٹی باندھ کے سفر کیا، جب آنکھوں سے پٹی ہٹی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے اپنے ملک میں ہیں اور نہ انڈونیشیا میں بلکہ ہم دنیا کی بدنام زمانہ جیل بگرام پہنچ چکے تھے، میں اپنے ساتھیوں سے کم عمر تھا میرے جسم پہ کپکپی طاری ہونے لگی اور دل لرزنے لگا لیکن شاید قدرت کو ہم پر رحم آ گیا اور ہم اس خونخوار جیل کا حصہ نہ بن سکے اور ہمیں ایک بار پٹیاں باندھ کے سفر کرنا پڑا تھا میرے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور پورا چہرہ بعد میں نقاب سے ڈھک دیا گیا تھا بگرام جیل کو دیکھنے کے بعد جب مجھے میرے ساتھیوں کے ساتھ بگرام سے قندھار لے جایا گیا تو میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو بدترین سلوک کے لئے تیار کر چکا تھا، مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب کن مراحل سے گزرنا پڑے گا، میرا نقاب اتار دیا گیا تاہم بیڑیاں بدستور پاؤں میں موجود رہیں اور مجھے متعدد محافظوں اور طبی عملے کے سامنے تلاشی لی گئی اور تلاشی کے بعد مجھے اگلی منزل پہ اسی حالت میں لے جایا گیا میرا رخ دروازے کی جانب تھا اور تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں تھیں میری ذاتی زندگی جاننے کے بعد وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد میں نے ذرا غور سے اس قید خانے کا جائزہ لیا یہ ایک بہت بڑی فیکٹری تھی جو اب زیر استعمال نہیں تھی سابق سوویت یونین کے اجڑے خوابوں کی نشانی، جب وہ اسلام اور مغرب کا دشمن تھا وہاں ٹوٹی پھوٹی مشینری کے پرزے بکھرے ہوئے تھے، قندھار کی طرح یہ قید خانہ بھی ہر وقت فلڈ لائٹ میں نہایا ہوا ہوتا تھا، سونے کے لئے مجھے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپنا پڑتا تھا، ہتھکڑیوں کے ساتھ سونے میں دشواری پیش آتی تھی بعد میں مجھے ہتھکڑیوں سے آزاد کر دیا گیا، ابتدائی چند ہفتوں تک مجھے یہی محسوس ہوا کہ پوری عمارت میں صرف بیس بائیس قیدی ہی ہیں لیکن دو چار دن کے بعد مجھے ایک نیا قیدی نظر آ جاتا میری کوٹھڑی جس کا نمبر چار تھا اس میں میرے ساتھ چار قیدی تھے ایک تاجک ڈاکٹر، ایک ایرانی طالب علم اور دو افغان ڈرائیور تھے بائیں طرف کوٹھڑی میں مجھے چھ قیدیوں کی جھلک نظر آئی جس کے نام مجھے اس تاجک ڈاکٹر نے بتائے تھے اور ان میں ایک سن رسیدہ افغان و ایک بوڑھا فلسطینی ایک سعودی اور ایک مصری تھے، اگرچہ بات چیت کرنے پر پابندی تھی لیکن ہم لوگ پھر بھی ایک دوسرے سے شناسائی کے لئے ٹوٹی پھوٹی عربی اور انگریزی میں بات چیت کر لیا کرتے تھے، تاجک اور ایرانی ڈاکٹر سے بھی اردو میں گفتگو ہو جاتی تھی، ان سب نے مجھے بتایا کہ وہ وہاں ایک ہفتے سے بند ہیں، وہ بھی اتنے ہی مضطرب اور پریشان تھے جتنا میں تھا، دوسرے قیدی چونکہ عمر میں زیادہ اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے انگریزی نہیں جانتے تھے، انہیں بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ میں مترجم کے بغیر بہت آسانی سے انگریزی میں گفتگو کر سکتا ہوں تو وہ محافظوں اور جیل کے عملوں تک اپنی گزارشات پہنچانے کے لئے مجھے وسیلہ بنانے لگے، زندگی کا کام گزرنا ہے سو وہ گزر رہی تھی کبھی سخت کبھی نرم مجھے وہاں آئے چار ماہ ہو چکے تھے مئی کے مہینے میں مجھے ایف بی آئی اور سی آئی اے کے تفتیش کنندگان کا سامنا کرنا پڑا جو مجھے نہ جانے کیوں بالکل پسند نہیں کرتے تھے، ان کی ناپسندیدگی کی وجہ نہ میں کبھی سمجھ سکا اور نہ کبھی جان سکا، ایف بی آئی کے دو ایجنٹوں نے پہلے جرح کا سلسلہ شروع کیا انہیں یقین تھا کہ میں بہت بڑی اور خوفناک

سازش میں شامل ہوں جس میں کسی بھی پوپ کو قتل سے لے کر یورپ میں القاعدہ کے کسی بھی امور کی نگرانی شامل تھی اور ان کا یہ خیال بھی تھا کہ میں القاعدہ میں باقاعدہ انسٹرکٹر کے فرائض بھی انجام دیتا ہوں، لیکن تم تو بہت کم عمر ہو ان کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" ابو صالح نے اس کے تسلسل کو روک کر یکدم سوال کیا تو سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا گویا اسے ابو صالح سے اسی سوال کی امید تھی۔

"میں نے بھی ان سے یہ سوال کیا تھا لیکن ان کا جواب تھا کہ القاعدہ اور طالبان کے مجاہدین اپنے بچوں کو چونکہ پیدائش سے ہی بندوق کی آواز سنواتے ہیں اور بچپن میں کھلونے کے طور پر بندوقیں تھماتے ہیں تو اتنی کم عمری میں انسٹرکٹر بن جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔" سعد نے مسکرا کے سوال کا جواب دیا تو ابو صالح نے سر ہلا کر اسے بات جاری رکھنے کو کہا۔

"انہیں میرے بارے میں صرف انسٹرکٹر ہونے کا شبہ ہی نہیں بلکہ مارشل آرٹ اور کمپیوٹر میں مہارت رکھنے کا خدشہ ہونے کے ساتھ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ میں بہت سی زبانیں روانی سے بول سکتا ہوں لیکن ظاہر نہیں کرتا اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں ان سب الزمات کو قبول کر لوں اگر میں اس مضحکہ خیز اور المناک صورتحال کا اسیر نہ ہوتا تو یقیناً یہ سب میں بہت انجوائے کرتا اس لئے میں نے ایک بار ان سے کہا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں آپ سے اپنا (Resume) لکھنے کی درخواست کروں کیونکہ ان صفحات کے ساتھ تو مجھے کہیں بھی بہت اچھی اور بہت آسانی سے جاب مل سکتی ہے۔" انہوں نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ انہیں ایک قیدی کے ذریعے معلومات ملی ہیں کہ میں الفاروق نامی کیمپ میں القاعدہ کے ایک سرکردہ رکن کے علاوہ انسٹرکٹر کی حیثیت سے بھی تھا اور چونکہ میری شناخت بھی بتانے والے قیدی کی طرح پاکستانی تھی سو انہیں اس مفروضے کو یقین میں بدلنے کے لئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ تھی۔

"سعد تم بتاؤ تم لوگ کیا منصوبہ بنا رہے تھے۔" ایف بی آئی کا ایجنٹ جس کا نام نیل تھا اس نے مجھ سے سوال کیا میں ان کی چونکہ غائب دماغی یا پھر یوں سمجھو اپنی ذات میں خود پسندی کی حد تک پوچنے کی صفت کو جان چکا تھا سو میں نے بھی مطمئن ہو کر کہا۔

"عربی زبان کی کلاسیکی تحریروں کا اردو میں ترجمہ کرنا، نہیں یہ والی بات نہیں، اس کا دوسرا ساتھی جس کا نام مارٹی تھا اس نے چلا کر کہا۔"

"تمہیں معلوم ہے ہم کیا کر رہے ہیں اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ اعتراف کر لو کہ تم خودکش حملے کی تیاری کر رہے تھے تم ان حملوں میں کس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"آپ کیسی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے یا تو آپ نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی ہے یا پھر فلمیں بہت دیکھ رکھی ہیں۔" میرے جواب پر مارٹی جو اپنے ہاتھ میں ایک فولڈر لے کر کھڑا ہوا تھا میرے پاس آیا۔

"تم ایک بہت خود غرض اور کمینہ آدمی ہو سعد جمال تمہیں اپنے بوڑھے باپ کا اور بیوی کا کوئی خیال نہیں ہے، ذرا سوچو تمہاری موت سے ان پر کیا بیتے گی ماں تو تمہاری پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ چکی ہے۔" اور مارٹی کے الفاظ پر مجھے لگا ہر جگہ اندھیرا چھانے لگا ہے امی جان لائبہ کے بعد میری جدائی برداشت نہیں کر سکیں اور یہ دنیا ہی چھوڑ گئیں، میں ان کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا

میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہا تھا، میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا لیکن وہ اس سب کو میری کیفیت سمجھنے کی بجائے اداکاری سمجھ رہے تھے اس لئے سب لوگ باہر چلے گئے سوائے مارٹن کے وہ مجھے بہت دیر تک گھورتا رہا اس نے مٹھی بھینچ کر انگوٹھا اٹھایا اور پھر قیصر روم کی طرح فرش کی طرف جھکا دیا مطلب موت میرا مقدر بن چکی ہے، یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، ماں کی موت کو یاد کر کے سعد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"کتنا بدنصیب ہوں ناں میں ابو صالح کہ نہ میں امی جان کا آخری دیدار کر سکا اور نہ ان کی میت کو کاندھا دے سکا اور نہ ہی ان پر آخری مٹی ڈال سکا۔" ابو صالح نے اس کی بھیگی آنکھیں اور لرزتے ہونٹ دیکھے تو اسے گلے لگا لیا ان چند دنوں میں اسے ویسے ہی وہ بہت عزیز ہو گیا تھا اور اب کفار کے کیے جانے والے مظالم سن کر تو وہ اسے عزیز تر ہو گیا تھا، اتنی کم عمری میں اس نے کتنے غم اور کتنی سختیاں دیکھ لی تھیں یہی وجہ تھی کہ پہلی نظر میں اس کے چہرے پہ پھیلی معصومیت اس کی سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے متضاد لگتی تھی، ابو صالح نے اسے تھوڑی دیر کے لئے سونے کی ہدایت کی اور اس پہ چادر ڈال کے باہر چلا گیا، اس وقت سعد جمال کا غم اسے اپنے اندر اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

شام کی نرم دھوپ پہاڑوں اترنے لگی تھی آج وہ دونوں پھر پہاڑ کے دہانے پہ بیٹھے ہوئے تھے، سعد نے ابو صالح کے کہنے سے پہلے ہی خود بتانا شروع کر دیا شاید وہ بھی غم ہلکا کرنا چاہتا تھا، تنہائیوں اور اندھیری راتوں میں کفار کے دیے زخم اسے دکھانا چاہتا تھا۔

"مارٹن کے حکم پر مجھے ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا، محافظوں نے میرے ہاتھ پشت پہ باندھ دیئے دونوں ٹانگوں کو جوڑ کر انہیں زنجیر سے باندھا اور اسے ہاتھوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا پھر انہوں نے میرے چہرے پہ نقاب چڑھا دیا نقاب کا پچھلا سرا اتنی مضبوطی سے کسا گیا تھا کہ میرا دم گھٹنے لگا، پھر انہوں نے میری پشت اور سر پہ ٹھوکروں کی بارش کر دی، میں گٹھڑی بنا فرش پہ پڑا ہوا تھا میری کلائیاں اور ٹخنے بار بار آہنی زنجیروں سے ٹکراتے تھے اور مجھے لگتا کہ میرے ہاتھ پیروں کی ہڈیاں بس ٹوٹنے ہی والی ہیں اپنے گٹھڑی نما وجود کو کسی ایسی پوزیشن میں لانا ناممکن تھا کہ جس کے لئے مجھے قرار آ جاتا، فرش پہ ایک پتلا سا قالین بچھا ہوا تھا اور اوڑھنے کے لئے میرے پاس ایک ہلکی سی شال تھی ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی اس لئے مجھے اندازہ ہی نہ ہوتا کہ دن کب نکلتا ہے اور رات کب ہوتی ہے اس کمرے میں تقریباً ایک ماہ قید رہا ایک بار انہوں نے مجھے دو دن اور دو راتیں جگائے رکھا لیکن اپنے کسی عمل میں کامیابی نہ ہوتی دیکھ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا لیکن اس وقت میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوتا گیا، مجھے جس وقت ہوش آیا اس کے کچھ دیر بعد مجھے ایک عورت کی چیخیں سنائی دیں وہ چیخیں اتنی دل سوز تھیں کہ نجانے کیوں میرے ذہن میں پہلا خیال لائبہ کا ہی آیا، چونکہ ان لوگوں سے کچھ بعید نہ تھا، انہوں نے واضح طور پر یہ خدشہ میرے ذہن میں نقش کر دیا تھا امی جان کے انتقال کے بعد میں لائبہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور نہ کوئی تکلیف دینا لیکن میں بے بس تھا مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے اپنی رپورٹوں اور اپنے جواب دینے والوں کو یہی کہا ہو گا کہ یہ شخص اپنی فیملی کے

ذریعے راہ راست پر آسکتا ہے، دو دن اور دو راتیں مجھے وہ چیخیں سنائی دیتی رہیں مجھے محسوس ہونے لگا میرا دماغ کام کرنا چھوڑ چکا ہے، طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آنے لگے ایک بار پھر چیخوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے سوچا کہ کسی طرح اپنی کلائیوں کو زنجیروں سے آزاد کروا کے دروازہ کے سامنے کھڑے محافظ سے ہتھیار چھین کر اگلے دروازے میں گھس کر اس انجان عورت کو اذیت سے نجات دلا دوں پھر خیال آیا میں اس وقت بے بس بھی ہوں اور ان کے رحم وکرم پر بھی، میرے پاس سوائے دعا کے کوئی سہارا کوئی وسیلہ نہیں ان کا کفار سے نپٹنے کا، اس لئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ جھوٹ موٹ دہشت گردی کے کسی منصوبے میں شریک ہونے کا اعتراف کرلوں یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے میں کسی بھی معاملے میں ان کا گواہ بننے پر تیار ہو گیا میں نے ان سے پوچھا آپ نے اس کوٹھڑی میں کسی عورت کو کیوں بند کر رکھا ہے، انہوں نے کہا اس کوٹھڑی میں کوئی عورت نہیں لیکن میں جان چکا تھا جھوٹ اور مکاری ان یہودیوں کی فطرت تھی، مجھے ان کے جواب پر یقین نہیں آیا اور وہ چیخیں ایک عرصے تک خواب بن مجھے ڈراتی رہیں جب میں گوانتا پہنچا تو مجھ سے پہلے آنے والے قیدیوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی وہاں کسی عورت کی چیخیں سنی تھیں۔ وہ اس کی نجات کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔"

"جب ہم بگرام سے چلے تو ہمیں پہننے کے لئے ایک جیکٹ اور نارنجی رنگ کی کیپ دی گئی ہمارے سر کے بال پہلے ہی استرے سے صاف کردیئے گئے تھے، میں گاڑی میں مسلسل دو دن تک پابہ زنجیر فرش پہ بیٹھا رہا تھا میں کسی خواب آور دوا کے زیراثر تھا اس لئے مجھے علم ہی نہیں ہو سکا کہ کب ہم نے بگرام سے گوانتا موبے پہنچے، سمندر کی خوشبو اس بات کی غماز تھی کہ ہمارا نیا ٹھکانہ سمندر کے کنارے ہے مجھے کیمپ ایکوری رکھا گیا تھا، جو خطرناک مجرموں کے لئے بنایا گیا تھا اور میں ان کے لئے صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ شاید ناقابل شکست بھی تھا، میرے نئے گھر کا رقبہ آٹھ فٹ ضرب چھ فٹ تھا اسلام میں مایوسی کو گناہ قرار دیا گیا لیکن اس دھاتی پنجرے کو دیکھ کر مجھ پر ایک بار پھر مایوسی طاری ہونے لگی تھی اس کوٹھڑی میں مجھے صرف ایک چادر اور ایک ٹوائلٹ پیپر کا رول دیا گیا تھا، میں نے ان سے کہا مجھے کوئی ایسی چیز لا دو جس پہ میں نماز پڑھ سکوں تو انہوں نے مجھے ایک چٹائی دے دی جو میرے لئے نیند سے رابطے کا اور عرب سے رابطہ جوڑنے کا ذریعہ بنی رہی، دو سال تک میں اس چٹائی کو میٹرس کے طور پر استعمال کرتا رہا گزشتہ ایک سال کے دوران مجھے پہلی مرتبہ پکا ہوا کھانا نصیب ہوا، تین دن بعد شام کو جے نامی شخص جس نے مجھے بتایا تھا کہ اب بگرام سے مجھے گوانتا موبے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ بگرام میں ایف بی آئی کے ایجنٹ تھے، مارٹی اور نیل وہ میرا اعتراف نامہ، لکھ کر لائے تھے جس میں صرف جھوٹ اور مبالغہ آمیزی تھی اس میں لکھا تھا، میں سعد جمال القاعدہ کا ایک پرانا رکن ہوں ان کے کیمپوں میں جنگی تربیت کے فرائض اور دیگر امور انجام دے رہا ہوں اور انہیں سرمایہ فراہم کرتا ہوں انڈونیشیا کی روانگی بھی میری اسی جنگی تربیت کا حصہ ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیسے کیا تو جواب ملا کہ تم کیمپوں میں شرکت اور مالی مدد فراہم کرنے کا اعتراف پہلے کر چکے ہو اور ایک ہفتہ بھوک پیاس کی اذیت و الیکٹرشاک کے ساتھ ان کے لاتوں اور گھونسوں کی تواضع میں کیے جانے والے جھوٹے اعتراف کو بہر طور انہوں نے اپنے مقصد میں کامیابی سے استعمال کیا تھا۔"

"سعد جمال اچھی طرح سمجھ لو تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا جائے گا۔" مارٹی نے اس انداز میں جملہ ادا کیا جیسے غصہ ضبط کررہا ہو۔

"یہاں موت کی سزا دینے کے لئے جو چیمبر ہے میں اسے دیکھ چکا ہوں۔" پھر نیل نے کہا۔

"تمہیں اپنے باپ اور بیوی کی سلامتی کی کوئی فکر نہیں اپنی......"

آخر کار تھک ہار کر ان کے مفروضات اور پروپگنڈہ کو قبول کرتے ہوئے میں نے اس پہ دستخط کرنے کا فیصلہ کرلیا میں نے ان سے کہا۔

"آپ جو کچھ کہیں گے میں اس پر دستخط کر دوں گا لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں میں اپنی کوٹھڑی میں جانا چاہتا ہوں، کوٹھڑی میں جا کر میں نے صلوۃ الحاجات پڑھ کر یہی دعا مانگی کہ اے خدا یہی دستاویزات ان کے جھوٹ کو بے نقاب کرنے کا ذریعہ بنا دے اور دعا مانگنے کے بعد اپنے رب پر توکل کرتے ہوئے میں نے دستخط کردیئے اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا، چھ ماہ تک میں اپنے پنجرے میں قید تنہائی بھگتا رہا وہاں بلب ہر وقت روشن رہتے تھے اگرچہ رات کو ان کی روشنی قدرے مدھم کردی جاتی تھی لیکن مجھے اندازہ نہیں ہوتا کہ دن کا اجالا ہے یا رات کی تاریکی، البتہ جب دروازہ کھلتا یا محافظ ڈیوٹی تبدیل کرتے تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا مجھے ان سے بارہا کہنا پڑتا کہ نماز کا وقت آئے تو مجھے بتا دیا کریں کیونکہ مجھے کیمپ کی جانب سے کبھی اذان کی آواز سنائی نہیں دی البتہ صبح کے وقت اور غروب کے وقت امریکی قومی نغمے کی دھن ضرور سنائی دیتی تھی۔"

بات کرتے کرتے سعد یک ٹک پہاڑ کی گود میں ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا، سرخ تھال نے اپنے رنگوں کی برکھا آسمان پہ پھیلائی اور خود پہاڑ کی گود میں جا بیٹھا تھا، سورج کی سرخی گویا اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی، ماضی کی دبیز چادر نے سرک کر اس کے زخموں کو سورج کی تپش دکھائی تو دل پہ لگے زخم بھی جھلنے لگے تھے، ابوصالح نے اس کی خاموشی کو نوٹ کیا اور پھر اسی خاموشی سے سہارا دے کر پہاڑ سے اترنے لگا، پہاڑی دروں اور کاٹ کر بنائی گئی راہداریوں سے گزر کر جب وہ لوگ اپنے لیے مختص کمرے میں پہنچ تو سعد نے یکدم ابوصالح کے ہاتھ کو ننھے بچے کی طرح پکڑ لیا۔

"آج آپ میرے ساتھ ہی سو جائیں ابو صالح۔" ابوصالح نے بغور سعد کو دیکھا ایک ان دیکھا خوف اس کے چہرے پہ پھیلا ہوا تھا، جیسے میلے میں گم ہو جانے کے خوف سے بچہ حفاظت کے طور پر باپ کو تھام لیتا ہے، ابوصالح نے محبت سے اس کی پیشانی پہ گرے بالوں کو سمیٹا اور پیشانی کو بوسہ دے کر اسے بیڈ پہ لٹایا اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گیا اور ابوصالح نے ایک شفیق باپ اور بڑے بھائی کی اسی محبت سے سعد کا سر اپنے سینے سے لگایا اور اس کے گرد بازو پھیلا کر اسے اپنے قریب کرلیا سعد نے ایک ٹرانس کی کیفیت میں دوبارہ رونا شروع کردیا اور اس کی آواز کا زیر و بم اور لہجے کی نمی ابوصالح کو اپنے دل میں دھڑکتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"میں رات رات بھر دعائیں مانگتا رہا، روتا رہتا اور جب مجھے نیند آتی تو مجھے خواب میں ان

امریکی فوجیوں اور ارتکازی کیمپوں سے دور عجیب اور دلکش مناظر سامنے آتے، میرا جی چاہتا کہ میں کبھی ان خوابوں سے دور نہ ہوں اور سوتا رہوں لیکن جلد ہی ان خوابوں کے سلسلہ ٹوٹ گیا، میری کوٹھڑی کے نیچے ایک گرگٹ مر گیا، تعفن ناقابل برداشت ہو گیا تھا میری کوٹھڑی اس قدر تنگ تھی کہ مشکل وہاں دو قدم آگے اور دو قدم پیچھے چلنے کی گنجائش تھی میں اسی عالم میں رات دن وہاں گزار رہا تھا اور آخر کار ایک دن پھٹ پڑا، ضبط کا بندھن ہاتھ سے چھوٹ گیا، میں چلا چلا کر تفتیش کنندگان کو دھمکیاں دینے لگا جو نجانے اس قید خانے سے دور اپنی کسی آرام گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، پھر میں نے کوٹھڑی کی ساری چیزیں نکال کر پھینک دیں میں دروازوں پر مکے برساتا رہا اور گالیاں دیتا رہا میرے چیخنے چلانے پر میں چیخ چیخ کر تھکنے لگا جبھی وہاں فرسٹ سارجنٹ اور کیمپ کمانڈر آ گئے میں نے انہیں دیکھ کر بھی چیخنا بند نہ کیا اور ان کی شکل دیکھ کر تو گویا میرا اتنے مہینوں کا صبر جواب دے چکا تھا، میرے منہ سے بے اختیار گالیاں نکلنے لگیں حالانکہ گالیاں دینا میری نہ عادت تھی اور نہ ہی تربیت بعد میں میں نے ان لوگوں سے اپنے رویے کی معافی مانگی یوں بھی میرا قید خانہ بدل دیا گیا تھا، تو اپنی نئی کوٹھڑی جو اس کوٹھڑی سے دو فٹ لمبائی میں اور دو فٹ چوڑائی میں بڑی تھی کافی سکون محسوس کرنے لگا تھا، ایک ماہ بعد وہاں امریکی وزیر خارجہ کا ایک آدمی آیا اور اس نے بتایا کہ عدالت کی طرف سے اس بدنام زمانہ جیل سے پانچ قیدیوں کو رہائی کا آرڈر مل گیا ہے لیکن ان مکار سازشیوں نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتایا اور نہ ہی یہ کہ ان پانچوں میں میرا نام شامل ہے یا نہیں، پھر جب میں یہ خبر سن کر خوش ہوا تھا حالانکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے مزید کتنا عرصہ گوانتاموبے میں رہنا پڑے گا حالانکہ یہ تصور بھی بہت روح فرسا تھا لیکن پھر بھی مجھے اپنے مسلمان بھائیوں کی آزادی کی خوشی تھی۔'' ابو صالح نے حیرت سے اسے دیکھا جوان انجان مسلمانوں کی رہائی کے بارے میں اس خوشی سے بتا رہا تھا گویا وہ اس کے سگے بھائی ہوں، لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا بولا تو صرف اتنا۔

''پھر کیا ہوا سعد؟''

''پھر رمضان آ پہنچا اور قید میں میرا یہ تیسرا رمضان تھا، مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ قید تنہائی میں تیسرا رمضان گزارنا دوبھر ہو جائے گا لیکن اس رب نے مجھے تنہائی کی اذیت سے نکالنے کا سامان کر دیا یکم رمضان سے ایک روز قبل کچھ محافظوں نے آ کر کہا۔''

''اٹھ جاؤ...... لو تم جا رہے ہو، دس بجے رات کو وہ لوگ مجھے لینے آئے، جب میں ان لوگوں کے ساتھ نکلا تو ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور کہیں دور سے کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگیں مجھے اندازہ تھا یہ آوازیں اصل کیمپ، کیمپ ڈیلٹا سے آ رہی ہیں وہ مجھے پکڑ کر نیچے لے آئے، میرے پیروں میں بندھی زنجیریں زور سے جھنجنا اٹھیں مجھے اپنے چاروں طرف قیدیوں کے پنجرے دکھائی دے رہے تھے انہیں دیکھ کر مجھے کتوں کے جنگلوں کا خیال آ گیا جب میں دس سال کا تھا تو ایک مرتبہ چاچو کے ساتھ برمنگم گیا تھا وہاں ''ڈاگ ہوم'' میں موجود کتوں کے لئے ایسے جنگلے بنے ہوئے تھے یعنی ان امریکیوں کی نظر میں انسان خصوصاً مسلمان ان کے بل ڈوگ سے جیسی اہمیت رکھتی تھے، میرا دل ڈوبنے لگا کیونکہ کیمپ کمانڈر کے کہنے پر مجھے جس کمرے میں منتقل کیا گیا تھا وہ

ساحل کی طرف ہوا دار تھا اب میں گوانتاموبے کی گرم ہوا برداشت کرتے ہوئے پنجروں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، محافظوں نے سامنے بنے پنجرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا، فرش پہ میں منہ کے بل گرا تھا اور قریب تھا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے میرا منہ فرش سے جا لگتا دو مہربان ہاتھوں نے مجھے تھام لیا، تھامنے والے نے بڑے پرسکون انداز میں پکارا۔''

''ارے سعد یہ تم ہو۔'' میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ فیروز عباسی تھا جو میرے ساتھ کیمپ ایکو میں بھی رہ چکا تھا۔

''تم پہلے سے بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' فیروز عباس نے سعد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا بھی نہ سکا کتنی عجیب بات تھی میں دو سال بعد اپنے اس ساتھی کو دیکھ رہا تھا، جس کو میں محافظوں کی زبانی غائبانہ طور پر جانتا تھا اور آج پہلی ملاقات میں مجھے لگ رہا تھا کہ ہم آج پہلی مرتبہ نہیں مل رہے بلکہ صدیوں سے ملتے آ رہے ہیں چند منٹ کے بعد میرے سامنے والے پنجرے کا دروازہ کھولا اور فرش پر زنجیریں گھسٹنے کی آوازیں گونج اٹھیں ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا میں اس کو پہچان گیا تھا، وہ القاعدہ کا رکن عثمان الحزمی تھا اگلے پنجرے میں جو شخص بند تھا اسے دیکھ کر نجانے کیوں نہاں خانوں میں چھپا دل جھوم اٹھا تھا وہ سلیم حمدان تھا جس سے میں ہسپتال میں سرگوشیوں سے باتیں کرتا تھا، چند پنجرے چھوڑ کر آسٹریلوی ڈیوڈ ہکس کا پنجرہ تھا اور ہکس کے سامنے والے پنجرے میں ایک سوڈانی قیدی ابو حمزہ موجود تھا، وہ سب میرے ساتھ ایک سال قبل ملٹری کمیشن کے لئے صفائی پیش کرنے کے لئے نامزد کیے گئے تھے ہم سب آپس میں عربی اور انگریزی اور اردو میں بے تابی سے گفتگو کرنے لگے، جان لیوا حالات کے باوجود ہم سب ایک دوسرے سے ملنے کے بعد بہت پرجوش اور خوش تھے، نماز عشاء اور تراویح پڑھنے کا لطف دوبالا ہو گیا تھا، قرآنی آیات کی تلاوت اردگرد کی آوازوں پر محیط ہو گئی تھی، ہم پانچ لوگ تھے اور ہر شخص کی ہر نماز کے بعد ایک سپارہ سنانے کی باری لگتی اس طرح ہم پانچوں نے مل کر اس رمضان پانچ قرآن ختم کر لئے ان کی ساعتوں سے میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے، ابو صالح نے بغور دیکھا اس کی آنکھوں سے اس وقت بھی آنسو گر رہے تھے لیکن وہ گرتے آنسوں سے بے پروا کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔

''لیکن یہ حقیقت تھی کہ ہم سب کے پاس رونے کا سبب موجود تھا اور ہم سب کا غم مشترک تھا اور یہ ایک میٹھا میٹھا سا غم تھا، رمضان کے بعد عیدالفطر کا تہوار آیا ہے، ہم سب فطرانہ دینے کے استعداد نہیں رکھتے تھے لیکن عید کی خوشیوں کو محسوس کرنے کے لئے ہمارے درمیان جشن و طرب کی فضا چھائی رہی، ہر شخص گنگنا رہا تھا یا ایک دوسرے کو گیت اور نظمیں سنا رہے تھے، پورے کیمپ میں رنگا رنگ آوازیں گونج رہی تھی، کبھی پشتو، کبھی فارسی، کبھی عربی دھن میں بھی اس عید پر ہر غم کو بھول کر عید کی خوشیوں کو محسوس کر رہا تھا، میں نے عربی کے کچھ گیت اور نظمیں سنائی تھیں، انگریزی کی نظمیں صرف فیروز عباسی اور محافظوں کو سمجھ میں آئیں، وہ رمضان میرے لئے رحمتوں و برکتوں محبتوں و خوشیوں اور آزادی کا پروانہ لے کر آیا تھا، شوال کے آخری عشرے میں ایک میجر نے میری کوٹھڑی میں آ کر کہا۔''

''مسٹر سعد جمال میں یہ اطلاع دینے کے

لئے آیا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور میر اول۔" اس کے لفظوں پہ میں لرز اٹھا تھا، خدایا اب کون سا نیا فرد جرم عائد کرنے والے تھے وہ لوگ مجھ پر لیکن اس نے اپنا جملہ یوں مکمل کیا۔"

"فوج نے تمہیں برطانوی حکام کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب تمام الزامات سے بری کرنے کے بعد تمہیں آزاد کیا جا رہا ہے اور تمہیں تمہارے وطن پاکستان بھیجا جا رہا ہے۔"

میجر خبر سنا کر جا چکا تھا اور میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا، ایک طرف آزادی ملنے کی خوشی اور دوسری طرف بھائیوں جیسے دوستوں کی جدائی اور ان کی قید کی عمر طویل ہونے پر میری پلکوں نے آنسوؤں پر بند باندھنے سے انکار کر دیا تھا اور اس پل حقیقتاً سعد جمال پنجرے کے اندر اور پنجرے کے باہر سے فیروز عباسی، ابو صالح، عثمان الحزی، سلیم حمدان اور ڈیوڈ سے لپٹ لپٹ کر رو دیا تھا، ان سب سے ملنے کے بعد میں جس وقت کیمپ کے باہر بنے میدان میں کھڑے ٹرک کے پاس آیا تھا وہ ٹرک ہمیں ایئر پورٹ پہنچانے کے لئے منگوایا گیا تھا، ٹرک میں بٹھا کر انہوں نے تھوڑی دیر بعد مجھے کھڑا کر دیا اور ہتھکڑیوں سے پہلے کمر کے گرد لپٹی ہوئی زنجیر کھولنے کی کوشش کی پھر ہمارا سفر شروع ہوا لیکن وہ ٹرک ہمیں ایئر پورٹ چھوڑنے کے بجائے پاکستان کے بارڈر پہ چھوڑ کر چلا گیا، بارڈر پہ آنے کے بعد ٹرک کا دروازہ کھول کر جب مجھے اتارا گیا تو میں نے ان سے پوچھا آپ نے سوپ سینڈوچ کبھی کھایا ہے، آفیسر نے حیرت سے میری شکل دیکھی اور بولا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"سوپ میں سینڈوچ کو بھگو کر کھانا ہے اور یہ کہہ کر میں رکا نہیں تھا، کیونکہ ان سے کوئی بعید نہیں تھا وہ اس جملے پر مجھ پر کوئی دفعہ لگا کر دوبارہ لے جاتے اور اب میں تمہارے سامنے ہوں میں موت سے نہیں ڈرتا اور شہادت کا شوق مجھے واپس جانے نہیں دیتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں واپس گیا تو بابا اور لائبہ کی محبتیں مجھے کمزور کر دیں گی۔" سعد نے توجیح پیش کی تو ابو صالح نے اس کی کہانی اور اس کے بعد دی جانے والی توجیح پر توصیفی نظروں سے اسے دیکھا جو جہاد کے اعلیٰ درجوں کو پار کر آیا تھا مگر پھر بھی شہادت کی تمنا پوری ہوئے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا، ابو صالح نے اسے سمجھایا۔

"دیکھو سعد تمہیں اچھی ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ اصولی طور پر دیکھنے کے ساتھ میری اور امیر صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تمہیں واپس چلے جانا چاہیے، پانچ سال کم نہیں ہوتے ماں باپ اور بیوی کی آزمائش کے لئے اور بیوی بھی وہ جو تمہاری پہلی محبت بھی ہے اور تم پر جان نثار کرتی ہے پہلے بیوی کے حقوق اور ماں باپ کے فرائض ادا کر آؤ اور مکمل طور پر فٹ ہو جاؤ پھر بے شک واپس آ جانا ہم سب تمہاری واپسی کے منتظر رہیں گے مگر اس سے بھی زیادہ ہم تمہارے اپنوں میں جانے کے منتظر ہیں۔" ابو صالح نے اس کے کاندھے کے گرد ہاتھ پھیلایا۔

"دیکھو سعد خدا کی پکڑ بہت سخت ہے وہ معصوم جو تمہارے نام پر بیٹھی ہے اور وہ باپ جو نجانے کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہے ان سے ملاقات کر کے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر دو اور وہ لڑکی جو تمہاری بیوی ہے اس کے حقوق تم پر واجب الادا ہیں تم کو وہ حقوق ضرور پورے کرنے ہوں گے تم اس سے اجازت لے کر آنا چاہو تو ضرور آنا اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہارے اس جذبے کے آگے رکاوٹ نہیں بنے گی تم سمجھ

رہے ہو ناں۔" ابو صالح نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں سمیٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اسے گلے لگا لیا کیونکہ اسے معلوم تھا سعد جمال کی حالت اس وقت گرم لوہے کی سی ہے جس پر اپنوں کی پے در پے پڑنے والی چوٹ نے نرم کر دیا تھا اور وہ معصوم بچے کی طرح ابو صالح سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ابو صالح نے اسے رونے دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد سعد جمال کو فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

☆☆☆

لپٹ کر اپنی تنہائی سے جاگتی رہتی ہوں میں
تمام رات اس کی یاد مجھے سونے نہیں دیتی
اس کی معصوم سی شرارت جب بھی آتی ہے یاد
اداس کر جاتی ہے رونے نہیں دیتی
لوگ کہتے ہیں بھول کر اس نئی زندگی شروع کر
وہ روح پر قابض ہے مجھے کسی اور کا ہونے نہیں
دیتی

اسے پاکستان آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے اور ان سالوں میں کیا کچھ بدل گیا تھا جلال احمد اور حبیبہ کے کار ایکسیڈنٹ سے فوت ہونے کے بعد وہ دیار غیر میں تنہا ہو گئی تھی اس لئے جمال احمد کی ایماء پر اپنا سب کچھ سمیٹ کر وہ سعد سے ملنے کی خوشی اور آس لئے پاکستان آ گئی مگر یہاں آ کر اسے لگا اس کی دنیا میں اب کچھ باقی نہ رہا نہیں خواب نہ خواہش نہ زندگی اور نہ ہی آرزو اس کے انتظار کی حدیں بھی ٹوٹنے لگی تھیں یہ سن کر سعد جمال کو لاپتا ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے یعنی اس کے یہاں سے جانے کے بعد ہی سعد لاپتا ہو گیا تھا، ثمینہ جمال لائبہ کے بعد سعد کی جدائی سے بیمار ہو گئی تھیں اور آخر کار بیماری سے لڑتے لڑتے خالق حقیقی سے جا ملیں، جنت لاج میں اب صرف لائبہ اور جمال احمد رہتے تھے انہوں نے اوپر کا پورشن کرائے پر دے دیا تھا اور وقت گزاری کے لئے لائبہ نے شاہ زر کے آفس میں جاب کر لی تھی۔

فجر کی نماز کے بعد وہ ناشتہ بناتی گھر کی صفائی کر کے پھر تیار ہوتی اور آفس چلی جاتی لیکن لنچ میں وہ جمال احمد کی وجہ سے ضرور گھر آتی تھی سعد کو گئے آٹھ سال ہو گئے تھے اور ان آٹھ سالوں میں لائبہ جمال سراپا بدل گئی تھی وہ شوخ و شنگ لائبہ نجانے کہاں کھو گئی تھی، سعد جمال کی جدائی نے اسے توڑ دیا تھا لیکن جمال احمد کے لئے وہ اپنے آپ کو ہر روز جوڑتی اور زندگی کی شاہراہ پہ حصہ بٹانا شروع کر دیتی شاہ زر رحمٰن نے آٹھ سال سے لاپتہ ہونے پر سعد کی واپسی کی کوئی امید نہ رہی تو شاہ زر نے اسے پرپوز کر دیا جسے لائبہ نے سہولت سے منع کر دیا تھا، کیونکہ وہ رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی تھی اسے یقین تھا کہ ایک دن سعد واپس ضرور آئے گا۔

☆☆☆

جب سے یہ پیغام ملا ہے
جاناں! تم آنے والے ہو
موسم نے سارے گھر کی ترتیب بدل ڈالی ہے
چوکھٹ پہ ایک چاند بھی آ کر بیٹھ گیا ہے
کئی ستارے لاؤنج میں کب سے
پڑے ہوئے ہیں
کہتے ہیں کہ
اس رستے سے تم گزرو گے
ننھے منے کئی گلابوں کا کہنا ہے
جتنے دن تم اس رہو گے
گھر کے ہر کونے میں آ کر وہ مہکے گیں
پھولوں نے مل کر سب کونے بانٹ لئے ہیں
جگنو کب سے چھت پہ گھر کے
ہر گوشے میں چمک رہے ہیں

سورج اور بارش بھی
کل سے سائبان پڑے ہوئے ہیں
دھیمے دھیمے چھلک رہے ہیں
شام تو کب سے کئی طرح کے
موسم لے کر

اس کمرے میں رکی ہوئی ہے
جس کمرے میں تم ٹھہرو گے

آسمان پر ڈوبتے سورج کی شفق پھیل رہی تھی وہ سعد کا ہاتھ تھامے اس حسین کہسار پہ کھڑی ہوئی تھی شوخ ہوا اس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی، مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ایسی بکھری تھی کہ گویا لب سمٹنے پر وادی کا ہر شے کا حسن ماند پڑھ جائے گا یکدم وہ سعد کا ہاتھ تھامے چلتے ہوئے پہاڑ کے سرے پر پہنچی تو اسے گمان ہوا وہ پہاڑ کے سرے پہ پہنچتے پہنچتے تنہا رہ گئی ہے اور تنہائی کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، اس نے آنکھ کھلنے پر پاس رکھے موبائل سے ٹائم دیکھا فجر کی اذان میں صرف چند ہی منٹ تھے اس نے بیڈ سے اتر کر واش روم کا رخ کیا، واش روم سے فارغ ہو کر وضو کر کے وہ جس وقت نکلی اذانیں شروع ہو چکی تھیں اس نے احتراماً بیڈ پہ بیٹھ کر اذان سنیں اور اذان ختم ہونے کے بعد دو آنسو بے اختیار سعد کی جدائی کے خیال سے ٹوٹ کر گر پڑے، چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ حسب معمول فجر کی نماز کے لئے جمال احمد کے دروازے پہ دستک دینے آئی تھی لیکن کھلے دروازے کو دیکھ کر وہ حیرت سے اندر چلی آئی ان ہونی کا وہ احساس جو جاگنے کے بعد سے اس کے لاشعور سے شعور تک آ چکا تھا وہاں پھیلی خوشبو کسی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی اور جس کے ہونے کا احساس تھا وہ یقین کرنے میں تامل تھی، آہستہ قدموں سے چلتی وہ اندر آئی کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، سیاہ سوٹ میں وہ حسب عادت دوزانو جمال احمد کے گھٹنوں پہ محبت سے ہاتھ سے رکھے نہ جانے دھیمی آواز میں کیا کہہ رہا تھا، حیرت، دکھ، جدائی اور محبت کی اذیت بھری کرچیاں سمیٹے وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہاں سے نکلتی چلی گئی، اپنے کمرے میں آ کر وہ نجانے کتنی دیر بیٹھی رہی تھی، ہوش میں وہ اس وقت آئی جب وہی دھیمی خوشبو اس کے قریب آ گئی لائبہ نے خفگی و دکھ سے سعد کو دیکھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی، سعد نے اس کے انداز کو دیکھا لیکن پھر خاموش ہو گیا کیونکہ وہ انجان تھی اس کے ان پانچ سالوں کی زندگی سے سعد نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو لائبہ نے مڑ کر اسے دیکھا جہاں آج بھی ان آنکھوں میں ستاروں کی مانند چمکتی اس کی محبت جگمگا رہی تھی، وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے کاندھے سے آ لگی اور اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی نجانے کب کے رکے آنسو نکل رہے تھے طیبہ اور جلال کی وفات ثمینہ کی بیماری سعد کی جدائی اور پھر اچانک ملنے والی قربت نے اس کی آنکھوں کو جل تھل کر دیا تھا، جب وہ رو رو کر تھک گئی تو سعد نے اسے پاس بٹھایا اور اس کی خواہش پر ان پانچ سالوں کی روداد بتانے لگا۔

☆☆☆

رات قطرہ قطرہ بیت رہی تھی وہ ایک رات میں نجانے کتنی صدیوں کا سفر کر آئی تھی سعد اس کی اوائل عمری کی پہلی محبت تھا اس نے پوری زندگی کا موازنہ کرنا چاہا تو ان آٹھ سالوں کو چھوڑ کر اس نے اپنی باقی زندگی من چاہی گزاری تھی اور پھر اب تو خدا کی طرف سے اسے زندگی گزارنے کے لئے زادِ راہ کے طور پر سعد کی نشانی کی خوش خبری بھی دے دی تھی تو پھر وہ کیوں رکاوٹ بنتی اس کے راستے کی، اس نے اپنی باقی کی زندگی بھی جی لی تھی ان تین ماہ میں کون سی محبت کون سی خواہش اور کون سا خواب تھا جو سعد جمال نے پورا نہ کیا تھا بن مانگے اس کی جھولی بھر دی گئی تھی ہر چیز سے بڑھ کر ہر خواہش سے بڑھ کر سعد جمال نے اسے دیا تھا اس نے سوچا وہ سعد کو خود جہاد پہ جانے کے لئے تیار کرے گی اور اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا تھا وہ کمرے میں تنہا تھی، لائبہ اپنی سوچ میں گم تھی اور سعد اپنی سوچ میں گم کمرے میں داخل ہوا تھا اسے وہاں آئے تین ماہ ہو چکے تھے اس نے آج مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ لائبہ کو سب کچھ بتا کر اس سے اجازت ضرور مانگ لے گا،

اس وقت بھی وہ ریوالونگ چیئر کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھا الفاظ ڈھونڈ رہا تھا، جبھی لائبہ کی آواز کمرے میں گونجی۔

"سعد تم واپس ان لوگوں میں جانا چاہتے ہو ناں۔" اور لائبہ کے الفاظ پہ سعد کو سو والٹ کا کرنٹ لگا تھا وہ ابھی الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور وہ اطمینان سے اس کا مقصد بھی بتا چکی تھی، وہ اس کی محبت میں اس حد تک جا چکی تھی کہ کہنے سے پہلے ہی اس کے دل کی کیفیت کو اس کی آنکھوں میں رقم ہوا دیکھ چکی تھی۔

"لائبہ۔" سعد تڑپ کر اس کے پاس آیا تھا اور وہیں دوزانو بیٹھ گیا۔

"میں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا لیکن......"

"نہیں سعد تم خوش قسمت ہو خدا تمہیں اپنی جنت کا خریدار بنانا چاہتا ہے، تم اس کی جنت کے مہمان بنو گے تو مجھے بھی اپنے ساتھ اس جنت میں رہنے کی خواہش اللہ کو بتاؤ گے ناں تمہاری ضرورت مجھ سے اور بابا سے زیادہ ان کمزور لوگوں کو ہے جو بے بس و لاچار ہیں اور دشمن کے مقابلے میں نہتے بھی۔" "اور اب تو۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"اور اب تو خدا نے مجھے بیٹا دینے کا بھی وعدہ کیا ہے مجھ سے وعدہ کرو میرے بیٹے کو بھی مجاہد بناؤ گی اور میدان بدر اور میدان احد میں اپنے لخت جگر کو تیار کرنے والی ماؤں کی طرح بنو گی۔" سعد نے اس کا ادھورا جملہ مکمل کیا تو وہ حیرت و خوشی سے خاموش ہو گئی حیرت اس بات کی تھی کہ وہ کتنے یقین سے کہہ رہا تھا کہ خدا اسے بیٹے کی نعمت سے ہی نوازے گا اور خوشی اس بات کی کہ اسے لائبہ جمال کی محبت و ضرورت صرف اس دنیا میں ہی نہیں بلکہ دائمی زندگی میں بھی تھی۔

"ہاں لائبہ یہ میرا تم سے وعدہ ہے اس جنت لاج کے ہر مکین کو اس دائمی جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی خواہش میں اپنے رب سے ضرور کروں گا اور میرا یہ بھی وعدہ ہے میں اس گھر کے کسی مکین کے بغیر اس دائمی جنت میں نہیں جاؤں گا خاص طور پر لائبہ سعد کے بغیر اور بیشک خدا سے بڑا تو وعدہ وفا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

سعد نے اسے اپنی دائمی محبت و ساتھ کا یقین دلانے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تو اس کے ان کہے وعدہ کو پورا کرنے اور ان کہی خواہش کو جان لینے کے بدلے خدا نے اپنی نعمت سے نوازنے کے بعد سعد جمال کے بس بے پایاں اظہار کا حق دار بنا دیا تھا اور یہی وہ سرمایہ تھا جس پہ لائبہ جمال بخوشی سعد کو راہ خدا میں بھیج کر زادِ رہ کے طور پر باقی زندگی گزارنے کے لئے تیار تھی۔

اور اک طمانیت سے لائبہ نے اس کے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

فرض اور لیس

عابی ناز

میں لندن سے ایک ہفتے کے ٹور کے بعد لوٹی تو شاہ پور کی اس پانچ کنال پر محیط حویلی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، پوری حویلی میں رونق اور چہل پہل کا سماں تھا نوکروں اور ملازموں کی ٹولیاں ادھر سے ادھر بھاگ بھاگ کر کام کرنے میں یوں مصروف تھیں گویا حویلی میں کسی کی شادی کا فنکشن ہو اور یہ سب صرف اس بار ہی نہیں ہمیشہ ہی ہوا کرتا تھا، میں فریال نواز اس حویلی کے مالک عابد نواز کے سب سے بڑے اور اکلوتے بیٹے شاہ نواز کی بیوی ہوں، شاہ نواز کے بعد دو بہنیں ہیں جو دونوں ہی شادی شدہ ہیں، عابد نواز اور میرے بابا جانی طاہر نواز دونوں سگے بھائی ہیں مگر ہماری سوسائٹی طرز معاشرت اور انداز و اطوار عابد نواز اور ان کی فیملی سے یکسر مختلف ہیں۔

طاہر نواز حویلی کے اس فرسودہ رسم و رواج سے نالاں و بیزار رہتے تھے چنانچہ تعلیم کے سلسلے میں لندن گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے میں فریال نواز بھی لندن کی ہی پروردہ ہوں میں طاہر نواز کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے بے حد لاڈلی رہی ہوں میں اکیس سال کی تھی جب ہمیں اچانک دادی جان کی وفات پر پاکستان کا چکر لگانا پڑا تو عابد نواز (تایا جان) اور شاہ نواز نے میرے رشتے کے لئے ایسی ضد پکڑی کہ بابا جانی کو ہاں کرتے ہی بنی، حالانکہ وہ دل سے اس رشتے کے لئے راضی نہ تھے، جبکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بابا جانی اس کلچر کو اتنا ناپسند کیوں کرتے ہیں؟

☆☆☆

حویلی کے تمام افراد تایا جان، تائی جان شاہ نواز یہاں تک کہ ان کی دونوں بہنیں (میری نندیں) زینب اور زرگل بھی اپنی اپنی سسرال سے خصوصی طور پر مجھے ملنے آئیں، تمام ملازم اور نوکرانیاں بھی باری باری میرے سامنے حاضری لگوا چکے تھے، مگر ابھی تک میری سب سے خاص ملازمہ نوری (نور العین) دکھائی نہیں دی تھی۔

”رحمت بابا، نوری آج نہیں آئی کیا؟“ میں نے ایک ملازم سے استفسار کیا۔

”آئی تو ہے بیگم صاحبہ، کیا ابھی تک آپ کو نہیں ملی؟“

”نہیں۔“ میں رحمت بابا کو اسے بلانے کا کہنے ہی والی تھی کہ دوسرے صوفے پر بیٹھے نواز شاہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے گزشتہ ایک ہفتے کی مصروفیات اور سفر کی بابت دریافت کیا تو میں ان سے گفتگو میں کچھ یوں الجھی کہ نوری اور رحمت بابا دونوں ہی ذہن سے محو ہو گئے۔

شام میں زینب اور زرگل دونوں کے میاں بھی پہنچ گئے تو حویلی کی رونق میں اضافہ ہو گیا، رات کا کھانا اور چائے ایک ساتھ پی گئی، دیر تک محفل جمانے کے بعد جب دس بجے ہم انہیں رخصت کر کے اپنے اپنے کمروں کی طرف گئے تو نوری کا خیال ایک بار پھر کوندا، وہ جو ایک منٹ بھی بمشکل میرے بغیر رہتی تھی صبح سے اب تک اس کی ایک جھلک بھی نظر نہ آئی تھی، بات تو حیرت کی تھی مگر میں زیادہ نوٹس لئے بغیر سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

”نوری کہاں ہے؟“ اگلی صبح میں ساڑھے گیارہ بجے فریش ہو کر نیچے آئی تو حسب سابق اسی کو پوچھا ناشتہ لگاتی عنایت بوا رک کر بولیں۔

”وہ بیگم صاحبہ کچن میں ہے آپ کے لئے ناشتہ اسی نے بنایا ہے مجھے کہنے لگی کہ میں دے آؤں آپ کو تو میں لے آئی۔“

”مگر وہ خود کیوں نہیں آئی؟ کل سے مجھے ملی بھی نہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اس کی؟“

میں قدرے پریشان ہوئی کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، میری شادی کو تین سال ہونے والے تھے مگر وہ شادی کے دن سے لے کر آج تک ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی، وجہ بے وجہ میرے اردگرد منڈلانے پر اسے کئی بار تایا جان، تائی جان اور شاہ نواز سے ڈانٹ بھی سننے کو ملی تھی وہ نظر بچا کر پھر سے میرے پاس آن وارد ہوتی۔

”نوری تائی جان نے دیکھ لیا تو ڈانٹیں گی تم جاؤ اب۔“ میں کہتی تو وہ ٹھنک کر جواب دیتی۔

”ان بڑے لوگوں کو پتہ نہیں کیوں ہم غریبوں سے الرجی ہوتی ہے چھوٹی بی بی کام بھی تو ہم ہی کرتے ہیں نا ان کے پھر تب کیوں نہیں کہتیں کہ چھوڑ دو تم جاؤ، پتہ نہیں آپ کے پاس آئیں ہم تو انہیں کیا ہو جاتا ہے شاید انہیں ڈر ہے کہ ہم ان کی باتیں اور کام آپ کو نہ بتا دیں، پر بی بی جان سچی پوچھیں تو آپ مجھے اتنی اچھی لگتی ہیں کہ آپ کے پاس سے اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا، آپ کا انداز اور لہجہ کتنا دھیما نرم اور خوبصورت ہے آپ ان باقی حویلی والوں کی طرح چیختی چلاتی یا رعب و داب نہیں دکھاتیں، آپ بہت معصوم اور سادہ ہیں جی۔“ سترہ سالہ نور العین بھولپن سے کہتی تو میں ہنس کر ٹالتی ہوئی اسے اپنے قریب سے ہٹا دیتی، مبادا کوئی اور دیکھ لے اور اسے پھر سے ڈانٹ کھانی پڑے۔

”طبیعت کا تو پتہ نہیں بیگم صاحبہ مگر جب سے آپ گئی ہیں وہ بہت گم صم اور چپ چپ سی ہے ضرورت کے سوا کچھ بولتی نہیں کئی بار اس سے وجہ پوچھ چکی ہوں پر بتاتی بھی نہیں، شاید آپ سے اداس ہو گئی ہو۔“ عنایت بوا تفصیل سے میری بات کا جواب دیتے ہوئے بولیں۔

”اگر اداس ہو گئی ہے تو پھر اب تک مجھ سے ملی کیوں نہیں وہ تو ہر بار مجھے سب سے پہلے ملتی ہے لیکن اس بار تو وہ دکھائی بھی نہیں دی اسے بھیجو ذرا میرے پاس۔“ کھانے کی ٹیبل پر میں اکیلی ہی تھی، تایا جان اور شاہ نواز صبح ہی صبح ناشتہ کر کے زمینوں کے لئے نکل جایا کرتے تھے اور پھر دوپہر میں لنچ کے لئے لوٹتے جبکہ تائی جان کے لئے ناشتہ ان کے کمرے میں ہی بھجوا دیا جاتا تھا، ویسے تو میں بھی تایا جان اور شاہ نواز کے ساتھ ہی ناشتہ کر کے شہر میں قائم کیے گئے اپنے سوشل ادارے، ”ہیومین رائٹس“ کو واچ آؤٹ کرنے چلی جاتی تھی، مگر آج چھٹی کا ارادہ تھا۔

”جی بی بی صاحبہ آپ نے بلایا تھا؟“ نوری کی دھیمی آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، پیلے رنگ کے ملگجے سے کپڑوں میں اس کی رنگت بھی بالکل زرد رہی تھی۔

”ہاں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نوری۔“ مجھے اس کے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر تشویش لاحق ہوئی، یہ وہ نوری تو نہ تھی جسے میں صرف دو ہفتہ پہلے سرخ و سفید چہرے اور بھرے ہوئے ٹماٹر جیسے رخساروں سمیت چہکتا ہوا چھوڑ کر گئی تھی۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ مختصر جواب آیا، وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

”آر یو شیور کہ تم ٹھیک ہو؟ تمہیں ہوا کیا ہے؟“ میں نے فکر مندی سے دوبارہ پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایک لفظی جواب دے کر میرے خالی کیے ہوئے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی، تو میں نے اس کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا، وہ اس وقت کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھی، میں چپ چاپ اسے برتن اٹھا کر کچن میں گم ہوتے دیکھتی رہی کچھ گڑبڑ تو تھی، مگر کیا؟ یہ اب مجھے جاننا تھا۔

☆☆☆

”نوری تم مجھے بتاؤ گی نہیں کہ وجہ کیا ہے؟ تم مجھے اپنی دوست نہیں سمجھتی ناں؟“ نوری میرے کمرے میں بچھے کارپٹ پر بیٹھی تھی جبکہ میں اس کے قریب ہی بیڈ پر ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھی ایک بار پھر سے سر کھپا رہی تھی، نوری جو اسی طرح کارپٹ پر بیٹھ کر گھنٹوں مجھ سے گاؤں کی اور اپنی ڈھیروں ڈھیر باتیں کیا کرتی تھی یہاں تک کہ کبھی کبھار مجھے ماہیے اور ٹولیاں بھی سنایا کرتی تھی اس وقت زبان کو تالا لگائے چپ کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔

”نوری خدا کے لئے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تمہاری اس خاموشی سے تمہاری حالت پریشان کر رہی ہے مجھے، پلیز بتاؤ کیا تمہارے گھر میں کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”نہیں بی بی جی، گھر پہ کچھ نہیں ہوا، وہاں تو سب ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔

”تو پھر؟ کیا یہاں تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے، کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟“ میں قیافے لگا رہی تھی کہ میری بات سن کر اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں، اس کا بے اختیار رونا میرے شک کو یقین میں بدل گیا۔

”نوری پلیز فار گاڈ سیک رونا بند کرو، اچھا مجھے بتاؤ کس نے کچھ کہا ہے تمہیں، ہوا کیا ہے؟“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بچوں کی طرح پچکارا تو وہ یکدم میری ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”مجھے معاف کر دیں بی بی صاحبہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں بہت مظلوم ہوں بی بی جی اب اور نہیں سہہ سکتی، میرا دل پھٹ جائے گا یہ امیر لوگ بہت سفاک اور ظالم بھیڑیے ہوتے ہیں یہ غریب کو انسان نہیں سمجھتے ان کے درد کو تکلیف نہیں سمجھتے۔“ وہ بول رہی تھی میں نے بھی اسے روکا نہیں تا کہ وہ دل کا غبار نکال لے۔

”بی بی جی آپ کو تو پتہ ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھے یہاں حویلی والوں کی خدمت گزاری کے لئے بھیجا ہوا ہے تا کہ بدلے میں ملنے والے پیسے اور اناج سے وہ اپنا پیٹ بھر سکیں مگر یہ لوگ......“ وہ اچانک بولتے بولتے رکی اور پھر جھٹکے سے سیدھی ہوتی ہوئی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”مگر یہ لوگ کیا؟“

”کچھ نہیں بی بی جی، میری زبان نہ ہی کھلے تو بہتر ہے ورنہ انجام کیا ہو سکتا ہے یہ کسی کو بھی پتہ نہیں میں اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں اور آپ کو بھی مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔“ اب اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ زیادہ ہی گمبھیر ہو چکا ہے، مجھے دو ڈھائی سال پہلے کا منظر یاد آیا جب تایا جان نے کسی بات پر رحمت بابا کو لاتوں گھونسوں اور لاٹھیوں سے اس بے رحمی کے ساتھ پیٹا تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوا، تب چونکہ میری شادی کو تھوڑا ہی عرصہ بیتا تھا اس لئے مداخلت نہیں کر سکتی تھی سو چپ چاپ آنسو بہاتی اپنے کمرے میں چلی آئی مگر اس کے بعد ایک موقع پر جب شاہ نواز نے ایک نوکرانی پر ہاتھ اٹھایا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے آگے بڑھ کر شاہ نواز کا ہاتھ تھام کر انہیں مزید جارحیت سے روک دیا، اس بات پر حویلی میں کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔

تایا جان اور تائی جان زینب اور زرگل سمیت شاہ نواز نے مجھے حویلی کے معاملات میں دخل اندازی سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا، تب سے میں نے بھی حتی الامکان کوشش کی تھی کہ میں ان کے معاملات میں انٹرفیئر نہ کروں مگر آج پھر نوری بھی یقیناً ان میں سے کسی کی شکایت اور بے رحمی کا ہی نشانہ بنی ہو گی، میں نے اپنے تئیں

سوچا۔

‘‘بی بی جی ہم غریبوں کی عزت کی کوئی عزت کیوں نہیں سمجھتا؟ ہم غریب ضرور ہوتے ہیں مگر امیروں کی بہن بیٹیوں کی طرح ہم بھی کسی کی بہنیں کسی کی بیٹیاں ہیں ہماری عزت پامال ہونے پر ہمیں بھی اتنا ہی دکھ ہوتا ہے جتنا انہیں، فرق صرف یہ ہے کہ غریب سوائے جی ہی جی میں کڑھنے کے اور کچھ کرنہیں سکتا۔’’ گلے میں پھنستے آنسوؤں کے گولے کو زبردستی نگلتی نوری کی بات مجھے اندر تک ہلا گئی۔

‘‘کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟ کسی نے تمہاری عزت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے؟’’ میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

‘‘جانے دیں اس بات کو بی بی جی کچھ نہیں رکھا اس میں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔’’ وہ اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو رگڑتے ہوئے اٹھنے لگی۔

‘‘نہیں نوری! مجھے بتاؤ کسی نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی ہے؟’’ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھا دیا۔

‘‘بدتمیزی؟ آپ بدتمیزی کی بات کر رہی ہیں بی بی جی یہاں تو بچا ہی کچھ نہیں اور سچ پوچھیں تو مجھے اپنے ساتھ ساتھ آپ پہ بھی بے تحاشا ترس آتا ہے کیونکہ میری طرح آپ بھی مظلوم ہیں، کم از کم مجھے تو اب ان لوگوں کی اصلیت پتہ چل گئی ہے، لیکن آپ تو ابھی تک بے خبر ہیں، ظلم تو آپ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔’’ وہ متاسف ہوئی۔

‘‘کیا بکواس ہے یہ سب، مجھے صاف صاف بتاؤ ہوا کیا ہے، کیوں پہیلیاں بوجھوا رہی ہو؟’’ نوری کی باتیں مجھے کسی انہونی کا پیش خیمہ لگ رہی تھیں میں الجھ کر ناگواری سے بولی تو جواباً وہ بھی جذباتی پن سے کہتی چلی گئی۔

‘‘بکواس نہیں ہے یہ سب، میں واقعی اپنی عزت کی پامالی جیسا صدمہ سہہ چکی ہوں، ایک بار نہیں بار بار، اور وہ لیٹرا کوئی اور نہیں شاہ نواز ہے آپ کا سائیں آپ کے سر کا تاج، جسے آپ اپنا شوہر کہتی اور سمجھتی ہیں وہ بہت بڑا غاصب ہے، صرف شاہ نواز ہی نہیں ان کا باپ اور اس حویلی کے مزارعے یہ سب بھی ایسے ہی ظالم اور بدقماش لوگ ہیں، غریب لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلنا اور ان کی عصمتیں روندنا ان کا شیوہ ہے اور اپنی اس بدفعلی پر انہیں کسی قسم کی کوئی شرمندگی نہیں، انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں، حویلی میں کام کرنے والی کوئی بھی لڑکی چاہے وہ کسی بھی ذات عمر یا شکل کی ہو ان سے بچ نہیں سکتی، اس بار آپ کی غیر موجودگی میں میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے، بڑے لوگوں کے لئے ہم جیسے چھوٹے اور مفلس لوگوں کی عزت یا زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی بی بی جی ہمارا مفلوک الحال ہونا ہی ہمارا سب سے بڑا جرم ہوتا ہے جس کی ہمیں ساری زندگی سزا بھگتنا پڑتی ہے، مگر آپ کو کس بات کی سزا دی گئی ہے، بیگم صاحبہ؟ آپ کیوں ان ظالموں کے ہاتھوں میں آ گئی ہیں یہ جگہ آپ کے لئے نہیں تھی بی بی جی۔’’ نورالعین نجانے کتنی دیر تک اور کیا کیا بولتی رہی میں سوچنے سمجھنے سے قاصر سن ہوتے دماغ کے ساتھ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔

☆☆☆

‘‘جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔’’ پاکستان میں صرف یہی کچھ چل رہا ہے آج کل جس کے پاس اتھارٹی ہے طاقت ہے پیسہ ہے اور لمبی چوڑی جائیداد ہے بس وہی دوسروں کا مالک ہے۔’’ پانچ دن کے غیر حاضری کے بعد یونہی میں آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو آرگنائزیشن کی تین چار سٹاف ممبرز کو کسی وجہ سے

اسی موضوع پر بحث میں الجھا پایا۔

‘‘بالکل ٹھیک کہا تم نے مرینہ، ہم لوگ انتہا کی حد تک خود غرض اور مطلبی ہو چکے ہیں جب تک خود پہ نہ گزرے کسی کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ خود پر گزرے تو بھی صرف اپنی ہی تکلیف سمجھ میں آتی ہے کسی دوسرے کا احساس تو تب بھی نہیں ہوتا۔’’ مرینہ کی تائید کرتی ہوئی زین نے ایک نظر میری طرف دیکھا، میں اپنا بیگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے خود بھی آفس کی مین چیئر پر براجمان ہوئی۔

‘‘کیا ہماری حالت ان پہلی امتوں کی سی نہیں ہو چکی جن کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا تھا، کہ وہ چوری یا گناہ کا ارتکاب کرنے والے امیر اور اونچے طبقے کے بااثر افراد کو چھوڑ دیتے اور نچلے طبقے کے غریب لوگوں پر حد مقرر کرتے؟’’ فضیلہ نے بھی حصہ لیا، اس کی بات میری روح پر کسی تازیانے کی طرح لگی تھی میں دھیان سے انہیں سننے لگی۔

‘‘ہاں کیوں نہیں، ہم تو اچھوت اور برہمن کی طرح ذات پات کے نظام اور تضاد کا بری طرح سے شکار ہو چکے ہیں، صد افسوس کہ یہ سب اس دین کے پیروکار کر رہے ہیں جو برابری اور مساوات کا درس دیتا ہے، یہاں شاہ زیب قتل کیس کے سلسلے میں تو دبئی تک جا کر اس کے قاتل کو گرفتار کیا جاتا ہے مگر سر راہ چلتے ہوئے اٹھارہ بے گناہ اور معصوم افراد کو کوئی ایک ہی بندوق سے نکلنے والی گولیوں کا نشانہ بنا جاتا ہے اور کسی کو پرواہ تک نہیں کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ مرنے والے شاہ زیب کی طرح ایلیٹ کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنی سفید پوشی کا بمشکل بھرم رکھنے والے غریب لوگ تھے، یا یہ کہ ان کے باپ دادا شاہ زیب کے والد کی طرح آئی جی یا ڈی آئی جی پولیس نہیں تھے؟ شاہ زیب کو اور ان کی فیملی کو انصاف ملا یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے، ہم بھی چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان بے چارے غریب عوام کو بھی انصاف ملے ان کے ساتھ بھی عدل ہو۔’’ مرینہ کی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی تھی گو کہ وہ اس وقت بے حد جذباتی ہو رہی تھی مگر اس کا لفظ لفظ مجھے آئینہ دکھا رہا تھا۔

‘‘صرف یہ ہی نہیں معاشرے میں اگر عورت کا مقام دیکھ لیں تو بھی یہی عالم ہے، سچ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے جب امریکہ میں اپنی قوم کی بیٹی عافیہ صدیقی کی حالت زار کا ذکر ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ دکھ اس وقت ہوتا ہے جب نچلے طبقے کی عورتوں کو بھیڑ بکری سمجھ کر ان کے ساتھ نہایت ہی انسانیت سوز اور ناروا سلوک کیا جاتا ہے، نجانے ان درندہ صفت لوگوں کو یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ یہ بھی ان کی ہی بہنیں اور بیٹیاں ہیں، کیا ان عورتوں کے سینے میں دل نہیں یا ان کی عزت، عزت نہیں؟’’ مرینہ میری غیر ہوتی حالت و کیفیت سے بے خبر اپنی کہے جا رہی تھی، جبکہ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ صرف اور صرف مجھے کہہ رہی ہو۔

‘‘بی بی جی ہم غریبوں کی عزت کو کوئی عزت کیوں نہیں سمجھتا، ہم غریب ضرور ہوتے ہیں مگر امیروں کی بہن بیٹیوں کی طرح ہم بھی کسی کی بہنیں کسی کی بیٹیاں ہیں، ہماری عزت پامال ہونے پر ہمیں بھی اتنا ہی دکھ ہوتا ہے جتنا انہیں۔’’ نوری کے کہے گئے الفاظ ذہن میں گونجنے لگے، وہ صرف سترہ سال کی عمر میں کتنی گہری باتیں سوچنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔

افلاس نے بچوں کو بھی تہذیب سکھا دی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

چند دن پہلے نوری کی بیان کردہ حقیقت نے میرے وجود کو چھلنی کر دیا تھا، اب اپنی ٹیم ممبران کی باتیں (جو وہ لاعلمی میں کر رہی تھیں) مجھے گھائل ضرور کر رہی تھیں مگر ایک ایسی راہ بھی سمجھا رہی تھیں جس پر مجھے پانچ دن پہلے ہی چل پڑنا چاہیے تھا، میں نے اب تک شاہ نواز اور اس کی فیملی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا تھا، مگر اب چند لمحے لگے تھے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کہ میں عابد شاہ، شاہ نواز اور اس کے ساتھ اس گھناؤنے کھیل میں ملوث باقی افراد کے خلاف اپنی آرگنائزیشن کے تھرو مقدمہ دائر کروں گی اور ان تمام معصوم لڑکیوں کا بدلہ ضرور لوں گی جو ان کے ظلم کی چکی میں اب تک پستی آئی ہیں، اگر بات صرف میری زندگی یا میرے گھر کی ہوتی تو میں شاید خاموشی اور صبر سے سمجھوتہ کر لیتی مگر اب یہ میری شادی شدہ زندگی کا ہی نہیں سینکڑوں بے آبرو ہونے والی معصوم لڑکیوں کی زندگیوں کا سوال تھا، ہم کب تک رئیسوں کو مفلسوں کا خون چوستے دیکھیں گے؟ آخر کسی کو تو یہ قدم اٹھانا ہی ہے، صحیح کہا تھا زین نے کہ ہم لوگ خود غرض اور مطلب پرست ہیں ہم ہر حال میں صرف اپنی ہی سہولت یا تکلیف کا سوچتے ہیں، اس وقت اگر شاہ نواز کی جگہ کوئی اور ہوتا اور نور العین کی جگہ میری بہن تو......؟ اف کتنا محال ہے یہ سب سوچنا مگر میں اب ایسا ہی کروں گی جیسا اپنی بہن پر کوئی مصیبت آنے پر کرتی، انصاف تو ہو کر رہے گا چاہے اب مقابل عابد نواز ہو یا شاہ نواز یا میرے اپنے گھر کا کوئی اور فرد۔

''تو بابا جانی یہ تھا آپ کا پاکستان کے کلچر اور یہاں کے ماحول سے ناپسندیدگی اور بیزاری کا سبب؟ بابا جان آپ نے تو راہ فرار اختیار کر لی مگر آپ کی یہ بیٹی بزدلی نہیں دکھائے گی بلکہ اپنے حصے کی ذمہ داری نبھائے گی، گو کہ میں پورے پاکستان یا اس کے نظام کو بدلنے کی صلاحیت نہیں رکھتی لیکن کم از کم اپنا فرض تو ادا کر سکتی ہوں، اگر ہر فرد اپنے فرائض پورے کر دے تو پاکستان نام کا یہ ڈوبتا سفینہ ضرور اپنے ساحل پر پہنچ جائے۔''

''آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں فیصلہ کر چکی تھی چنانچہ پر عزم اور مستحکم لہجے میں بولی۔

''ہم لوگ واقعی برائی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں مگر ہم نے یہ ادارہ اور تنظیم صرف اسی لئے قائم کی ہے تاکہ ہم مظلوم اور بے کس و بے سہارا لوگوں کو ان کا حق دلا سکیں، ناتواں کے حقوق کی پاسبانی ہی ہمارا فرض ہے، چاہے اس کے لئے ہمیں کیسی ہی کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑے، آر یو ریڈی؟ (Hre you with me)۔'' پر جوش انداز میں کہتے ہوئے میں نے مرینہ، زین اور فضیلہ کے سامنے اپنے ہاتھ کو پھیلایا تاکہ وہ ایک بار پھر اس عہد کی تجدید کریں جو ہم نے اس ادارے کی بنیاد ڈالتے وقت اپنے آپ سے کیا تھا۔

تین عشروں کی کہانی

سیمیں کرن

رمضان آیا گزر گیا عید کے ہنگامے سرد ہوئے بھی کئی روز ہو گے بلکہ اب تو بقر عید کی آمد آمد ہے، بازاروں میں ابھی سے آنے والی عید کا سٹاک جمع کیا جانے لگا کچھ ہنگامے سرد ہوئے اور کچھ نئے ہنگامہ زندگی و عید کی تیاری ہے مگر۔

مگر میں اپنے اس دل کا کیا کروں جس میں برپا ہنگامہ سرد ہی نہیں ہوا اک عجب سی کشمکش و خلش ابھر آتی ہے جب بھی وہ بچی مجھے یاد آتی ہے میں اسے بھلا نہیں پاتی، پہروں سوچ چلی جاتی ہوں، اپنی بیٹی کو دیکھتی ہوں تو اس بچی کا سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے، میں خود کو اپنی اس بڑھی ہوئی حساسیت پر کوستی ہوں مگر روک

نہیں پائی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ تقریباً ایک ماہ روزانہ اس سے ملاقات ہوتی رہی تھی اور اس بچی نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا تھا، زندگی کے ہنگامے و مصروفیات اتنی ہیں کہ ہر وقت نہ سہی مگر جب بھی وقت ملا یا کوئی حوالہ کوئی یاد تو اس بچی نے مجھے بے چین ضرور کیا اور میں الٹی سیدھی سوچوں سے خود کو روک نہیں پائی کبھی یہ کہ یہ عید اس نے کیسی منائی ہوگی؟ کیا روتے ہوئے یا......

اور آنے والی بقر عید پر وہ بھلا کہاں ہوگی؟ اس کے نصیب کا کیا فیصلہ ہوا ہوگا؟

میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں کہ تراویح کے اجتماع میں وہ مجھے ملی تھی اپنی ماں کے ساتھ، وہ اس کا بھائی اور اس کی ماں یہ تین لوگ ان افراد میں شامل تھے جو میری طرح بڑی باقاعدگی سے دورہ قرآن سے مستفید ہونے کے لئے آتے تھے ورنہ تو ہمارا حال وہی ہے کہ ”اک چال ہے بے ڈھنگی سی سو تو ہے“ لوگ اور خواتین کا رش مسجدوں میں آپ کو جمعہ کے روز نظر آئے گا طاق راتوں میں رش بڑھ جاتا ہے جانے کون کون سے اکاؤنٹ ہیں جو اللہ سے ہم نے کھول رکھے ہیں گناہ و ثواب کے کھاتے، کسی فقیر کی طرح گن گن کر کشکول میں نیکیاں ڈالتے ہم مسلمان شاید اسی لئے زمانے بھر میں راندہ درگاہ و گرنہ حق تو یہ ہے کہ۔

جاں دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے حق ادا نہ ہوا

بات نکلی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی، بات تو ہو رہی تھی اس بچی کی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا عام سی بچی تھی معصوم سی پیاری سی بھولی بھالی یہی کوئی تین چار سال کی اور ساتھ جو بچہ تھا وہ تقریباً دو سال کا دونوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ سال سوا سال کا فرق ہوگا اور ان دونوں بچوں کے درمیان بے حال ہوتی ان کی دھان پان سی نازک سی ماں، دیکھنے میں کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی جو انسان کو مقید کرے مگر ہائے رے یہ حساس دل یہ چیزوں، واقعوں حادثوں اور لوگوں کو اور طرح سے لیتا ہے۔

محسن ہماری جاں پہ دہرا عذاب ہے
کہ ہمیں دیکھنا ہی نہیں سوچنا بھی ہے

مجھے اس بچی کی طرف جس چیز نے سب سے پہلے متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ نماز کی رکعتوں میں کچھ دیر کا وقفہ آیا اور ہم سب کچھ دیر کو سستانے کو بیٹھ گئے وہ خواتین جو اپنے بچوں کے ساتھ آئی تھیں اپنے بچوں کو خبر گیری کرنے لگیں، غالباً سدرہ ہی نام تھا اس عورت کا، سدرہ کے پاس بھی اس کے دونوں بچے آ کر کھڑے ہو گئے اس نے بیٹے کو گود میں لے لیا اور بڑے والہانہ انداز میں اسے پیار کرنے لگی جبکہ بچی کو اس نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا، وہ معصوم سی پھول سی بچی آنکھوں میں اک عجیب حیرت یاسیت و حسرت لئے اس کو دیکھتی رہی مگر سدرہ کی اک نگاہ کرم کی ملتفت بھی نہ ٹھہری۔

بس یہی وہ مقام تھا جو مجھے اس کی جانب متوجہ کر گیا اور پھر اس کے بعد میں نے لاشعوری طور پر اس کو نوٹ کرنا شروع کر دیا اور بنظر غور اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا، میں نے دیکھا کہ اکثر و بیشتر وہ حسرت و یاس کے تصویر بنی کھڑی ہوتی اور سدرہ اس سے سال بھر کے چھوٹے بچے کو بے تحاشا چومے چاٹے جاتی اور اس کو کبھی توفیق نہ ہوتی کہ اس معصوم بچی کو بھی کسی لمحے سینے سے لگا کر یا بانہوں کے دائرے میں لے کر تھپکی دے دے کیا وہ نگاہیں وہ معصوم نظریں توجہ حاصل کرنے کے جو سگنل خارج کر رہی تھیں وہ عورت ان سگنل سے انجان اور بے خبر تھی یا جان

بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی، میں سمجھ نہیں پائی اور جو میری عقل محدود میں آیا وہ یہی تھا کہ وہ بھی معاشرے کے ان بہت سے افراد میں سے تھی جو بیٹے اور بیٹی کے مابین فرق کرتے ہیں، کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ اس نے میری نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کیا اور بادل نخواستہ بچی کے گالوں یا پھر سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے پاس بٹھا لیا مگر میری جانب سے ناگواری سے منہ موڑ لیا، میری کوئی ایسی واقفیت تو تھی نہیں بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف دور سے سلام دعا تھی ایسے حالات میں عین ممکن تھا کہ وہ مجھے پوچھ بیٹھتی۔

”جی محترمہ کیا تکلیف ہے آپ کو کیوں میری بچی کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں؟“

میں اپنے آپ کو اس بچی کے سحر سے تو آزاد تو نہ کروا پائی مگر میں نے اپنی نگاہوں کو ضرور محتاط ہو جانے کا حکم دے دیا، بچی تھی بھی تو بڑی پیاری اس پر اس عمر میں اک عجب اداسی و گم صم سی کیفیت کا ہالہ سا اس کے گرد تنا ہوا تھا جو کسی بھی حساس نگاہ و دل کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔

آٹھ دس دن یونہی بیت گئے پہلا عشرہ تمام ہوا وہ بچی یونہی چپ چاپ گم صم سی رہتی سہمی سہمی حسرت سے کھڑی ہوتی اور حسرت سے اپنی ماں کو دیکھتی نہ آگے بڑھتی نہ اپنا حق طلب کرتی اور نہ ہی ضد بس ماں بیٹے کی محبت کے منظر کو حسرت سے دیکھے جاتی ایسے بے خود لمحوں میں میرا دل کرتا کہ اس ننھی منی گڑیا کو جا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں اور اپنے بے لوث اور محبت بھرے بوسوں سے اس کا منہ لال کر دوں اور اس کی پیاسی روح کو سیراب وہ ننھی سی پری جو اچھے لباس میں تو ہوتی مگر ملگجے بالوں گندے مندے ہاتھ پیروں کے ساتھ جیسے کسی نے بے توجہی اور بادل نخواستہ کپڑے بس بدن پر اٹکا دیے ہوں۔

☆☆☆

دو چار دن سے میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ بچی جیسے اس خود ترسی اور سہمی سہمی کیفیت سے باہر آ رہی ہے اور اگر اس کی ماں اس کو پیار نہیں کرتی وہ بھی نظر انداز کیے پیچھے بچوں کے ساتھ جا بیٹھتی اس کے رویے میں اک عجب سی سختی اکھڑ پن اور بے حسی سی محسوس ہونے لگی مجھے، گو کہ دوران تراویح اتنا وقت تو نہ ہوتا کہ میں بغور اس بچی کا جائزہ لے سکوں، گرمی کی شدت سے کبھی پانی پینے کے لئے باہر کولر تک آتے ہوئے یا مختصر وقفے میں جب بیٹھنے کو سانس لیتے ہوئے یا پھر کبھی جماعت کھڑی ہونے سے پہلے وہ بھی آ جاتی اور میں تو خیر روز ہی پہلے ہی موجود ہوتی تھی کیونکہ مسجد میرے گھر کے بہت قریب ہے تو بس یہی مختصر سا دورانیہ ہوتا جس میں اپنی نظروں کو میں اس چوری چوری تعاقب سے روک نہ پاتی اور اب میں دیکھ رہی تھی کہ وہی بچی جو شروع ایام میں بڑی سہمی ڈری نظر آتی تھی اب جیسے ہر رویے ہر سوچ کو نظر انداز کر رہی تھی، میں نے تاسف سے اس ماں پر آہ بھری جو اپنی بچی میں در آنے والی تبدیلیوں اور رویوں سے یکسر غافل تھی میں نے دل میں افسوس کرتے ہوئے سوچا، ”ایسی ہی مائیں ہوتی ہیں جو دھوکہ کھاتی ہیں۔“

☆☆☆

تیسرا عشرہ شروع ہوئے دو تین دن ہوئے تھے دوسری طاق رات تھی اور وہی بچی جو شروع میں بڑی سہمی سمٹی پھر سب کچھ نظر انداز کیے خاموشی کی، ردا اوڑھے الگ تھلگ کھیل میں مصروف ہو جاتی اب مسجد میں آنے والے تمام شرارتی اور شیطان بچوں کو سرغنہ بنے ہوئے تھی اتنا اودھم مچا رکھا تھا کہ گویا آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور خواتین میں یہ بحث جاری تھی کہ بچوں کو مسجد

لانا چاہیے یا نہیں؟ یہ بحث اپنی جگہ اک طویل نشست کی متحمل تھی مگر اس وقت عبادت کے لئے جوار تکاز چاہیے تھا وہ بچوں کے شور کے باعث مل نہیں رہا تھا اسی اثنا میں میرے ساتھ بیٹھی مسز ایوب میرے پاس کھسک آئیں اور سرگوشی میں بولیں۔

”یہ بچی جو سب سے زیادہ شور کرتی پھر رہی ہے اور نمازیوں کے آگے سے گزر جاتی ہے آپ کو پتہ ہے سدرہ کے دیور کی بیٹی ہے اس کی ماں کو طلاق ہو گئی ہے اور سامان بھی آج ٹرک میں واپس چلا گیا ہے۔“

دھڑ دھڑ مجھے یوں لگا کہ مسجد کی چھت میرے سر پر الٹ گئی ہے، مسز ایوب مزید گویا ہوئیں۔

”ابھی اس بچی کا فیصلہ ہونا باقی ہے فی الحال تو یہ باپ نے جانے دی مگر ابھی بات متنازعہ ہے بچی ابھی چھوٹی ہے اور ماں کا حق زیادہ ہے۔“ وہ جانے کیا کہہ رہی تھیں میرے کانوں کے پاس تو جیسے پٹاخے چھوٹ رہے تھے یا پھر سماعت بہری ہو گئی تھی اک ساعت کو زمین و آسماں گھومتے گلے ملتے نظر آئے اک پل ہی تھا مگر بہت بھاری گزرا جیسے جاں کنی کا عالم نزع کا وقت حشر کی گھڑی اک پل میں لمبا سفر، مجھ پر بھید کھلا کہ وقت کتنا اور کس طرح منطیق ہوتا ہے اور کیسے وہ رب سالوں میں پل اور ساعتوں میں ہزاروں سال بتا دینے پر قادر ہے۔

کہانی کا کیا ہے کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

ہونے کو کیا ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہو تو یہ بھی سکتا ہے کہ میاں بیوی اپنی حماقتوں اور بیوقوفیوں سے اس موڑ پر آ کھڑے ہوئے ہوں۔

یا پھر مرد بہت زیادہ ظالم شکی اور تشدد پسند ہو۔

ہونی تو کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

ہو سکتا ہے ساری غلطی ماں کی ہو وہ بسنا ہی نہ چاہتی ہو پہلا شک تو ہمیشہ عورت پر ہی جاتا ہے کہ وہ بسنا چاہتی تو سمجھوتا کر سکتی تھی۔

ہو سکتا ہے اس نے سمجھوتے کی آخری حد کو چھو لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہو۔

اور ہو تو یہ بھی سکتا ہے کہ۔

اس لڑکی کی زندگی میں پہلے سے کوئی اور تھا۔

یا پھر کوئی تیسری عورت درمیان میں آ گئی تھی۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے بات تو یہ ہے کہ اک گھر ٹوٹ گیا ایک بچی سے اس کے ماں باپ کی یک جہتی یکجائی چھن گئی۔

اس بچی کا معصوم بچپن چھین کر اسے حقائق کے تلخ جہنم میں بالغ ہونے بھیج دیا گیا۔

آنے والی عید یہ وہ کہاں ہو گی اپنی ماں کے گھر یا باپ کے پاس؟ کیا وہ تمام عمر یونہی لڑھکتی رہے گی اور ایسا ہی گھر بسائے گی جیسا کہ اس کے والدین نے...... بس یہی سوچیں مجھے اس کی یاد آنے پر بے چین کرتی ہیں اور میں اسے بھول نہیں پاتی۔

جو حساب کا بہی کھاتہ کھولوں تو ہر حال میں خسارہ اس معصوم جان کے حصہ میں آیا؟ کیا اسے پیدا کرنے والوں نے بھی یہ سوچا ہو گا؟ کاش گھر کے بکھرنے سے گھروندے کو توڑنے سے پہلے کوئی ان ننھی پروازوں کے بارے میں سوچے تو کہ یہ زمانے کی تند ہوا سے روندی جائیں گی۔

☆☆☆

کتاب نگری

دروازہ گل

علامہ ضیاء حسین ضیاء

تبصرہ: سمیں کرن

دروازہ گل ایک بڑے تخلیق کار کا بڑا کام ہے، دستک دیجئے ”دروازہ گل“ پر اور اک انوکھی اور نئی دنیا میں داخل ہو جائیے، جہاں آپ کو قدم بہ قدم ٹھٹکنا پڑے گا، منجمد حیرتیں آپ کو اپنی گرفت میں لے لیں گی، اک عجب ڈکشن آپ کا استقبال کرے گا، زبان و بیان کی نئی اصطلاحیں آپ پر منکشف ہوں گی۔

یہ ناول بجا طور پر علامہ ضیا حسین ضیاء کا ادبی کارنامہ ہے، وہ اپنی ذات میں اک ہمہ جہت شخصیت ہیں، وہ بیک وقت ایک ادیب شاعر مفکر و دانشور مذہبی اسکالر و صوفی ہیں اور ادبی مجلّہ ”زرنگار“ کے ایڈیٹر بھی، نفسیات فلسفہ اور تصوف خاص طور پر ان کا کارمیدان ہے، ان کے نام پر بہاول پور یونیورسٹی اور فیصل آباد جی سی یونیورسٹی میں ایم فل کی ڈگری دی جا رہی ہے۔

دروازہ گل بیک وقت اک نفسیاتی رومانی و جنسی ناول ہے، جس میں کہیں کہیں تصوف کا تڑکا بھی آپ کو ملے گا، زبان و بیان کا اک انوکھا آہنگ اک کلاسیکل احساس جو آپ کو عجب جہاں میں لے جائے گا، لفظ حرف اور جملے پرت در پرت کھلیں گے۔

ہر بار اک نئے معنی کا لطف دیں گے، محسوس ہو گا کہ یہ لفظ اس تخلیق کار پر کسی وحی کی صورت اترتے ہیں، انوکھی و دقیق اصلاحات کے باوجود ناول اپنے پہلے باب سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ اپنے کثیف بدن کو چھوڑ کر بدن لطیف کے ساتھ لکھاری کی پینٹ کی ہوئی تصویر میں اتر جاتا ہے۔

جی ہاں پہلے باب سے ہی لگتا ہے کہ یہ کوئی حسین خواب ہے کوئی خوبصورت منظر تخلیق کیا گیا ہے، کیا رومان اور وہ بھی میاں بیوی میں اس درجے کا بھی ہو سکتا ہے اک خوبصورت خواب رفاقت کا محبت کا جو ہر حساس دل بلا تخصیص مرد و زن اپنی آنکھوں میں سجاتا ہے دل میں کہیں چٹکیاں بھرتا ہے اور جس کے سحر میں خواتین اکثر مبتلا ہوتی ہیں شاید اسی لئے اس ناول کو خواتین نے بہت پسند کیا، دیکھئے نہ ضیاء حسین کسی قسم کی منوں کاری کرتا ہے غور کیجئے ان جملوں کی خوبصورتی اور مشاہدے کی گہرائی کو۔

”رفاقت کا زر خالص محبت کا بھرتہ، اعتماد کی کھیر اور ایک دوسرے کو کمبل کی طرح اوڑھنے کی عادت، اپنے بستر پر کھسک کر اپنے دوسرے ساتھی کے لئے جگہ بنانے کی فطرت اور سخاوت کیوں رخصت ہو جاتی ہے اور آخری بات پروفیسر تم مجھے یہ بتاؤ کہ میری اتنی لمبی بات سے تم بور تو نہیں ہوئے۔“

محسوس کیجئے ان چند لفظوں میں ازدواجی زندگی کی طوالت و سنجیدگی کو سمیٹ نہیں دیا گیا۔

رومان اور جنس اس ناول میں آپ کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دور تک ملیں گے مگر یہ کیسا جنسی ناول ہے جہاں ستا بازاری پن

کہیں دور دور تک نظر نہیں آتا جہاں عورت کو بازار حسن کی جنس سمجھ کر اس کے بدن کو زیر بحث نہیں لایا گیا اس کے برعکس یہ رومان اور جنس تو اپنی پہلی بیوی عطیہ اور پھر دوسری بیوی ڈاکٹر انیلا کے گرد گھومتے ہیں گویا ضیاء حسین لاشعور طور پر اپنی جنسی حدود کو متعین کر کے چلتا ہے۔

نفسیات کا پہلو دیکھئے کہ مرد و عورت کی بطور میاں بیوی نفسیات کو کیسے کوزے میں بند کر دیا ہے۔

”نشیب اور کمزوری ایک عورت اور مرد کی ایک نادیدہ حفاظت کرنے والی چار دیواری ہوتی ہے، عورت نشیب کے خوف پر نہ ہو تو اسے گرنے کا خدشہ نہیں ہو گا اور مرد فرازی پر نہیں ہو گا تو عورت اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کیوں کرے گی؟۔

”جان میری مجھے یہ احساس ضرور دلایا کرو کہ میں نشیب پر بیٹھی ہوں اور تم فراز پر۔“

اور پھر پروفیسر نے ہاتھ کو جھٹکا کر غصے سے روکا۔

”بند کرو اپنی یہ بکواس، میں پاگل ہو جاؤں گا عورت اس قدر بلند نہیں ہو سکتی جتنا تم اس کو پینٹ کر رہی ہو۔“

نتیجے مرد کی نفسیات بطور شوہر خواہ وہ خواب و خیال کی دنیا میں ہو، علمی مرتبے کے کسی درجے پر فائز ہو بیوی کو کبھی بلندی پر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

پروفیسر راجہ، عطیہ اور انیلا ناول، انھی تین کرداروں کے گرد گھومتا ہے اور عطیہ کون ہے؟ عطیہ اک پہیلی ہے باریک بین قاری ضرور کچھ مقامات پر ٹھٹک جائے گا اور عطیہ کو کھوجے گا۔

”عطیہ یا عطا۔“ رفاقت کا وہ دھڑکتا خواب ہے جو بہت سے سپنوں میں چھپا کنڈلی مارے بیٹھا ہے یہ مصنف کا بھی خواب ہے مگر اس خواب کو زبان دینے کی اور وہ بھی اس قدر خوبصورت، یہ جرأت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔

خود لذتی اک ایسا احساس موضوع ہے جسے چھیڑنے کے لئے بڑی مہارت اور مشاقیت درکار ہے ورنہ ذاتوں اور بدنوں سے اٹھنے والا تعفن ناک سڑا دے گا مار دے گا اور یہ دونوں چیزیں علامہ ضیاء کے پاس وافر ہیں، پروفیسر ڈاکٹر راجہ ایک ماہر نفسیات دان، ایک عالم و مفکر ایک دانشور ایک ایسا وجیہہ مرد جو کسی بھی عورت کا دل دھڑکا سکتا ہے اور ڈاکٹر انیلا عطیہ کی موجودگی کے باوجود ڈاکٹر راجہ کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

خود لذتی وہ اک عام عارضہ ہے جس میں بے شمار لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی تخیلاتی دنیا میں جیتے ہیں مگر پروفیسر راجہ جو جب ”وجودی برہان“ نے آ لیا تو وہ جس المناک انجام سے دوچار ہوئے وہ نہ صرف ان کے غیر معمولی ہونے کی دلالت ہے بلکہ قاری رنج و غم کے ساتھ غصے کا شکار بھی ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر راجہ کی ذہنی عظمت کے سامنے سرنگوں بھی۔

ایک غیر معمولی شخص جس کی اپنی جنسی حسی شریعت اور قانون نہیں جہاں اس کا اپنا ”جنسی اجتہاد“ چلتا ہے، جہاں اس کی عطیہ جانثار بیوی ڈاکٹر کے کہنے پر بچہ پیدا کرنے سے انکار کر دیتی ہے جو ایک جانثار عورت کی فطرت کے خلاف ہے اور قاری پل بھر کو سوچتا ہے کہ اتنے بڑے لکھاری نے اتنی اہم بات کو نظر انداز کر دیا جواب پانے کے لئے آپ کو ناول پڑھنا پڑے گا۔

ناول پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر راجہ کے کردار کو علامہ نے لاشعوری طور پر خود کو سامنے رکھ کر تراشا ہے وہ ہمہ وقت فلسفہ و تصوف اور علمی قابلیت کے عوامل سے یہ سچا کردار بہت زندہ اور خوبصورت ہے ہر بڑا رائٹر اپنے کسی نہ کسی کردار میں چھپا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کردار کو رائٹر نے بڑی گنجائش دی ہے ورنہ اس طرح کے نفسیاتی کردار اپنی وجاہت اور علمیت کھو دیتے ہیں، ان کے اطراف ان کے عوارض کی خبر دیتے ہیں مگر یہاں آپ کو اطراف کے کرداروں کی بھرمار نہیں ملے گی بڑے تنہا اور یکتا کردار ہیں یہ اسرار کی دھند میں لپٹے۔

لاہور کے منظر میں لکھا گیا یہ ناول جانے کیوں لگتا ہے کہ ایران کے گلابی جاڑے اور مہکتی شامیں گھل مل گئی ہیں۔

پروفیسر راجہ کا کردار آپ کو اپنی گرفت اور سحر میں مبتلا کر دے گا یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف خود اس کے سحر میں گرفتار و مرعوب ہے دیکھئے۔

انیلا میرے ذہن کی حکومت بہت بڑی ہے، وہاں اس سے بھی بڑے بچے پیدا ہو چکے ہیں، تم بس وجود میں رچا لینا مجھے میرا ”تیسرا لا دو“ ڈاکٹر راجہ ایک پیچیدہ اور پر اسرار کردار آخر تک آپ منکشف ہوتا چلا جائے گا عطیہ اور ڈاکٹر راجہ کی گفتگو کا ایک حصہ۔

”وہ عورت پریشان نہیں ہو گی راجہ تو اور کیا ہو گی؟ جس کا شوہر دس سالہ رفاقت کے بعد بے وفا ہو جائے اسے سزا تو ملنا ہے مگر طریق کار فرق ہو سکتا ہے۔“

قاری الجھتا ہے عطیہ کی پہیلی میں مزید الجھتا ہے، یہ وہ لمحہ ہے جو گیان بن کر میرے دل پر اترا کہ ہمہ جہت لوگوں کو محبت بھی ہمہ جہت چاہیے وہ اپنے رفیق حیات میں ہر رشتہ ہر محبت کو کھوجتے ہیں۔

اور پھر جب عطیہ کی الجھی پہیلی الجھا کر رکھ دیتی ہے تو انیلا ڈاکٹر راجہ کی ”وجودی برہان“ بن کر ڈاکٹر راجہ کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے، عطیہ کی مسلم موجودگی کے باوجود آخر وقت تک آپ انیلا سے نفرت نہیں کر پائیں گے

لمس اک آفاقی علامت ہے علامہ کے ہاں، یہاں یہ اپنے تمام تر وسیع مفہوم میں کارگر ملے گا آپ کو، آئینہ در آئینہ اعتبارات و تعیات پر سب علامہ کی مرغوب اصلاحات ہیں، یہی آپ کو ان کے روحانی تجربات کی وسعت و ماہیت بھی ملے گی۔

چوکیدار کا بار بار کہنا ”الٰہی رحم کرنا بڑا کتاب خواں آدمی ہے“ اور آخر میں ڈاکٹر راجہ کا ڈاکٹر انیلا کو صرف ایک رات کی سہاگن بنا کر پھر اک غیر فطری زندگی کے حوالے کر دینا اک جوگن و بیراگن نیا دنیا، قاری اک عجب خلش رنج و غصے کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ ناول آہستہ آہستہ دماغ و دل میں سرائیت کرتا جاتا ہے آئینہ در آئینہ حیرت جہاں چاہیے اپنا عکس دیکھ لیں۔

یہ ناول ان لوگوں کے لئے ہے جو نفسیات فلسفہ و تصوف میں دلچسپی رکھتے ہیں اور رومان و جنس کا اک انوکھا امتزاج جس کا تجربہ شاید پہلے آپ کو کبھی نہ ہوا ہو، اک بہت بڑی سچی تلخ حقیقت جس کو علامہ ضیاء حسین ضیاء نے بہت خوبصورت ملفوف و پوشاک دی ہے۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

القرآن

☆ ”اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔“ (سورۃ البقرہ)

☆ ”یہ مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہترین اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔“ (سورۃ الکہف)

☆ ”(اللہ کی ہدایت ہے کہ) یہ دین اسلام ہی میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے، یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے تا کہ تم متقی (اور پرہیز گار) بن جاؤ۔“ (سورۃ الانعام)

☆ ”رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی، میں ان کی ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔“ (سورۃ الاعراف)

علینہ طارق لاہور

حدیث نبوی ﷺ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”تم میں سے کسی کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ یہی سوال وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی دل میں ڈال دیتا ہے کہ جب ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پیدا کرنے والا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنے والا کون ہے؟

پس سوالات کا سلسلہ جب یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور رک جائے۔“ (بخاری و مسلم)

نعمانہ حسن، فیصل آباد

قرآن خوانی کی فضیلت

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمای کہ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن پاک کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ شانہ کے کاموں کو سب کاموں پر ایسی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔ (ترمذی، دارمی، بیہقی)

قرآن خواں کا مرتبہ:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا، بس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔ (ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

تلاوت قرآن حکیم کی فضیلت:

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ نماز میں قرآن شریف کی تلاوت بغیر نماز کی تلاوت سے افضل ہے اور بغیر نماز تلاوت تسبیح و تکبیر سے افضل ہے اور تسبیح صدقہ سے افضل ہے اور صدقہ روزہ سے افضل ہے اور روزہ آگ سے بچاؤ ہے۔ (بیہقی)

رافعہ سلیم، ملتان

نبی کریم ﷺ کا آخری خطبہ

9 ذی الحجہ 10 ہجری کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جو الوداعی خطبہ کہلاتا ہے اور جس کو پڑھ کر قیامت تک مسلمانوں کے دل ایمان سے منور ہوتے رہیں گے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگو! میری بات سنو، معلوم نہیں کہ میں اور تم پھر کبھی اس جگہ اکٹھے ہوں گے یا نہیں۔

لوگو! تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور عزتیں یقیناً ایک دوسرے کے لئے اس طرح احترام کے لائق ہیں جیسا کہ تم آج کے دن اس شہر کا اور اس مہینے کا احترام کرتے ہو، تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی نسبت سوال فرمائے گا۔

لوگو! عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اور تم پر عورتوں کے حقوق ہیں، عورتوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آؤ کیونکہ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لئے حلال کیا۔

اپنی امانتوں میں دیانت دار رہو اور گناہ سے بچتے رہو، سود حرام ہے آج کے بعد مقروض صرف اصل ادا کرے گا اور سب سے پہلے میں خود اپنے خاندان سے عباس بن عبد المطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔

زمانہ جاہلیت کے تمام جھگڑے مٹائے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھو، انہیں وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اگر ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو جو تم معاف نہ کر سکو تو ان کو جدا کر دو، کیونکہ وہ خدا کے بندے ہیں اور ظلم کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔

لوگو! میری بات غور سے سنو، جان رکھو کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، جو چیز ایک بھائی کی ملکیت ہے دوسرا نہیں لے سکتا، جب تک وہ خود بخوشی اسے نہ دے، اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائے رکھو۔

جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں یہ الفاظ پہنچا دیں، ممکن ہے وہ لوگ جو موجود نہیں ہیں ان لوگوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین سے دریافت کیا کہ ”کیا میں نے تم تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟“

ہر شخص نے جواب دیا کہ ”ہاں پہنچا دیا۔“

تین بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی سوال کیا اور اثبات میں جواب سن کر آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا۔

"اے اللہ! گواہ رہنا میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا اور اپنے کام کو پورا کر دیا۔"

ام عمان، گڑھی شاہو لاہور

درود پاک اور ہماری نجات

سرکار مدینہ سرور قلب و سینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے۔

☆ جو مجھ پر دن بھر میں پچاس بار درود پاک پڑھے تو قیامت کے دن میں اس سے مصافحہ کروں گا۔" (سبحان اللہ)

☆ بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود پاک نہ پڑھے۔

☆ میرے حوض کوثر پر قیامت کے روز کچھ گروہ آئیں گے جنہیں میں کثرت درود کی وجہ سے پہچانتا ہوں گا۔

☆ جو بندہ مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے اللہ عزوجل اس پر دس مرتبہ رحمت فرمائے گا، اب تمہاری مرضی مجھ پر زیادہ درود پڑھو یا کم۔

☆ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اللہ عزوجل اس کے لئے ایک قیراط اجر لکھتا ہے اور قیراط احد پہاڑ جتنا ہے۔

جو شخص مجھ پر درود پاک پڑھنا بھول گیا وہ جنت کا راستہ بھول گیا۔

نعیمہ حیدر، اوکاڑہ

میرے الفاظ میں سچائی

خیال:

تین آدمی میرے دوست ہیں، ایک جو مجھ سے محبت کرتا ہے، دوسرا وہ جو مجھ سے نفرت کرتا ہے اور تیسرا جو مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتا، کیونکہ پہلا محبت، دوسرا مجھے احتیاط اور تیسرا مجھے خود اعتمادی سکھاتا ہے۔

رشتے:۔

رشتے ضرورتوں سے تو نہیں پہچانے جاتے اور نہ ہی ضرورتوں سے بنتے ہیں اور نہ ضرورتوں کی تکمیل سے جڑے رہتے ہیں، محبت اور خدمت نہ ہو تو ایسی کوئی ایلفی ایجاد نہیں ہوئی جو کسی رشتے کو جوڑ سکے۔

حنا محمد حنیف میمن، لیاری کراچی

بے لوث نیکی

دور دراز سے آیا ہوا ایک تاجر مدینہ منورہ میں پریشان پھر رہا تھا، اس کا ایک کام اٹکا ہوا تھا، خلیفہ وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے، اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر مدعا بیان کرے، وہ اجنبی تھا اور سفارش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا، کسی نے بتایا آل جعفر کے پاس جاؤ، وہ سخی ابن سخی ہیں، غریبوں اور مسافروں کے ملجا و ماوئی ہیں، چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان کی سفارش کر دیں تاکہ اس کا کافی دنوں سے اٹکا ہوا کام ہو جائے۔

حضرت عبداللہؓ نے تمام روداد سنی اور اس بات کا یقین کر لینے کے بعد کہ اس سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی، اس کی سفارش فرما دی اور اس کا کام ہو گیا۔

تاجر بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی خوشی سے چالیس ہزار درہم آپؓ کی خدمت میں پیش کئے جس پر آپؓ نے یہ تاریخی فقرا کہا۔

"ہم آل ہاشم اپنی نیکی فروخت نہیں کرتے۔"

ارم نعمان، کراچی

قسمت

O قسمت وہ مارکیٹ ہے جہاں جدوجہد

چیزوں کی قیمت کو بڑھاتی ہے اور کاہلی انہیں گھٹاتی ہے۔ (بیکر)

O قسمت انسان اور جدوجہد کے درمیان ایک متحرک لنگر ہے۔ (ہارون)

O قسمت ملکیت کے طور پر نہیں، آزمائش کے طور پر تمہارے پاس آتی ہے۔ (رابن مور)

O قسمت ہم سے وہی کچھ چھینتی ہے، جو ہم کو دیتی ہے۔ (انجیلا)

O ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی نوک پر ہی ہوتا ہے۔ (گرین)

O قسمت ہمارے معاملات کو ہماری آرزؤں، تمناؤں سے بہتر طور پر چلاتی ہے۔ (کیوکزوئی)

شاہ زیب حسن، سرگودھا

خوشبو

تحقیقی

نیو یارک کی ایک تحقیقی جماعت کا کہنا ہے کہ اگر آپ اپنے ادارے کی کارکردگی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے دفاتر میں بھینی بھینی خوشبو سے بھر دیجئے۔

اس جماعت نے تحقیق کے لئے ایک سو بیس افراد کا انتخاب کیا، انہیں دفتر میں لکھنے پڑھنے کے عام کام کاج انجام دیئے تھے، آدھے لوگ ایسی جگہ پر رکھے گئے جہاں پر پھولوں کی ہلکی خوشبو تھی، باقی لوگ عام جگہ پر بٹھائے گئے وہاں پر خوشبو نہیں تھی۔

خوشبو والے افراد کی کارکردگی دوسروں کے مقابلے میں پچیس فیصد رہی۔

سعدیہ آصف، ایبٹ آباد

ضرورت

☆ جو نام دل کی ڈائری میں نقش ہو، اسے کاغذوں کی ڈائری پر رقم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ جو یادیں جسم کا حصہ ہوں، انہیں سجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ جن حقیقتوں کو نگاہیں آشکار کرتی ہوں، انہیں اظہار لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ جو تمنائیں بن مانگے مل جاتی ہیں، انہیں دعاؤں میں مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو تو پھر نجومیوں کو ہاتھ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ اگر خدا پر بھروسا ہو تو پھر کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ اگر ماں کی دعائیں ساتھ ہوں تو پھر کسی اور دعا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حفصہ علی، مانسہرہ

رشک

ایک محل کے بہت شاندار شمع دان نے ایک غریب مگر گھر کے بہت معمولی دیے سے کہا۔

"مجھے تمہاری قسمت پر رشک آتا ہے۔"

دیا بولا۔

"کیوں میرا مذاق اڑاتے ہو، کہاں تم اور کہاں میں، مجھ میں اور تم میں اتنا فرق ہے جتنا آسمان کے ایک تارے اور زمین کے ذرے میں ہوتا ہے۔"

شمع دان بولا۔

"دوست تمہاری قدر و منزلت مجھ سے بہت زیادہ ہے، میں روشنی پھیلاتا ہوں تو اس میں داد و عیش دی جاتی ہے اور تمہاری مدھم لو میں غریب کنبے کا بچہ اپنی نیند قربان کر کے دیر تک پڑھتا ہے۔"

آمنہ خان، میلسی

☆☆☆

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

آمیہ راؤ: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
تخلیق اپج پر ایک سورج
کوئی راز مجھ پر بھی منکشف ہو میرے خدا
میری ہستی کیا
میری بود کیا
میری حیثیت ترے سامنے
میرا زعم نام و نمود کیا
میرے دل میں تو جو نہیں بسا
میری ذات کا
یہ وجود کیا
اے میرے خدا کوئی روشنی
میری زندگی میں جمود کیا
کوئی راز مجھ پہ بھی منکشف ہو میرے خدا
راشد ترین: کی ڈائری سے ایک نظم
جدائی کیوں بھٹکتی ہے
سنو!
ماضی کے لمحوں سے یہی کہنا
جو دل کے ریگزاروں میں سفر محدود رکھتے تھے
کہیں گرد مسافت میں، کہیں صحرا کی بستی میں
کہیں تشنہ سمندر میں، کہیں دریا کی لہروں میں
کہیں پر آبشاروں میں، کہیں پر خواب زاروں
میں
کہیں تاروں کے جھرمٹ میں، کہیں خوابوں
خیالوں کی نئی خواہش سلگتی تھی
کہیں خوشبو کے جھرنوں میں، کہیں پھولوں
بہاروں میں
کہیں ندی کنارے پر، کہیں پیپل کی چھاؤں
میں، کہیں گاؤں کے کوچے میں
کہیں شام و سحر دونوں سریلے گیت گاتے تھے
جہاں اپنی نگاہوں میں کبھی مہتاب رکھتے تھے
ادھورے خواب رکھتے تھے
وہ لمحے قید میں اب تک مری چشم عنایت میں
جہاں کچھ دوریاں بھی تھیں
وہاں مجبوریاں بھی تھیں جہاں کچھ فاصلے بھی تھے
جہاں منزل نہ ملتی تھی، وہاں جانا ضروری تھا؟
کبھی تم نے یہ سوچا تھا جہاں سورج نکلتا ہے
جہاں سورج کے آنگن میں دلوں کی برف بستی بھی
بصد حیرت پگھلتی ہو وہاں پھر سوچنا کیسا؟
کبھی سود و زیاں میں ہے
مرا مطلب نہیں سمجھے؟
تمہیں اتنا ہی کہنا تھا!
محبت اک سمندر ہے کبھی گہرائیاں اسی کی نہیں
معلوم ہو سکیں، چلو مانا!
کہ تم نے بھی سفر جاری تو رکھا ہے
مگر عمروں کے ڈھلتے ہی سہارے چھوٹ جاتے
ہیں
سمندر ڈوب جائے تو کنارے چھوٹ جاتے ہیں
جنید شہزاد: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم
احساس
اک رات مجھے احساس ہوا
بے ربط فسانوں کا ردھم
حالات پہ لمحوں کا مرہم
بے چین محبت کا سنگم
حسرت کی سہانی دنیا میں

بے تابی کا بیتا عالم
مٹ جاتا ہے لٹ جاتا ہے
اک رات مجھے احساس ہوا
ہر بار پرانی یادوں کو
گزری برساتوں کو، رنگین سہانی راتوں کو
بے کار امیدوں کے جھرمٹ میں
الفت کی سوغاتوں کو
اس دل سے کیسے مٹاؤں گا
اک رات بھی احساس ہوا
پیڑوں کی صداؤں کا مطلب، بے تاب ہواؤں کا
مطلب، موسم کی گھٹاؤں کا مطلب
جو دل سے چرا لے یادوں کو، ایسی ہی اداؤں کا
مطلب
مجھ کو کچھ یاد دلاتا ہے
اک رات مجھے احساس ہوا
گلشن کی بہاروں کا وارث
معذور سہارں کا وارث، بدنام دیاروں کا وارث
جن کو چھو کر کچھ درد کے
ایسے پر خاروں کا وارث
کیا پائے گا کیا کھوئے گا
اک رات مجھے احساس ہوا
حنا محمد حنیف: کی ڈائری سے ایک نظم
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے
ہیں جیسے نظر آتے، اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے، یہ شہر نہ تھا ایسا
یہ روگ نہ تھے ایسے
دیوار نہ رشتے، زندان نہ تھی بستی
خلجان نہ تھی پستی
یہ آج خوبصورت ہے، اے وقت گواہی دے
حالات نہ تھے ایسے، تفریق نہ تھی ایسی
سنجوگ نہ تھے ایسے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے
رفعت ضیاء: کی ڈائری سے خوبصورت نظم
محبت
آؤ کہ بتائیں ہم تم کو
کیا چیز محبت ہوتی ہے
انسان کے دل پر انسان کی
پاکیزہ حکومت ہوتی ہے
کچھ حسن میں جدت ہوتی ہے
کچھ عشق میں چاہت ہوتی ہے
کچھ آنکھیں اشارہ کرتی ہیں
بس یونہی محبت ہوتی ہے
رابعہ کاظمی: کی ڈائری سے ایک نظم
دکھ
رائیگاں جانے کا دکھ
ہر نیا لمحہ گئے لمحے کا دکھ
جو گزشتہ تھے وہ آئندہ نہیں
اور آئندہ کبھی پایا نہیں
کچھ اگر پایا تو رائیگاں جانے کا دکھ
انجم فراز سومرو: کی ڈائری سے ایک غزل
لٹتی عزتیں اور کٹتے سر ہیں
گھر والے دیکھو بے گھر ہیں
دھوپ بھی سر پر بہت ہے
بے سائے سے آج شجر ہیں
اپنا گھر بھی اب ٹوٹ گیا ہے
کچھ ادھر ہیں کچھ ادھر ہیں
تارے بھی ہیں بکھرے بکھرے
ٹوٹے سارے شمس و قمر ہیں
ہر پل کی خبر جو رکھتے تھے
میری حالت سے بے خبر ہیں
دلوں میں انجم بے خبری ہے
وہ بھی ادھر ہیں ہم ادھر ہیں

بشریٰ امین: کی ڈائری سے ایک نظم

ایک تھی پری
میں کیسے بھول جاؤں تمہارا وہ انگلی سے
میرے ماتھے کو چھو کر
میرے ہونٹوں تک لانا
پھر کچھ سوچ کر
اپنے دانتوں میں دبا کر مسکرانا
پھر مجھے کسی جن اور پری کی اکثر کہانی سنانا
یوں میرے روٹھنے پہ مجھ کو منانا
پھر اچانک کوہ قاف سے آئی خبر
ہمارا ایک جن آیا ہے ادھر
پری کے کسی نے جیسے کاٹ ڈالے پر
سوا سے جانا تھا چھوٹے نہ محبت کی دنیا
جدائی کا دستور ہے اس دنیا میں صدیوں سے رائج
صدمے نے اسے یوں کیا نڈھال
بھول گئی جس سے وہ اپنی ہی چال
اپنے ہوش گنوا کر
بھٹکتی رہی وہ کسی صحرا میں
اب میں چاندنی راتوں میں کسی ندی کے پار
پورے چاند کی روشنی میں
سوچتی ہوں کہ
اس کہانی کے کردار تو ہم دونوں تھے

مہناز فاطمہ: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

گئے برس کی یہی بات یادگار رہی
فضا غموں کے لئے خوب سازگار رہی
اگرچہ فیصلہ ہر بار اپنے حق میں ہوا
سزائے جرم بہرحال برقرار رہی
بدلتی دیکھیں وفاداریاں بھی وقت کے ساتھ
وفا جہاں کے لئے ایک کاروبار رہی
اب اپنی ذات سے بھی اعتماد ان کا اٹھا
وہ جن کی بات کبھی حرف اعتبار رہی
خبر تھی گو اسے اب معجزے نہیں ہوتے
حیات پھر بھی مگر محو انتظار رہی
نہ کوئی حریف ملا نہ کوئی کلمہ خیر
یہ زیست اب نہ کسی کے بھی زیر بار رہی
یہ اور بات کہ دل غم میں خود کفیل ہوا
مگر وہ آنکھ میرے غم میں اشکبار رہی

نورین عمر: کی ڈائری سے ایک نظم

گر مجھے اس کا یقیں ہو میرے ہمدم میرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ تیرے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی، تیرے سینے کی جلن
میری دلجوئی، میرے پیار سے مٹ جائے گی
گر میرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر تیرا اجڑا ہوا بے نور داغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو میرے ہمدم میرے دوست
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
یہ میرے گیت تیرے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جراح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزاد سہی
تیرے آزاد کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا میرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

عظمیٰ سحر: کی ڈائری سے ایک غزل

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا
راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لئے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر اس شہر میں مجھے نامعتبر اس نے کیا
شہر کو برباد کرکے رکھ دیا اس نے منیر
شہر بھر پہ یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

تمکین حسن: کی ڈائری سے ایک غزل

آج برسوں کے بعد دیکھا ہے
اب بھی آنکھوں کا رنگ گہرا ہے
وہ ماتھے سانولی سی لکیر
دل میں کتنے دیے جلاتی ہے
تیری قامت کے سائے کی خوشبو
گفتگو میں بہار کا موسم
بے سبب اعتبار کا موسم
کیوں مجھے ڈھنگ یاد رہے
کتنی حیراں ہو گئی خود پر
میں تجھے آج تک نہیں بھولی
پچھلے موسم کی یاد باقی ہے

علینہ طارق: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

شامل نقش کارواں ہیں ہم
اب فقط یاد رفتگاں ہیں ہم
ہم وہ آنسو کہ جو چھلک نہ سکے
یعنی اک سعی رائیگاں ہیں ہم
جس سے کل زندگی میں گرمی تھی
اب اسی آگ کا دھواں ہیں ہم
دیکھنے میں گرچہ شمع خموش
جگمگائیں تو کہکشاں ہیں ہم
سمٹ سکیں تو ایک قطرہ اشک
پھیل جائیں تو بیکراں ہیں ہم
ہم کہ ارزاں ہوئے سر بازار
نہ ملیں تو بہت گراں ہیں ہم
دل کی دھڑکن بھی سو چکی شہزاد
کوئی آواز دو کہاں ہیں ہم

لائبہ رضوان: کی ڈائری سے ایک نظم

چن لو اپنے اپنے خواب
اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
گلابوں اور مہتابوں کا
ہر آنکھ طلب سے بوجھل ہے
ہر خواب کسی کی منزل ہے
یہ شام سے کا دھندا ہے
اس وقت یہاں پر مندا ہے
ایمان کی قیمت دو آنے
احسان کی قیمت دو آنے
توقیر ملے گی دو آنے
تشہیر کی قیمت دو آنے
ہر خواب کی قیمت دو آنے
چن لو اپنے اپنے خواب

توفیق نعمان: کی ڈائری سے ایک غزل

آج ہم ناگہاں کسی سے ملے
مدتوں بعد زندگی سے ملے
شمع کیا چاند کیا ستارے کیا
سلسلے سب کے تیرگی سے ملے
ان اندھیروں سے کوئی کیسے بچے
وہ اندھیرے جو روشنی سے ملے
خود سے ملنے کو ہم سب ہی سے ملے
زندگی کے سلوک کیا کہیے
جس کو مرنا ہو زندگی سے ملے
ہم پہ گزرا ہے وہ وقت بھی خمار
جب شناسا بھی اجنبی سے ملے

☆☆☆

حنا کی محفل

عین غین

نعیم شہزاد ----- چکوال

س: عین غین بھائی کیا آپ نے چھٹیوں کا کام مکمل کرلیا ہے؟ اگر نہیں تو چکوال آجائیں میں آپ کی مدد کردوں گا؟

ج: اپنا کام تو دوسروں سے کرواتے ہو اور میری مدد کرنا چاہتے ہو حیرت ہے۔

س: عین غین بھائی ایمانداری سے بتایئے دن میں کتنی نمازیں با جماعت پڑھتے ہیں؟

ج: تم نے کیا صلوۃ کمیٹی جوائن کرلی ہے۔

س: عین غین بھائی سنا ہے کہ آپ کی منگیتر نے آپ کی تصویر دیکھ کر منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی ہے؟

ج: انگوٹھی دیکھ کر واپس کی تھی ٹھیک کروانے کے لئے۔

س: کریم لگانے کے ساتھ ساتھ گرلز کالج کے سامنے دھوپ میں کھڑے ہونے سے گریز کریں کیونکہ دوائی کے ساتھ پرہیز ضروری ہے ورنہ......؟

ج: سچ کہا آخر تجربہ بول رہا ہے۔

رابعہ زین ----- لاہور

س: حال کیسا ہے جناب کا؟

ج: کیا خیال ہے آپ کا۔

س: آخر بھینس کے آگے ہی بین کیوں بجائی جاتی ہے آپ کے آگے کیوں نہیں؟

ج: اس لئے کہ میں آپ جیسا رسپانس نہیں دے سکتا۔

س: اول فول کب بکا جاتا ہے؟

ج: جب انسان اپنے آپ سے باہر ہو۔

س: گھگھی کیوں بندھ گئی؟

ج: تمہیں دیکھ کر۔

س: کوئی اچھی سی دعا؟

ج: خوش رہو۔

محمد بن شہزاد ----- سیالکوٹ

س: وہ چپکے سے پیچھے کھڑی ہو کر میری آنکھوں پر نرمی سے بڑے پیار سے ہاتھ رکھ کر بولی؟

ج: اٹھو جا کر برتن دھوؤ۔

س: ذرا جلدی سے یہ بتائیں کہ زندگی کا سب سے حسین سانحہ کیا ہے؟

ج: محبت۔

س: ہمیں دیکھتے ہی ان کا رنگ زردے کی طرح پیلا کیوں ہو جاتا ہے؟

ج: سمجھ جاتے ہیں کہ اب دو تین گھنٹے آپ کی سننی پڑے گی۔

س: ان سے مل کر ہم کچھ بدل سے گئے ہیں بھلا کس سے؟

ج: جو آپ سے برتن دھلواتے ہیں۔

س: درد میٹھا ہو تو رک رک کے کسک ہوتی ہے؟

ج: مٹھاس زیادہ ہو جاتی ہے نا اس لئے۔

آصفہ نعیم ----- حافظ آباد سٹی

س: وہ کہتے ہیں، ”موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو“ آخر وہ محل کہاں ہے جہاں موقع دیکھ کر بات کی جاتی ہے؟

ج: ان سے کہو نا کہ تمہیں ایک بار دکھلائیں، میرے ساتھ جاؤ گی تو ناراض ہو جائیں گے۔

س: کل لوگ تمہارے سامنے لال رنگ کا رومال کیوں لہرا رہے تھے؟

ج: تمہیں جو گزارنا تھا اس لئے سڑک پہ ٹریفک روک رہے تھے۔

س: مبارک ہو تم کو یہ شادی تمہاری سدا خوش رہوں یہ دعا ہے ہماری؟

ج: کون سی شادی۔

عنایا بھٹی ----- شیخوپورہ

س: کیا دنیا واقعی گول ہے؟

ج: کون کہتا ہے نہیں ہے۔

س: کچھ تو سوچو؟

ج: سوچ ہی تو رہا ہے۔

س: اپنی ہی کیوں ہانکتے ہو؟

ج: اور کیا نہیں ہانکوں۔

س: لوگوں نے محبت کے نام کو بدنام کیوں کر رکھا ہے؟

ج: لوگوں نے محبت کے نام کو نہیں محبت کو بدنام کر رکھا ہے۔

س: آج کل لوگوں کی مسکراہٹ میں بھی طنز ہوتا ہے؟

ج: اسی کو طنزیہ مسکراہٹ کہتے ہیں۔

س: اس مطلب کی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں؟

ج: مطلب کی دنیا سے باہر بھی جھانک کر دیکھو۔

ثوبیہ نعمان ----- لیہ

س: بوجھو تو میں کون ہوں؟

ج: نام سے صاف ظاہر ہے۔

س: دل کی دل میں ہی رہ جاتی ہے؟

ج: لیکن آنکھیں ظاہر کر دیتی ہیں۔

س: بتاؤ تو وہ کون ہے؟

ج: کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

س: یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟

ج: کوئی سگریٹ سے دل بہلا رہا ہوگا۔

س: چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے؟

ج: کون سے گلشن میں آؤں۔

س: آخری بار دیکھ لو مجھ کو؟

ج: ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔

ثروت داؤ ----- خانپور

س: تمہیں میری حالت کی خبر نہیں کیا؟

ج: میں ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔

س: یہ دامن چھڑا کر جانا تھا تو؟

ج: تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

س: یہ محبت کا دستور نہیں ہے؟

ج: میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتی ہو۔

س: یہ برسات کا موسم یہ رم جھم کا سماں یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا؟

ج: یہ برسات کا موسم یہ چبھتی ہوئی دھوپ اور بند ہوا۔

س: یہ دل بہلتا ہی نہیں کسی پل؟

ج: ایسے حسین موسم میں دل کیا بہلے گا۔

س: میں نے اسے پانے سے پہلے ہی کھو دیا؟

ج: اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

رنگ حنا

بلقیس بھٹی

مجھے معلوم نہ تھا

عشق کا ناس کرو گی مجھے معلوم نہ تھا
میرے پلے ہی پڑو گی مجھے معلوم نہ تھا
ایک مہینے میں کماتا ہوں جو تنخواہ اسے
خرچ ہفتے میں کرو گی مجھے معلوم نہ تھا
میں نے کھائی تھی قسم کھاؤں گا بس رزق حلال
تم احمق ہی کہو گی مجھے معلوم نہ تھا
زندگی میں ہی مجھے دیکھنا ہو گا یہ دن
مجھ کو مرحوم بکو گی مجھے معلوم نہ تھا
عید کے دن بھی وہی جنگ کا نقشہ ہو گا
عید کے دن بھی لڑو گی مجھے معلوم نہ تھا
سخت جانی میں بھی نکلو گی مثالی یعنی
مار کر مجھ کو مرو گی مجھے معلوم نہ تھا
پتا ہوتا تو نہ کرتا کبھی کوئی نیکی
تبھی جنت میں ملو گی مجھے معلوم نہ تھا

رافعہ سلیم، ملتان

قیدی

ایک قیدی بیمار پڑھا تو اس کی مزاج پرسی کے لئے جیلر آیا، پوچھا۔

‘‘سناؤ بھئی کیسے ہو؟’’

قیدی نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

‘‘جی پہلے ٹانگ میں درد تھا ڈاکٹر نے وہ کاٹ کر پھینک دی بازو میں درد تیز ہوا تو اسے بھی کاٹ ڈالا، اب کان میں شدید درد ہے لازماً اسے بھی کاٹ کر باہر پھینک دیا جائے گا۔’’

‘‘اچھا تو یہ بات ہے تم اس طرح آہستہ آہستہ جیل سے فرار ہونا چاہتے ہو۔’’

ریحانہ کاظمی، حافظ آباد

گدگدیاں

بچہ۔ ‘‘ڈیڈی آپ نے جو گلاب کی قلم لگائی ہے اسے ایک ہفتہ ہو گیا ہے لیکن اب تک اس کی جڑیں نہیں نکلیں۔’’

ڈیڈی۔ ‘‘تمہیں کیسے پتہ چلا؟’’

بچہ۔ ‘‘میں اسے روزانہ اکھاڑ کر جو دیکھتا ہوں۔’’

……

شوہر بیوی سے۔ ‘‘بیگم ذرا بتانا تو کہ لندن میں ہم کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟’’

بیوی۔ ‘‘ذرا ٹھہریے میں ہوٹل کے چمچے دیکھ کر بتاتی ہوں۔’’

……

ریل کے ڈبے میں دو مسافر ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سفر کر رہے تھے، ٹرین چلی تو کچھ دیر بعد ایک مسافر نے کہا۔

‘‘ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔’’ اور یہ کہہ کر کھڑکی بند کر دی۔

تھوڑی دیر بعد پہلے مسافر نے ‘‘دم گھٹ رہا ہے’’ کہہ کر کھڑکی کھول دی۔

کچھ دیر بعد دوسرے مسافر نے ‘‘سردی لگ رہی ہے’’ کہہ کر کھڑکی بند کر دی، کچھ دیر بعد دوسرے نے ‘‘بہت گرمی ہے’’ کہہ کر پھر کھڑکی کھول دی، دونوں بار بار یہی کرتے رہے اور بالآخر آپس میں جھگڑنے لگے۔

یہ دیکھ کر تیسرے مسافر نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔

‘‘ارے بھائی لڑتے کیوں ہو کھڑکی میں تو شیشہ ہی نہیں ہے۔’’

نبیلہ راشد، واہ کینٹ

سڑک پر چلنے کے چند اصول

س: پیدل کہاں چلنا چاہیے؟
ج: اپنے گھر میں۔
س: اگر فٹ پاتھ ہو تو سڑک پر کس طرح چلنا چاہیے؟
ج: اللہ کا نام لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔
س: سڑک کہاں سے پار کرنی چاہیے؟
ج: جہاں سے موقع ملے۔
س: چالان سے بچنے کا طریقہ؟
ج: ایک دعا ٹریفک کانسٹیبل اندھا ہو۔

سیماب علی، سکھر

قابل دید

پڑوس میں نیا کرایہ دار جوڑا آ کر آباد ہوا، ایک روز بیگم آنسو نے کہا۔

‘‘دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں شوہر باہر جانے لگتا ہے تو دروازے پر کھڑے ہو کر بیوی کا ہاتھ دباتا ہے، پھر سڑک پر جا کر کئی بار پیچھے گھوم گھوم کر دیکھتا ہے۔’’

بیگم آنسو نے سرد آہ بھری۔

‘‘مجھے تو رشک آتا ہے دونوں پر۔’’ بیگم آنسو نے دوبارہ کہا۔

‘‘تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟’’

شوہر نے حیرت سے کہا۔

‘‘میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں، میں تو اس عورت کو جانتا تک نہیں۔’’

لائبہ رضوان، فیصل آباد

اخروٹ

کم عمر لڑکوں کی ایک عدالت میں چار ایسے بچوں کو پیش کیا گیا جو قانون توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے، مجسٹریٹ نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

‘‘تم پر کیا الزام ہے؟’’

لڑکے نے بتایا۔

‘‘میں نے مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے، پبلک پارک میں آگے جلائی تھی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔’’

‘‘اور تم نے کیا کیا ہے؟’’ مجسٹریٹ نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔

‘‘میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے پبلک پارک میں آگ جلائی تھی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔’’

‘‘اور تم نے؟’’ تیسرے سے پوچھا گیا۔

‘‘میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے، پبلک پارک میں آگ جلائی اور اخروٹ کو تالاب میں پھینک دیا تھا۔’’

چوتھے لڑکے سے پوچھا گیا تو وہ بولا۔

‘‘میں نے بھی مسٹر جون کے باغ سے ٹماٹر توڑے تھے اور پبلک پارک میں آگ جلائی تھی۔’’

‘‘اپنے ساتھیوں کی طرح تم نے اخروٹ کو تالاب میں کیوں نہیں پھینکا؟’’

لڑکے نے بتایا۔

‘‘کیونکہ اخروٹ تو میں خود ہوں۔’’

عمیرا احمد، ساہیوال

نااہل

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک نوجوان کو زبردستی فوج کی بھرتی کے دفتر لے جایا گیا، نوجوان کے معائنہ صحت کے ضروری مراحل سے بخیر و خوبی گزرنے کے بعد فوجی ڈاکٹر نے دیوار پر آویزاں چارٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

پوچھا۔

"دیکھو سامنے چارٹ میں کیا لکھا ہے، پڑھ کر سناؤ۔" نوجوان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چارٹ کو دیکھا اور کہا۔

"کون سا چارٹ؟"

ڈاکٹر سمجھا نوجوان گھبرا گیا ہے، بولا۔

"اچھا اس کرسی پر بیٹھو۔"

نوجوان نے اندھوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"جناب کون سی کرسی؟"

ڈاکٹر نے نوجوان کی کمزور بینائی پر اسے نااہل قرار دے دیا۔

نوجوان خوشی کے عالم میں رات فلم دیکھنے چلا گیا، اچانک اس کی نظر ساتھ والی کرسی پر پڑی جس پر وہی فوجی ڈاکٹر بیٹھا تھا، نوجوان کو اور تو کچھ نہ سوجھا حواس پر قابو پاتے ہوئے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

"کیوں سر یہ بس سیدھی بر ما جاتی ہے؟"

نبیلہ نعمان، گلبرگ لاہور

خطوط

ایک معزز تاجر نے پوسٹ آفس فون کر کے کہا۔

"کچھ عرصے سے مجھے نہایت دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں، کیا آپ یہ سلسلہ بند کروانے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" پوسٹ ماسٹر نے خلوص سے جواب دیا۔

"آپ کو اندازہ ہے کہ یہ خطوط کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" تاجر نے جواب دیا۔

"انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے۔"

عنبرین انجم، حویلیاں

چھری کانٹے کے ساتھ

ایک پادری کو آدم خور قبائلی پکڑ کر لے گئے اور اپنے سردار کے سامنے پیش کیا، پادری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سردار اچھی انگریزی بول رہا تھا اور آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔

اس نے سردار سے پوچھا۔

"آپ تو آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں، مجھے کھائیں گے کیسے؟"

سردار نے اطمینان سے جواب دیا۔

"چھری کانٹے کے ساتھ۔"

ثوبیہ اسد، جہلم

بیوی

ایک کلرک نے جھجکتے ہوئے اپنے مالک سے کہا۔

"سر! میری بیوی نے کہا ہے کہ آپ سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کروں۔"

مالک نے جواب دیا۔

"خوب! میں اپنی بیوی سے پوچھوں گا کہ میں تمہاری تنخواہ بڑھا سکتا ہوں یا نہیں؟"

علینہ طارق، لاہور

لغو گفتگو

جج نے ملزم سے پوچھا۔

"ٹریفک کانسٹیبل کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے لغو گفتگو کی ہے؟"

"ہرگز نہیں جناب عالی۔" ملزم بولا۔

"دراصل وہ مجھے اس طرح ہدایت دے رہا تھا جیسے میری بیوی دیتی ہے تو حسب عادت بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ ٹھیک ہے میری جان۔"

مہناز فاطمہ، خوشاب

آرام

موسلا دھار بارش میں ایک صاحب نے خوبصورت لڑکی کو اپنی کار کا ٹائر بدلنے کی کوشش کرتے دیکھا، انہوں نے اپنی کار روکی اور لڑکی کی کار کا ٹائر بدلنے میں مصروف ہو گئے، خاصی دیر کی محنت کے بعد جب کام پورا ہوا تو انہوں نے چہک کر کہا۔

"لیجیے محترمہ آپ کا کام ہو گیا۔"

لڑکی بولی۔

"ششش...... زور سے نہ بولیے نہیں تو میرے شوہر جاگ جائیں گے وہ پچھلی سیٹ پر آرام کر رہے ہیں۔"

ثروت راؤ، خانپور

کلاشنکوف

"ارے اسعد! تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟"

"بھئی مجھے تو فیل ہونے کے ڈر اور شرمندگی سے نجات مل گئی۔"

"تم نے اتنی محنت کیسے کی؟"

"اس کے لئے محنت کی کیا ضرورت ہے؟ کلاشنکوف کے استعمال سے پرچے آسان بھی اور حل بھی، اس کو تین گھنٹے ایگزامنر کی کنپٹی پر لگائے رکھیں پھر کمال دیکھیں۔"

"مان گئے جادو ہے کلاشنکوف میں۔"

تمکین حسن، کراچی

ایک منٹ

ایک خاتون نے محکمہ زراعت کے مشاورتی آفیسر سے فون پر دریافت کیا۔

"میں مرغی خانہ کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں، مہربانی کر کے یہ بتائیے کہ چوزوں کو کتنا عرصہ مرغی کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

"ایک منٹ خاتون۔" مشاورتی آفیسر نے جواب دیا، وہ اس وقت دوسرے ٹیلی فون پر مصروف تھا۔

"بہت شکریہ۔" خاتون نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پلوشہ، چارسدہ

بیمہ زندگی

ایک بیمہ ایجنٹ نے مجاز کو بیمہ زندگی کے بے شمار فوائد گنواتے ہوئے کہا۔

"مجاز صاحب کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گے کہ آپ کی بیوی بچوں کو یک مشت دس لاکھ روپے مل جائیں تاکہ وہ اطمینان سے زندگی بسر کریں۔"

مجاز نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"یقیناً میں یہ پسند کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے بیوی بچے دے گا کون؟ آپ یا آپ کی کمپنی؟"

نورین عمر، کوئٹہ

گناہ

بیوی شادی کی سالگرہ کے موقع پر شوہر کو ساتھ لے کر ساڑھی خریدنے گئی، جو ساڑھی اس نے پسند کی اس کی قیمت بہت زیادہ تھی، شوہر نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو چونکہ قیمت بہت زیادہ ہے اس لئے یہ فضول خرچی ہی نہیں بلکہ گناہ بھی ہے۔"

بیوی نے یہ سن کر اطمینان سے جواب دیا۔

"فضول خرچی آپ کریں گناہ کی فکر نہ کریں وہ میرے ذمہ رہا۔"

عظمیٰ سحر، ملتان

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

ہماراؤ ---- کراچی
دنیا کو تو حالات سے امید بڑی تھی
پر چاہنے والوں کو جدائی کی پڑی تھی
یوں دیکھنا اس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی

....

تمہاری آنکھ سے دل تک سفر کرنا ہے بس ہم کو
یہ کتنی خوبصورت منزلوں کا راستہ ہو گا
اگر تم روٹھ جاؤ تو ہماری جان نکل جائے
مگر یہ خود ہی سوچو تم میں کتنا حوصلہ ہو گا؟

....

محبت آدمی بھی ہے خدا بھی
محبت ہی مکان و لامکاں ہے
اسی رشتے کو کہتے ہیں محبت
جو تیرے اور میرے درمیاں ہے
آمنہ وحید ---- سکھر
ان کی اداؤں کا کیا ذکر کریں کسی سے
لمحوں میں تو وہ اپنی عادت بدل جاتے ہیں
محفل میں ہو ذکر جب بھی تیرا
دیکھنا کس انداز سے وہ بات بدل جاتے ہیں

....

کبھی ہنسی کو ہونٹوں سے جدا بھی کرو
اور یہ سوچ کے جیو کہ کبھی سارا نہیں ملتا
کچھ لوگ عمر بھر گھاٹے کا سودا کرتے ہیں
کچھ ہیں جنہیں ڈھونڈنے سے بھی خسارا نہیں ملتا

....

تعلق توڑے کو اسے اک عرصہ ہوا اسے
پھر بھی وہ جہاں گیا پہچانا میرے نام سے گیا
اُم حبیبہ ---- اوکاڑہ
ہائے آداب محبت کے تقاضے ساغر
لب ہلے اور شکایات نے دم توڑ دیا

....

آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں ساغر کو خدا یاد نہیں

....

پتہ ہے تو کچھ یا صدیوں کی مسافتوں میں
اسی لئے ہر وقت تیری تلاش رکھتے ہیں
حنا ناز ---- پنڈدادنخان
جو دل میں اتر جائے سچی بات کی طرح
مجھے تلاش اسے ہم سفر کی ہے

....

تقدیر کے مضمون پہ کیا سوچ رہے ہو
تم نے کبھی تتلی کا تماشا نہیں دیکھا

....

اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک لڑکی ہے مر جائے گی
حنا وقاص ---- لیاری کراچی
اے میرے کچھ نہ سوچنے والے
اپنے بارے میں کچھ تو سوچا کر
کون بانٹے گا دکھ تیرے محسن
دوستوں سے بھی چھپ کے رویا کر

....

سب سے الگ سب سے جدا
صرف ہے میرا خدا

....

نا ہی آغاز اور نا ہی انجام
خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چارو طرف ہیں راستہ کوئی نہیں
مریم اسلم ---- لاہور
روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو
کچی مٹی تو مہکے گی ہے مٹی کی مجبوری

....

ہم کو معلوم تھا انجام محبت ہم نے
آخری حرف سے پہلے قلم توڑ دیا

....

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم نے روکا بھی تو کب اس کا ٹھہر جانا ہے
نادیہ ساجد ---- جہلم
یادوں کی آگ میں میری آنکھیں سلگ اٹھیں
راتوں کو سوچنے کی تو عادت نہ تھی مجھے
شاید وہ میرے عشق کی اک انتہا ہی تھی
کہ تیرے ہم سفر سے رقابت نہ تھی مجھے

....

حسن بڑھا دے رات کا وہ غم اچھا لگتا ہے
اس کی آنکھ میں ہلکا سا نم اچھا لگتا ہے
بڑی بڑی رنجش کی باتیں اس کو یاد نہیں
وہ ذرا سی بات پہ برہم اچھا لگتا ہے

....

یادوں کی آگ میں میری آنکھیں سلگ اٹھیں
راتوں کو سوچنے کی تو عادت نہ تھی مجھے
شاید وہ میرے عشق کی اک انتہا ہی تھی
کہ تیرے ہم سفر سے رقابت نہ تھی مجھے
عظمیٰ سحر ---- ملتان
سب کچھ لٹا دیا اس انجام سفر میں
حتیٰ کہ کہیں یاد کو گزشتہ بھی نہ رکھا
دل یاد بھی کرتا تو کہاں ڈھونڈنے جاتے
آنکھوں نے تو محفوظ وہ منظر بھی نہ رکھا

....

ابھی تو میرے بکھرنے کا کھیل باقی ہے
میں خوش نہیں ہوں ابھی اپنا گھر لٹا کے بھی
ابھی تک اس نے کوئی بھی تو فیصلہ نہ کیا
وہ چپ ہے مجھ کو ہر طرح آزما کے بھی

....

کسی قدر مشکل ہے مگر حکم حاکم ہے
آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا ہونا
صباء رؤف ---- مظفر گڑھ
ہم نے سونپ دی جس کو کائنات جاں اپنی
وہ خدا نہ تھا لیکن کس قدر اکیلا تھا

....

میری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں سمجھی
کس کے پاس نہ تھا ایک سانس بھی وافر

....

دشت نامرادی میں ساتھ کون تھا کس کے
مرثیے سناتی ہے شہر کی ہوا کس کے
ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سناتا ہے یار بے وفا کس کے
ثروت راؤ ---- خانپور
پھر سارے کھیل کھلونوں نے من پھیر لیا
پھر دل نے دکھ کو گھیر لیا پھر شام ہوئی

....

کسی سے رابطہ بہم استوار بھی نہ کیا
قرار بھی نہ ہوئے کھل کے پیار بھی نہ کیا
بہت اکیلا تو وہ بدنصیب ہے جس نے
تمام عمر کوئی انتظار بھی نہ کیا

....

گلہ نہ کر دل ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا
رطابہ عباس ---- شیخوپورہ

عشق نے زندہ و تابندہ رکھا ہے ورنہ
موت سی دل میں ترازو ہے کوئی مدت سے

....

کبھی ہم بھیگتے ہیں چاہتوں کی تیز بارش میں
کبھی برسوں نہیں ملتے کسی ہلکی سی رنجش میں

....

بہت پہلے سے ان کے قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اب زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب انسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
افشاں زینب ---- شیخوپورہ
جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جان جہاں یہ کوئی سا ہے کہ تم ہو
یہ عمر گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو ہی لگتا ہے کہ تم ہو

....

یہ میرا سارا سفر اس کی خوشبوؤں میں کٹا
مجھے تو راہ دکھاتی تھیں چاہتیں اس کی
میں بارشوں میں جدا ہو گئی اس سے مگر
یہ میرا دل میری سانسیں امانتیں اس کی

....

توڑ دے ہر اک آس کی ڈوری آساں میں کیا رکھا ہے
عشق محبت باتیں ہیں سو باتوں میں کیا رکھا ہے
قسمت میں جو لکھا ہے وہ آخر ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں الجھی سی اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے
علینہ طارق ---- لاہور
وفا کے نام بھی زندہ ہے میں بھی زندہ ہوں
اب اپنا حال سنا مجھ کو بے وفا میرے

....

مجھ سا جہاں میں کوئی نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو
رونا یہی تو ہے اسے چاہتے ہیں ہم
سعد جس کے ملنے کا امکان بھی نہ ہو

....

وہ پاس تھا تو اس حیات کے عنوان تھے بہت
خوش رہنے اور ہنسنے کے سامان تھے بہت
جدا ہوا تو دل مطمئن کا اطمینان نہ گیا
مجھ خوش فہم کو پلٹ آنے کے گمان تھے بہت
شمائل وہاب ---- کراچی
کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوجتا نہیں
ہوتی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

....

یوں ہی امید دلاتے ہیں زمانے والے
لوٹ کے کب آتے ہیں جانے والے
تو نے دیکھا ہے کبھی صحرا میں جھلستا ہوا درخت
اس طرح جیتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

....

اتنی آزادی نہ دے حد سے گزر جاؤں نہ میں
اڑتے اڑتے ان فضاؤں میں ہی مر جاؤں نہ میں
اک نظر نفرت سے مجھ کو دیکھنے والے کہیں
آنکھ کے رستے ترے دل میں اتر جاؤں نہ میں
شازیہ نواب ---- علی پور
کب پاؤں فگار نہیں ہوتے کب سر میں دھول نہیں ہوتی
تری راہ میں چلنے والوں سے لیکن کبھی بھول نہیں ہوتی
ہر رنگ جنوں بھرنے والو شب بیداری کرنے والو
ہے عشق وہ مزدوری جس میں محنت وصول نہیں ہوتی

....

میری بزم دل تو اجڑ چکی میرا فرش جاں تو سمٹ گیا
سبھی جا چکے میرے ہم نشیں مگر اب مخلص گیا نہیں
غم زندگی تیری راہ میں شب آرزو تیری چاہ میں
جو اجڑ گیا وہ بس نہیں جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

....

ہوا چلی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں درختوں پر اپنے ہاتھ کے رنگ
سعدیہ وہاب ---- سرگودھا
میرے خوابوں کے گلشن میں خزائیں رقص کرتی ہیں
میرے ہونٹوں کی لرزش میں وفائیں رقص کرتی ہیں
مجھے وہ لاکھ تڑپائے مگر اس مخلص کی خاطر
میرے دل کے اندھیروں میں دعائیں رقص کرتی ہیں

....

مت پوچھ مجھ سے حالات زر کے بارے میں
میں ہوں موم لیکن پتھر کی طرح جی رہا ہوں

....

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں
جن کی آنکھوں میں ہوں آنسو انہیں زندہ سمجھو
پانی مرتا ہے تو دریا بھی اتر جاتے ہیں
زرقا امین ---- لیاری کراچی
دل میں اس چاند سے چہرے کو اتارا کب تھا
اس کی زلفوں کو ابھی ہم نے سنوارا کب تھا
ہم تو بس ایک نظر دیکھ کے جی لیتے ہیں
تم کو جاتے ہوئے راہوں میں پکارا کب تھا

....

زندگی بہت مختصر ہے خیال کر لے
یہ تعلق جو تو نے توڑا ہے بحال کر لے
نم آنکھیں لئے گھر سے نہ نکلا کر
ایسا نہ ہو تجھ سے کوئی سوال کر لے

....

وفا تلاش نہ کر اپنے ہم نشینوں میں
یہاں تو سانپ بھی پلتے ہیں آستینوں میں
لائبہ رضوان ---- فیصل آباد
جب ہم سے ملو گے تو ہمیں پاؤ گے مخلص
ہر چند کہ اخلاص کا دعویٰ نہیں کرتے

....

کرن گوریجہ ---- جڑانوالہ
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

....

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
نعمان ---- لیہ
وہ چار لفظ کہہ کے میں خاموش ہو گیا
وہ مسکرا کے بولے بہت بولتے ہو تم

....

سن رہا ہوں فاصلے ہیں جو تیرے میرے درمیاں
میں نے تجھ کو کبھی خود سے جدا دیکھا نہیں
خاور اس کی راہ میں اک بار کیا رکھے قدم
عمر بھر پھر ہم نے گھر کا راستہ دیکھا نہیں

....

ساجدہ احمد ---- بورے والا
روشنی میرے اندھیروں سے الجھ سکتی ہے
مگر دکھ ہے سورج نے جلائی ہے مجھے
علینہ طارق ---- لاہور
آج کے دریا نہیں رکھتے کسی کا کچھ بھرم
اب یہاں کچے گھڑوں پہ تیرنا اچھا نہیں

....

صیاد نے اجازت فریاد دی تو ہے
میں پھر بھی ڈر رہا ہوں زبان کھولتے ہوئے

....

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملے

☆☆☆

خبر نامہ

عبداللہ

دبنگ بنے گاڈ فادر

بالی ووڈ کے سب سے زیادہ خبروں میں رہنے والے فنکار سلمان خان ہیں جن کو ہر سال ایک نیا لقب دیا جاتا ہے، ابھی حال ہی میں سلمان خان کو ایک اور خطاب دیا گیا ہے وہ ہے ''بالی ووڈ کا گاڈ فادر'' سلمان ایک ایسی شخصیت ہے جس نے فلمی صنعت میں سب سے زیادہ فنکاروں کو متعارف کروایا، جو آج ہالی ووڈ کے ٹاپ اسٹار میں شامل ہو چکے ہیں، سلمان خان نے فنکاروں کے علاوہ دیگر ڈیپارٹمنٹس میں بھی باصلاحیت افراد کو جگہ دلائی جو آج اپنے اپنے شعبوں میں ماہر ترین سمجھے جاتے ہیں، کترینہ کیف، سومی علی، سوناکشی، زرینہ خان، انوشکا وغیرہ کے نام سرفہرست ہے۔

دولت، شہرت اور بس

معروف پاکستانی اداکارہ تنازعات کی ملکہ اور خبروں میں رہنے کا گر جاننے والی وینا ملک کا کہنا ہے، کہ وہ وقت گزر گیا جب میں شہرت، دولت کے پیچھے بھاگا کرتی تھی، آج یہ دونوں چیزیں میرے پیچھے پیچھے ہیں، بالی ووڈ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام نے بھی میری صلاحیتوں کو مان لیا ہے، جس کی وجہ سے مجھے سات انڈین فلموں میں کاسٹ کیا گیا، لیکن ابھی بھی مجھے کسی ایسی فلم کا انتظار ہے جو مجھے راتوں رات بالی ووڈ نگری کی ملکہ بنا دے، وینا ملک نے مزید کہا کہ قیمتی کپڑے، جوتے، بیگ اور موبائل اس کی کمزوری ہیں، مجھے اپنے پرنس چارمنگ کا انتظار ہے جس دن وہ مجھے مل گیا شادی کرنے میں لمحہ نہیں لگاؤں گی۔

راجہ اِندر

اداکاری کے ساتھ ساتھ بولی ووڈ اسٹارز لندن اور دوبئی میں ہونے والی ایلیٹ کلاس شادیاں، ٹھیک ٹھاک معاوضے کے عوض اٹینڈ کرتے ہیں، عامر خان، سیف علی خان، سلمان خان اور شاہ رخ خان اس دوڑ کا حصہ ہیں، سلمان خان جو آج کل بیمار ہیں اس لئے کسی امیر کبیر کی شادی میں کروڑوں روپے کے عوض بھی سلو بھیا شرکت نہیں کر سکتے عامر خان اور سیف کچھ وجوہات کی بنا پر ایسی آفرز رد کر رہے ہیں اس لئے شاہ رخ کی مارکیٹ ان دنوں ٹاپ پر ہے جس کی مثال حال ہی میں دوبئی میں ہونے والی ایک شادی میں شرکت کے لئے شاہ رخ خان نے پندرہ ہزار ڈالرز وصول کیے جو پاکستانی کرنسی میں پندرہ کروڑ بنتے ہیں جبکہ اس سے پہلے وہ صرف چار کروڑ کے عوض شادیوں میں ڈانس بھی کرتا ہے، لیکن اب باقی بالی ووڈ کی دلچسپی اس میں کم ہونے کی بناپر شاہ رخ کی مارکیٹ ویلیو چار سے پندرہ تک جا پہنچی ہے اور خان صاحب اکلوتے راجہ اِندر بنے اپنی قیمت خود ہی بڑھا رہے ہیں۔

لو چلے وہ بھی

اداکار عمران عباس بھارتی فلم ''کریچر'' کی شوٹنگ کے لئے نئی دہلی پہنچ گے، اس فلم میں وہ بالی ووڈ ادکارہ بپاشا باسو کے مدمقابل کام کریں گے، یوں ایک اور پاکستانی سپوت بالی ووڈ فلم نگری کو پیارا ہوگیا، اب دیکھتے ہیں کہ کب عمران عباس اپنی رہائش مستقل بھارت میں رکھنے کا بیان جاری کرتے ہیں۔

خوشی کی انتہا

بالی ووڈ بیوٹی کوئین دیپکا پڈکون نے کہا ہے کہ وہ اپنی آنے والی فلم ''چنائی ایکسپریس'' میں شاہ رخ کے ساتھ کام کر کے بے حد خوش ہے اس فلم میں ایک سین ایسا تھا جس میں مجھے بھاگ کر ٹرین پکڑنی تھی، سین کرتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ جیسے دل والے دلہنیا لے جائیں گے، کا سین کروا رہی ہوں، اس وقت میری خوشی کا کیا عالم تھا میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆☆☆

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

اہتمام سحر و افطار

آلو اور دال کے سندھی پراٹھے

اشیاء

مونگ کی دال	آدھا کپ
آلو	دو عدد
آٹا	دو کپ
ہرا دھنیا	چند پتے
ہری مرچ (کتری ہوئی)	دو چائے کے چمچے
لیموں کا رس	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب

آٹے میں تھوڑا نمک ڈال کر گوندھ لیں، آلو کو ابال کر چھیل کر میش کر لیں، دال کو ابال کر آلو کے ساتھ مکس کریں، ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس، سیاہ مرچ پاؤڈر، چائنیز نمک اور نمک بھی ملا دیں، جب اچھی طرح مکس ہو جائیں تو آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ایک پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا مکسچر رکھیں دوسرے پیڑے کو اس کے اوپر رکھیں اس کے بعد کنارے دبا کر روٹی کی طرح بیل لیں، توے پر تیل ڈال کر پراٹھے کی طرح سینک لیں، اتار کر چٹنی اور رائتہ کے ساتھ سرو کریں

سیخ کباب پراٹھا

اشیاء

گوشت (دھو کر خشک کرلیں)	ایک کلو
کھانے کا سوڈا	چوتھائی چائے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	چار عدد
ہرا دھنیا	آدھا کپ
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب

گوشت کے کیوبز کاٹ کر اس میں کھانے کا سوڈا، کچری پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، سیاہ مرچ پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، نمک، پیاز، ہرا دھنیا، لہسن پیسٹ، ادرک پیسٹ ڈال کر تھوڑی دیر رکھ دیں، اس کے بعد چوپر مشین میں ڈال کر قیمہ بنا لیں، انگیٹھی میں کوئلے دہکائیں، قیمے کو سیخوں میں پرو کر کوئلوں پر سینک لیں، سینکتے ہوئے کباب پر ہلکا سا آئل لگاتی جائیں۔

قیمے کے پراٹھے

اشیاء

میدہ	دو کپ
قیمہ (ابلا ہوا)	دو کپ
پیاز	ایک عدد
لہسن کے جوے	دو سے تین عدد

ادرک	آدھا انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب

میدے میں نمک، مکھن اور گرم پانی ملا کر گوندھ لیں اور ایک طرف رکھ دیں، پیاز، لہسن، ادرک، ہری مرچیں اور دھنیا کو قیمے میں مکس کر لیں، ساتھ نمک بھی شامل کر لیں، فلنگ تیار ہے میدے کے بارہ سے پندرہ پیڑے بنا لیں۔

ہر پیڑے کے بیچ میں فلنگ بھر کر لپیٹ لیں اور پراٹھے بیل کر پہلے سے گرم توے پر دونوں طرف سے سینکیں، اس کے بعد تیل ڈال کر سنہرا ہونے تک سنکیں، مزے دار قیمے کے پراٹھے تیار ہیں۔

چکن پراٹھا رول

اشیاء

مرغی (بون لیس) ایک کلو	
سرکہ	دو چائے کے چمچے
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
مایونیز	آدھا چائے کا چمچہ
چلی سوس	دو چائے کے چمچے
ادرک، لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس	دو چائے کے چمچے
لال مرچ (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
فروزن پراٹھے	ایک پیکٹ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب

ادرک، لہسن پیسٹ، مرغی، نمک، کٹی ہوئی لال مرچ، سرکہ، سویا ساس ڈال کر پکنے کے لئے رکھ دیں، ہلکی آنچ پر جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو اس میں چائنیز نمک، گرم مسالا پاؤڈر، چلی سوس، چاٹ مسالا ڈال کر بھول لیں، ایک چائے کا چمچہ تیل بھی ڈال دیں، پیاز بھی اس کے اوپر ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھ دیں، (کوئلہ دہکا کر اس کی سموک بھی دی جا سکتی ہے) اب پراٹھوں کو توے پر سینک لیں، ایک پراٹھا لیں، اس میں مرغی کا آمیزہ ڈالیں، اس کے اوپر مایونیز ڈالیں اور رول کر لیں، مزے دار چکن پراٹھا رول تیار ہے، رائتے، سلاد اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

کیری کی چٹنی

اشیاء

کیری چھیل کر کش کر لیں	1/2 کلو
چینی پسی ہوئی	1/2 کلو
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	1/4 کپ
ادرک کش کیا ہوا	ایک انچ کا ٹکڑا
کلونجی بھون کر کوٹ لیں	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب

کیری میں چینی، سرخ مرچ پاؤڈر، نمک، گرم مسالا پاؤڈر، کلونجی، ادرک اور سرکہ ڈال کر مکس کر کے تقریباً 1/2 گھنٹے کے لئے رکھ دیں، تا کہ چینی پگھل جائے، اس کے بعد اس آمیزے کو دھیمی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ چٹنی کی رنگت براؤن ہو جائے، چمچہ برابر چلاتی رہیں، چینی

گاڑھی ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور اپنی مرضی کے مطابق ڈش کے ساتھ پیش کریں۔

کھٹی چٹنی

اشیاء

املی کا گودا	آدھا کپ
ہرا دھنیا	آدھا گٹھی
پودینہ	آدھا گٹھی
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کھوپرا پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب

گرائنڈر میں املی کا گودا، ہرا دھنیا، پودینہ، زیرہ، کھوپرا، ہری مری چیں، نمک ڈال کر گرائنڈ کر لیں، مزے دار کھٹی چٹنی تیار ہے، رول، سموسوں اور پکوڑوں کے ساتھ سرو کریں۔

آلو بینگن، پالک اور پیاز کے پکوڑے

اشیاء

بیسن	250 گرام
آلو	دو عدد
بینگن	ایک عدد
پالک	آٹھ یا دس پتے
پیاز	دو عدد
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
کھانے کا سوڈا	1/4 چائے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب

بینگن اور آلو کے پتلے گول سلائس کاٹ کر نمک کے پانی میں ڈالیں، پیاز کے لچھے گول کاٹ کر الگ کر لیں، پالک کے پتوں کو دھو کر خشک کر لیں، ایک پیالے میں بیسن ڈال کر اس میں زیرہ پاؤڈر، نمک، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، کھانے کا سوڈا ڈال کر مکس کریں اور حسب ضرورت پانی شامل کر کے ہموار آمیزہ تیار کر لیں۔

کڑاہی میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں، تیار کیے ہوئے بیسن کے آمیزے میں آلو، بینگن کی قتلوں، پیاز کے لچھوں اور پالک کے پتوں کو ڈبو کر تیل میں ڈال کر گولڈن براؤن ہونے تک تل لیں، مزے دار آلو، بینگن، پالک کے پکوڑے تیار ہیں، سرونگ ڈش میں نکال کر لال چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

منس پوٹیٹو باؤلز

اشیاء

میدہ	ایک کپ
آلو (ابال لیں)	آدھا کلو
قیمہ بھنا ہوا	آدھا کلو
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
انڈے ابال لیں (گول سلائس کیے ہوئے)	تین عدد
موزریلا چیز	آدھا کپ

ترکیب

میدے میں مکھن اور نمک ڈال کر مکس کر لیں، پانی ڈال کر گوندھ لیں، اب اس کے آٹھ پیڑے بنا کر چھوٹی چھوٹی پوریاں بیل لیں، اب فوائل پیپر لے کر اسے چھوٹے کپ میں بچھا کر پیالے کی شیپ بنا کر اس میں میدے کی پوریاں رکھ کر سیٹ کر لیں، اس طرح سیٹ کر لیں کہ کپ شیپ چھوٹے پیالے کی طرح بن جائے، اب آلوؤں میں نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کر لیں، میدے کے پیالے میں پہلے آلوؤں کا آمیزہ ڈالیں، اب اس کے اوپر قیمہ ڈالیں، اب اس کے اوپر انڈے کا سلائس رکھیں، اب اس پر تھوڑا سا چیز چھڑک دیں، اسی طرح تمام پیالے تیار کر کے پہلے سے گرم اوون میں 180.C پر رکھ کر دس سے پندرہ منٹ تک بیک کریں ڈش میں نکال کر سلاد اور املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

بگھارے دہی بڑے

اشیاء

بیسن	ایک کپ
لال مرچ پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
کھانے کا سوڈا	1/4 چائے کا چمچہ
زیرہ بھون کر پیس لیں	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیپ فرائنگ کیلئے

دہی کے لئے:

دہی	تین کپ
لال مرچ پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
ہری مرچیں باریک کاٹ لیں	دو عدد
ہرا دھنیا باریک کاٹ لیں	چند پتے
پانی	دو کپ

بھگار کے لئے:

ثابت لال مرچیں	5-6 عدد
رائی	1/2 چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	1/2 چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	1/2 چائے کا چمچہ
کڑھی پتے	چند پتے
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب

ایک پیالے میں بیسن، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، کھانے کا سوڈا، زیرہ پاؤڈر اور نمک ملا کر حسب ضرورت پانی ڈال کر آمیزہ تیار کر لیں، ایک پیالے میں دہی، لال مرچ پاؤڈر، نمک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر پھینٹیں، اس کے بعد اس میں پانی ڈال کر تھوڑی دیر تک اور پھینٹیں، اس کے بعد نکال کر ایک سرونگ ڈش میں رکھ لیں۔

کراہی میں تیل گرم کریں، اس میں تیار کیے ہوئے بیسن کے آمیزے کے پکوڑے ڈال کر تلیں، گولڈن براؤن ہونے پر نکال کر پانی سے بھرے ہوئے پیالے میں ڈال دیں، اس طرح کر کے سارے آمیزے کے پکوڑے تل کر پانی میں ڈالتے جائیں، اس کے بعد سارے پکوڑے پانی سے نکال کر نچوڑ کر دہی میں ڈال دیں اور چمچے سے اس طرح مکس کریں کہ پکوڑے ٹوٹیں نہیں، اب ایک فرائنگ پین میں چار کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے اس میں ثابت لال مرچیں، رائی، میتھی دانے، ثابت زیرہ اور کڑھی پتے ڈال کر کڑکڑائیں اور اس کی بگھار دہی پکوڑوں کے آمیزے پر لگا دیں، مزے دار بھگارے دہی بڑے تیار ہیں سرو کریں۔

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لئے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو ہم کو اور ہمارے پیارے ملک کو سلامت رکھے آمین۔

یہ شمارہ جب آپ کو ملے گا آپ رمضان المبارک کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، اس رحیم وشفیق ہستی نے انسان کی فلاح اور بھلائی کے لئے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہادی ورہبر بنا کر بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری انسانیت کے لئے رحمت بن کر آئے اور اپنی پاکیزہ تعلیمات سے ایک منظم اور مہذب زندگی گزارنے کے طریقے بتائے۔

اسلام کی عبادات میں روزہ اور نماز ایسی عبادات ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہیں، روزہ صرف بھوکے رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ماہ کی روحانی تربیت کا نام ہے۔

حسد، جلن، جھوٹ، غیبت، بدگمانی، لڑائی جھگڑا اور غصہ ایسی برائیاں ہیں جو نہ صرف انسان کی صحت اور اس کے اعصاب کو تباہ کرتی ہیں، بلکہ معاشرے میں بھی فساد برپا کرتی ہے، روزے کی حالت میں ان تمام برائیوں سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، تب ہی روزے کی تکمیل ہوتی ہے۔

آیئے رمضان کا استقبال اس عہد کے ساتھ کریں ان تمام برائیوں سے اجتناب کرتے ہوئے رمضان المبارک کی جسمانی اور روحانی برکتوں سے فیض یاب ہوں گے۔

رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں اور عبادات میں جہاں اپنے لئے دعا کریں وہاں پوری امت مسلمہ کو بھی یاد رکھیں خصوصاً اپنے پیارے وطن پاکستان کے لئے دعا ضرور کریں اللہ تعالیٰ اسے تا قیامت سلامت رکھے آمین، آیئے آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں۔

یہ پہلا خط زرعہ رباب کا کھاریاں سے موصول ہوا ہے وہ لکھتی ہیں۔

جون کا شمارہ آیان علی کے ٹائٹل سے سجا ملا، جو کہ بے حد پسند آیا، کچھ عرصے سے حنا میں بے شمار تبدیلیاں آئیں جس میں ٹائٹل اور فہرست نمایاں طور پر ہیں، فوزیہ آپی جس چیز نے مجھے کاغذ قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ فوزیہ غزل کا ناول "وہ ستارہ صبح امید کا" ہے یا خدا فوزیہ غزل کو کیا ہو گیا ہے، اریبہ کو اتنا کیوں گرایا آپ نے، محبت اپنی جگہ، مگر عزت نفس بھی کسی چیز کا نام ہے فوزیہ آپی ہمیں بالکل پسند نہیں آیا کہ آپ نے اریبہ کو وہاج کے پاس محبت کی بھیک مانگنے بھیجا کیوں؟ اف آپ نے یہ کیا کیا؟ خیر اب چلتے ہیں اُم مریم کی تحریر کی طرف، بہت اچھا لکھ رہی ہیں مصنفہ، بڑی خوبصورتی کے ساتھ وہ حالات واقعات کا تانا بانا بنتی ہیں، پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے معاذ اور پرنیاں کا کردار بے حد پسند ہے، ساجدہ تاج کافی عرصے بعد اپنی طویل تحریر کے ساتھ آئیں اچھا لکھا، نسرین خالد کی غالباً یہ حنا میں پہلی طویل تحریر تھی، مصنفہ کی کوشش کامیاب رہی اگرچہ کہیں کہیں کہانی میں ربط نہیں تھا لیکن پھر بھی پڑھنے میں اچھا لگا، شکر ہے تحسین جی آپ کو بھی حنا کی یاد آئی کہاں غائب رہتی ہیں آپ کافی عرصے بعد آپ کی تحریر پڑھنے کو ملی، سندس جبیں تمہاری تحریر پڑھ کر بے اختیار منہ سے واہ نکلتا ہے۔

بے حد اچھا ناولٹ ہے آپ کا "کاسہ دل" اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے آمین، افسانوں میں ٹاپ پر ہے جی عابی ناز، عابی اتنا اچھا مزاح لکھنے پر مبارک باد، پچھلے شمارے میں آپ کا افسانہ کافی سنجیدہ موضوع پر تھا، آپ مزاح لکھنا کبھی نہ چھوڑیئے گا اللہ تعالیٰ کی آپ پر یہ خاص عنایت ہے۔

نورین شاہد اور فرح طاہر کی تحریریں بھی متاثر کن تھی جبکہ سعدیہ عابد، یمی کرن اور رافعہ اعجاز نے بھی اچھی کوشش کی۔

مستقل سلسلوں میں میرا پسندیدہ سلسلہ کتاب نگر ہے، یمی جی تسی گریٹ او جو اتنی محنت سے پہلے کتاب پڑھتی ہیں اور پھر ہمارے لئے اس پر تبصرہ بھی لکھتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا کرے آمین۔

کس قیامت کے یہ نامے میں پڑھتی ہی فوزیہ آپی کی وجہ سے ہوں آپی کا ٹھنڈا میٹھا انداز جوابات دینے کا بڑا اچھا ہے، آپی ہم تو آپ کو بنا دیکھے ہی آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں بس سوچ لیا ہے اب آپ سے ملنا ہے اور ضرور ملنا ہے، خبرنامہ میں عبداللہ بھائی خوب فلمی ستاروں کی خبر لیتے ہیں، رنگ حنا کا سلسلہ تو ہے ہی لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لئے جبکہ میری ڈائری اور بیاض ہمارے ذوق کو مزید نکھرنے میں مدد دیتے ہیں۔

آپی پلیز آپ مصنفین سے انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کریں اور اس سلسلے میں سب سے پہلے تحسین اختر سے ملوایئے گا۔

زرعہ رباب کیسی ہو آپ؟ اتنا لمبا عرصہ کہاں غائب رہی؟ جولائی کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی کا شکریہ، فوزیہ غزل سے جو شکایت ہے آپ کو انشا اللہ وہ جلد دور ہو جائے گی، اریبہ کا وہاج کے پاس جانا اس کی محبت کی انتہا ہے اور یاد رکھیں محبت میں انا نہیں ہوتی، بقیہ تحریروں کو پسند کرنے پر مصنفین کا شکریہ قبول کیجئے، آپ کے لئے ایک مزے کی اطلاع یہ کہ جو آپ کی فرمائش ہے وہ ہم نے آپ کے کہنے سے پہلے جان لی تھی سو بہت جلد آپ حنا میں مصنفین سے اگست کے شمارے سے "ایک دن حنا کے ساتھ" میں سے ملاقات کریں گی اور جانے گی کہ وہ اپنے دن کے آغاز و انجام کے ردمیان کس کس طرح مصروف رہتی ہیں، اپنا خیال رکھنا آئندہ بھی اپنی محبتوں کا اظہار کرتی رہیے گا شکریہ۔

راحت وفا: فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔

جون کے گرم موسم میں سرورق پر سفید موتیے کے پھول سے سجی کیوٹ سی گرل کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا، حمد و نعت پڑھ کر پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھی، بے حد پسند آئیں، انشاء جی نے تقریر کرنے سے گھبراتے ہوئے بھی کافی لمبی تحریر لکھ دی اپنے مخصوص انداز میں، انٹرویو میں آیان سے ہیلو ہائے کی آگے بڑھے فوزیہ غزل کی بے حد اچھی ہے وہ بڑی محنت سے اس ناول کو لکھ رہی ہیں، ہماری طرف سے فوزیہ کو مبارک باد، جبکہ اُم مریم کی کیا ہی بات ہے مکمل ناول اس مرتبہ دونوں ہی پسند آئے ساجدہ تاج اور نسرین

خالد نے بہت اچھا لکھا، جبکہ افسانے چھ کے چھ ہی اچھے تھے تاہم عابی ناز کا انداز بے حد پسند آیا عابی ناز آپ کی تحریر پڑھ کر ہمیں بے اختیار اپنے کالج کے زمانہ یاد آ جاتا ہے، ناولٹ ”کاسہ دل“ کو سندس جبیں کافی بولڈ انداز میں لکھ رہی ہیں، سندس جبیں ذرا ہاتھ ہلکا ہی رکھا کریں تحسین اختر کی تحریر تو پسند آئی مگر ان کے ناولٹ کا عنوان پسند نہیں آیا، کتاب نگر میں یمی جی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ”اپنا گریباں چاک“ پر تبصرہ لکھ کر قارئین کے دل جیت لئے یمی کرن جی پلیز آپ کرنل محمد خان، اشفاق احمد، بانو قدسیہ کی کتابوں پر تبصرہ ضرور لکھیے گا ان کے ذکر بنا تو کتاب نگر ادھورا رہے گا اس بار حنا کا دستر خوان بے حد پسند آیا، حاصل مطالعہ میں نازیہ کمال، مریم رباب اور ام ایمن کی پسند لاجواب تھی جبکہ بیاض کا حصہ بھی اچھا تھا آپی کیا ہی بہتر ہو کہ آپ اس کے دو صفحات کر دیں اور قیامت کے ناموں کے صفحات بڑھا دیں۔

کاشف گوریجہ صاحب سے ہماری فرمائش ہے کہ پلیز وہ صبا قمر اور فیصل قریشی سے ضرور ملاقات کروائیں، آپی میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں امید ہے آپ ضرور تھوڑی سی جگہ دیں گی۔

راحت وفا اس محفل میں خوش آمدید، تھوڑی سی کیوں بہت ساری جگہ ہے آپ کے لئے ہمارے پاس، آپ دیکھیئے تو“ جون کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی فرمائش کاشف صاحب کو پہنچا دی ہے، جلد ہی آپ کے پسندیدہ آرٹسٹ سے ملاقات کروائیں گے، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

عنایا بھٹی: گجرات سے آئیں وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

آپی آپ کہتی ہیں کہ اس محفل میں آنے والے ہر دوست کی اپنی جگہ ہے، تو پھر آپ کی مجھ سے ناراضگی کس بات کی ہے میں دو ماہ سے آپ کو تبصرہ بھیج رہی ہوں لیکن آپ نے شامل کرنا گوارا ہی نہیں کیا، خیر ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں۔

ٹائٹل پر پھولوں کے زیورات سے سجی دوشیزہ بے حد پسند آئی، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں تو ہوتی ہی ایمان افروز ہیں، آیان علی کو لفٹ کرائے بنا ہم ”آخری جزیرے“ میں پہنچے، مریم جی آپ کا ناول ہمیں اچھا لگا جبکہ فوزیہ جی کا ناول اس مرتبہ کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ رہا، مکمل ناول دونوں ہی بازی لے گئے، ساجدہ تاج اور نسرین خالد کو بہت بہت مبارک باد۔

ارے یہ کیا اس بار چھ افسانے، کبھی کبھی ہی آپی ایسی دریا دلی دکھاتی ہیں، سبھی افسانے پسند آئے ناولٹ بھی لاجواب تھے، مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بے مثال تھے، آپی آپ سے گزارش ہے کہ پلیز پلیز آپ نامے کے سلسلے کے صفحات بڑھا دیں، مجھے سب زیادہ یہ سلسلہ پسند ہے مگر اتنا مختصر سا ہوتا ہے یہ آپی کی آپ میری ایک چھوٹی سی فرمائش پوری کر سکتی ہیں، جولائی کے شمارے پر بجل علی کا ٹائٹل دیں اس کے علاوہ میں نے دو افسانے اور ایک مکمل ناول لکھا یہ آپ تک کیسے بھجواؤں۔

عنایا بھٹی کیسی ہو چندا؟ اتنی ناراضگی، یہ محفل ہم سجاتے ہی آپ دوستوں کی محبتوں سے ہیں تو بھلا آپ کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

ہمیں آپ کے خطوط نہیں ملے ورنہ ضروری شائع ہوتے، آپ اپنی تحریریں آفس کے ایڈریس پر بھجوا دیں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گے۔

ٹائٹل والی فرمائش جولائی میں تو نہیں لیکن جلد پوری کر دیں گے آپ کی محبتوں کے ہم اگلے ماہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

عشنا بھٹی: ڈیرہ غازی خان سے آئی ہیں اور کچھ یوں لکھی ہیں۔

سرورق بہت ہی پیارا تھا بالکل مایوں کی کسی دلہن کے جیسا جس کا کریڈٹ کا آپ کو جاتا ہے۔

شروعات ”کچھ باتیں ہماریاں“ سے کی سردار انکل کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گئی۔

”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ سے مستفید ہو کر اپنی فیورٹ رائٹر فوزیہ غزل کے ناول ”وہ ستارہ صبح امید کا“ میں چھلانگ لگائی، جو کہ اپنے طرز کی ایک منفرد کہانی ہے جو کہ کافی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔

ویری ویلڈن فوزیہ آپی اتنا خوبصورت ناول لکھنے پر پیشگی مبارکباد قبول کریں۔

اس کے بعد دوسرا سلسلے وار ناول اُم مریم کا ”تم آخری جزیرہ ہو“ پڑھا جو کہ انتہائی دلچسپ موڑ پر ہے معاذ کو بے وقوف بنانے پر پرنیاں کے خیر نہیں ہے، ظاہر ہے اپنا بے وقوف بننا وہ برداشت تھوڑی کرے گا، ژ......ژالے کا انجام تو مجھے لگتا ہے اُم مریم آپی اپنی پچھلی کہانی کے کردار پریشے جیسا کریں گی، یعنی اسے مار دیں گی، بھئی میری چھٹی حس کہہ رہی ہے، بہر حال اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مکمل ناول میں ساجدہ تاج کا ”بساط جاں“ سبقت لے گیا ویری ویلڈن ساجدہ جی، نسرین خالد کا شکستوں کے دکھ، بھی لاجواب تھا، نسرین کے قلم میں کافی نکھار آتا جا رہا ہے۔

ناولٹ میں تحسین اختر کے ”سپنے جم گئے“ ایک خوبصورت کاوش تھی۔

تحسین آپی، آپ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں، کوئی سلسلے وار ناول لکھیں پلیز۔

سندس جبیں کا ”کاسہ دل“ بھی بہت اچھا جا رہا ہے فی الحال تبصرہ محفوظ ہے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔

افسانوں میں سعدیہ عابد نے جو ”کالی دال“ پکائی وہ مزے کی لگی، ویری ویلڈن سعدیہ جی، باقی افسانے بھی اپنی مثال آپ تھے، نورین شاہد میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں، مستقل سلسلوں میں کتاب نگر سے یمی آپی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اُف آپی اتنی اچھی اچھی کتابیں کہاں سے ڈھونڈ لیتی ہیں بس اب تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ جس کیاب پر تبصرہ کریں گی وہ میں فوراً خرید لوں گی، کیونکہ کتاب سے اچھا دوست کوئی نہیں ہو سکتا، حاصل مطالعہ میں نازیہ کمال حیدآباد سے ”مشکلات کا دل“ متاثر کر گیا۔

حنا کے دستر خواں میں سردائی اور املی کا شربت مزے دار لگا کیونکہ دونوں میرے فیورٹ ہیں، میری ڈائری سے، فرح عامر کی غزل اور نعیم امین کی غزل پسند آئی۔

خبرنامہ میں عبداللہ بھائی کے ریمارکس ہمیشہ کی طرح مزے کے لگے۔

اب آتے ہیں اپنی فیورٹ محفل ”کس قیامت کے یہ نامے“ کی جانب جہاں اپنی ڈیئر آپی کے مشورے کو پلو سے باندھ لیا۔

زوایہ، فرزانہ، نورین اور ارم خوش آمدید، نسرین خالد کا تبصرہ بھی اچھا لگا، نسرین آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اس لئے میں نے آپ کو اپنی فیورٹ رائٹر کی لسٹ میں شامل کر لیا ہے۔

سباس گل، مدیحہ تبسم، سعدیہ امل کاشف، ہما عامر، شاء ظفر، قرۃ العین رائے، میں آپ سب کو بہت مس کر رہی ہوں پلیز جلدی سے مکمل ناول کے ساتھ انٹری دیں شدت سے انتظار رہے گا اس دعا کے ساتھ اب اجازت چاہتی ہوں، اللہ تعالیٰ ادارہ حنا کو مزید ترقی کی منازل تک پہنچا دے آمین۔

عشنا بھٹی خوش رہو، جون کے شمارا آپ کو پسند آیا، ہمیں یہ جان کر دلی خوشی ہوئی اُم مریم پر ژالے کو زندہ رکھتی ہیں یا مار دیتی، یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا، آپ کی پسندیدگی تمام مصنفین کو اس کالم کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اپنا خیال رکھنا اور اپنی محبتوں بھری رائے کا یونہی اظہار کرتی رہیے گا شکریہ۔

ارم: نامعلوم سے لکھتی ہیں۔

میرا نام ارم ہے، میں نے پچھلے مہینے بھی آپ کو خط لکھا تھا اور سلسلہ وار ناول لکھنے کی اجازت مانگی تھی اور مجھے گمان تھا کہ میرا خط شامل نہیں ہو گا اور اگر کر بھی لیا تو آپ لوگ کافی ناراض ہو گے، کہ ڈائریکٹ سلسلہ وار ناول لکھنے کا یہ لڑکی کہہ رہی ہے ضرور پاگل ہو گی، لیکن میرے خط کا جواب دیا گیا اور وہ بھی اتنی نرمی سے ہمیں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی حیران ہوں۔

آپ نے بہت اپنائیت بھرے لہجے میں بات کی اور مجھ سے افسانہ مانگا، میں آپ کو اپنی کہانی بھیج رہی ہوں، میں پھر وہی کہوں گی جو پہلے خط میں کہا تھا، کہ اگر آپ کو یہ کہانی پسند آ جاتی ہے اور آپ اسے شائع کر رہے ہیں تو پلیز۔

مجھے سلسلہ وار ناول لکھنے کی اجازت دیں پلیز اور اس سب کے علاوہ آپ کے اپنائیت بھرے لہجے کا شکریہ۔

ارم بہت سی دعائیں آپ کے لئے آپ نے اس مرتبہ بھی نہ تو اپنا ایڈریس لکھا اور نہ کوئی فون نمبر، تو بتائیں اگر آپ کا افسانہ شائع ہو جائے تو ہم کس ایڈریس پر آپ کو شمارہ ارسال کریں گے یا آپ کو بتا سکیں کہ افسانہ اگر شائع نہیں ہوا تو کن وجوہات کی بناء پر نہیں ہوا، پلیز چندا آئندہ اس بات کا خیال رکھنا اور اگر ممکن ہو تو آپ آفس کے نمبر پر گیارہ سے لے کر چار کے درمیان کال کریں، کسی بھی دن، شکریہ۔

ام حبیبہ کی ای میل راولپنڈی سے موصول ہوئی ہے وہ لکھتی ہیں۔

اس ماہ حنا کا ٹائٹل بے حد پسند آیا، اسلامیات والا حصہ تو ہوتا ہی ایمان افروز ہے، انشاء نامہ اس بار کچھ خاص پسند نہیں آیا، آیان کی گفتگو بھی بس ٹھیک رہی، اس بار حنا کی سب سے اہم تحریر تحسین اختر کا ناولٹ تھا، جبکہ اُم مریم اور فوزیہ غزل بھی اپنی اپنی تحریروں کے ساتھ بڑی محنت کر رہی ہیں، سندس جبیں سے البتہ ہمیں شکایت ہے، ان کی تحریر میں بہت جگہ پر رفعت سراج کا کاپی کیا جاتا ہے سندس آپ تو خود اچھا لکھتی ہیں تو پھر یہ سب کیوں؟ ساجدہ تاج اور نسرین خالد کی تحریریں بھی پسند آئیں، مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے۔

اُم حبیبہ جون کے شمارہ آپ کو پسند آیا، شکریہ آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہی ہمارے لئے اہم ہے، آپ کی شکایت سندس تک پہنچائی جا رہی ہے، اپنا خیال رکھنا اور اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

☆☆☆